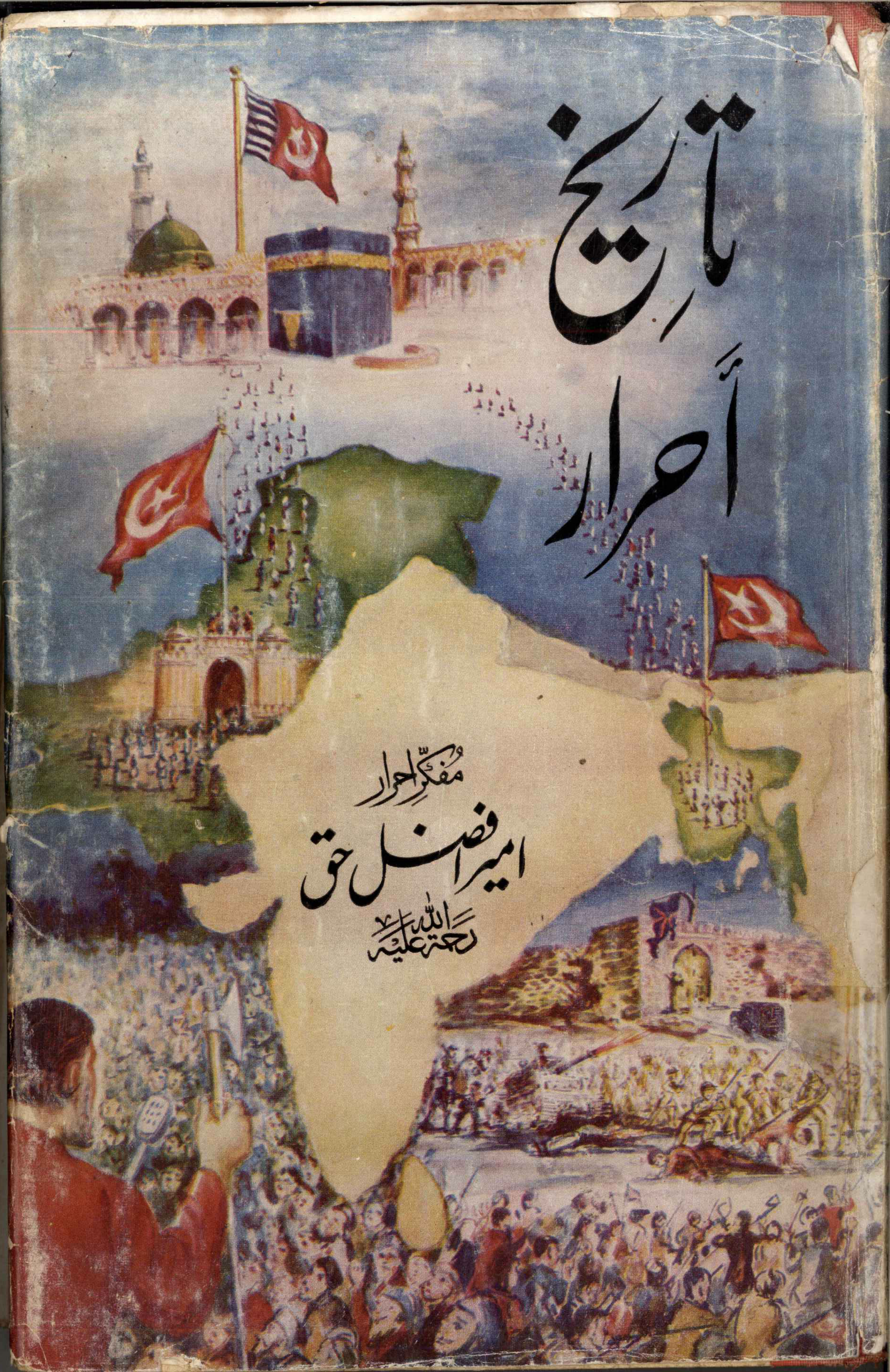


تاریخ
أحرار
مفکرِ احرار
امیر افضل حق
رحمۃ اللہ علیہ

سلسلۂ مطبوعات مجلسِ أحرارِ اسلام پاکستان (۲)

تاریخِ أحرار

أثرِ خامہ
مفکرِ احرار امیر افضل حق رحمۃ اللہ علیہ



ناشر
مکتبہ مجلسِ أحرارِ إسلام پاکستان
لاہور ○ ملتان

{طبع اوّل : ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء}

طبعِ ثانی

ذوالحجہ ـــ سنہ ۱۳۸۷ھ

مارچ ـــ سنہ ۱۹۶۸ء

- کتاب ـــ تاریخِ احرار
- مؤلف ـــ امیر افضل حق رحمۃ اللہ علیہ
- کاتب ـــ حکیم محمد شفیع۔ ادارہ کتابت۔ لاہور
- مطبع ـــ اشرف پریس۔ لاہور
- طابع ـــ شیخ محمد اشرف لاہور
- منتظم ـــ مرکزی شعبۂ نشریات
- ناشر ـــ مکتبہ مجلس احرار اسلام، پاکستان
- ضخامت ـــ ۲۸۶ دو سو چھیاسی صفحات
- تعداد ـــ ۲۲۰۰ بائیس سو نسخہ
- قیمتہ ـــ 12 ~~آٹھ روپے پچاس پیسے (۸/۵۰)~~

عنوان

۱ ـــ دفتر مکتبہ مجلسِ احرار اسلام پاکستان، کاشانۂ معاویہ ۲۲۱ کوٹ تغلق شاہ، ملتان شہر

۲ ـــ دفتر مجلسِ احرار اسلام پاکستان، مقابل شاہ محمد غوثؒ، بیرون دہلی دروازہ، لاہور شہر

فہرس

"اجازت نامہ"

بسلسلۂ اشاعت "تاریخ احرار"

مؤلفہ جناب مفکر احرار امیر افضل حق رحمۃ اللہ علیہ

من جانب

جناب چودہری "شمس الحق" ایڈووکیٹ فرزند اکبر جناب مفکر احرار رحمۃ اللہ علیہ مقیم ساہی وال شہر

برائے

ابن امیر شریعت مولانا سید **ابو معاویہ ابوذر** بخاری

ناظم اعلیٰ "**مجلس احرار اسلام پاکستان**" ملتان شہر

بسم اللہ

برادر محترم السلام علیکم

۱ — امید ہے کہ آپ مع اہل وعیال خیریت سے ہوں گے۔

۲ — حسب ارشاد۔ والدہ صاحبہ[1] سے "تاریخ احرار" کی اشاعت کے لیے عرض کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ انہیں۔ (ابوذر بخاری کو)۔ "تاریخ احرار" کی اشاعت کی کلی طور پر اجازت ہے۔ اور میں تو اس سے پیشتر بھی آپ کو مکمل اجازت دے ہی چکا ہوں اس سلسلہ میں زیادہ کیا عرض کروں؟

۳ — دیگر کار بلا لقہ سے یاد فرمائیں! والسلام

"شمس الحق" ساہی وال یوم شنبہ مورخہ ۱۰ صفر ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۹۶۷ء"

---

[1] محترمہ اہلیہ حضرت مفکر احرار امیر افضل حق رحمۃ اللہ علیہ مقیمہ لاہور

سید ابو معاویہ ابوذر بخاری
ناظم اعلیٰ مجلس احرار اسلام پاکستان

"کلمات"

أعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

الحمد للہ، ولہ الخلق والامر وحدہ ○ والصلوۃ والسلام علی سیدنا ومولانا وقائدنا الاعظم، والرسول الأفخم **محمد** ن۔ المبعوث لتتمیم مکارم الاخلاق الذی لا یخلق ولا یبعث نبی ولا رسول بعدہ ○ وعلی أصحابہ الذین ہم کالنجوم فی السماء للاقتداء والاھتداء ومعیار للحق والدین، وامھات المومنین۔ أصل أھل بیتہ۔ أزواجہ المطھرات وذریاتہ واتباعہ الذین أدنو اعضدہ ○

اما بعد

"کتاب"

۱ — عام انسانی افتاد طبع کے مطابق اکثر دیکھنے والے کسی عمارۃ کی نگاہوں سے ٹکرانے والی بلندی، ڈیل ڈول، انداز تعمیر، رنگ وروغن اور زیبائش وخوش نمائی پر ہی نظر ڈالتے ہیں، وہ دیدہ ور اور حقیقت شناس بہت کم ہیں جن کا خیال وتصور عمارۃ سے پہلے لاکھوں من بوجھ تلے مدفون۔ اس کی گہری، ہموار اور مضبوط بنیادوں کی طرف متوجہ ہو، جو اس کے قیام وپائداری کے اصل سبب کو خراج عقیدۃ وتحسین پیش کریں، اس کے مخفی وگم نام بانی کی تجویز ونقشہ کشی اور مہارۃ وسلیقہ مندی کا زندہ ثبوت سامنے دیکھ کر اس کے

حق میں کلمۂ خیر و آفرین زبان پر لائیں۔

کسی ـــ "فرد" ـــ کی ـــ "سیرۃ" ـــ یا ـــ "تحریک و جماعۃ" ـــ کی ـــ "تاریخ" ـــ اُس کے لیے اساس و بُنیاد کی حیثیّۃ رکھتی ہے، جس طرح انفرادی سیرۃ کا بھرپور نفسیّاتی جائزہ لینے سے اور پھر اظہارِ رائے میں اُس کی دیانۃ دارانہ عکّاسی و ترجمانی سے فرد کی ذات کا مکمّل تعارف حاصل ہوتا ہے، ایسے ہی کسی تحریک و جماعۃ کا چہرہ بھی اُس کی تاریخ کے آئینہ میں دیکھ کر ہی اُس کے اجتماعی وُجود کی اُٹھان، نشوونُما، نظم و ترتیب، وُسعۃ و ارتقاء، قیام و استقلال، رسوخ و استحکام اور جذب و کشش کے حقیقی اسباب و علل کی صحیح نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

بلاشُبہہ ـــ "تاریخِ اَحرار" ـــ کو بھی ـــ "مجلسِ اَحرارِ اِسلام" ـــ کی زندگی میں یہی اُصولی مقام اور بُنیادی حیثیّۃ حاصل ہے، جس کا مطالعہ کیے بغیر کوئی بھی شخص برّصغیر ـــ "ہند و پاک" ـــ میں قومی وُجود کے تحفّظ و بقا کی مربوط اور مُسلسل تحریک کا صحیح جائزہ نہیں لے سکتا اور کائنات میں اسلام کے سب سے بڑے اور سب سے بُرے دُشمن ـــ "فرنگی سامراج" ـــ کے غاصبانہ اقتدار اور اُس کے پنجۂ ظلم و استبداد سے آزادی و رہائی حاصل کرنے کی اجتماعی جِدّ و جُہد کے ہر مدّ و جزر اور نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر نہیں ہوسکتا، آزادی کا وہ گوہرِ بیش بہا جو آگ اور خون کے سمندر میں غوطہ زنی سے حاصل کیا گیا ہے، اُس جیسی نعمۃِ عُظمٰی کی صحیح قدر دانی کے لیے اِس خِطّۂ زمین پر غَلَبۂ اسلام کا پرچم لہرانے کی دیرینہ معصوم اُمنگوں اور حَسِین آرزوؤں کی سچی داستان معلوم نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی مقصد و وِراثۃِ نُبُوّۃ کی آئینہ دار ـــ "اِمارۃِ اِسلامیّۃ" ـــ، ـــ "خِلافۃِ راشِدہ" "جُمہوریّۃِ کامِلہ" ـــ اور ـــ "شورائیّۃِ عادِلہ" ـــ کا مثالی نظام برپا کرنے کی صدیوں پر مُحیط انقلابی دعوۃ کے بُنیادی مُحرّکات و عوامل سے علمی و فکری رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے، حتّٰی کہ برّصغیر کی کوئی بھی دینی یا سیاسی دستاویز تاریخِ احرار کے ناقابلِ فراموش دفترِ ایثار و قربانی کا پیوند لگائے بنا مکمّل تاریخِ آزادی کی شکل اختیار نہیں کرسکتی بلکہ فی الحقیقۃ صرف ـــ "تاریخِ آزادی" ـــ کہلانے کا استحقاق بھی نہیں رکھتی۔

۲ ـــ یہ ایک اتّفاقی مگر سخت افسوس ناک امر ہے کہ جو مجلس احرار اسلام امّۃ مرحومہ کے متّفقہ عقائد اور اجتماعی مقاصد ملحوظ رکھتے ہوئے بے پناہ عزائم کے ساتھ اجتماعی قیادۃ کے لیے میدانِ عمل میں اتری تھی ـــ وہی جماعۃ اپنی برپا کردہ تحریک کے نشیب و فراز پر مشتمل سوانح و واقعات کو ابتدائی دور میں مناسب نظم و ترتیب کے ساتھ قلم بند کرانے کا اہتمام نہ کرسکی، پھر اُصولِ فطرۃ کے تحت ہر رہنما کا اپنا ایک مُستقل مزاج تھا، یہاں جماعۃ کے تمام اہلِ علم و قلم اصحاب کا نہ تو مکمّل تعارف اور استقصاء مقصود ہے اور نہ ہی تقدِمہ کی محدود تحریر میں اس تفصیل کی گنجائش موجود ہے، اس لیے صرف دو اصل بنیادی و مرکزی اکابر اور اُن کے چند ایسے رفقاء کا مُجمل و مختصر ذکر کیا جاتا ہے، جن کی تقریر و تحریر جماعتی اُصول و مقاصد کے لیے سب سے زیادہ مُستند ترجمان کی حیثیّۃ رکھتی ہے۔

ا:

سیّدنا حضرۃ ـــ "اَمیرِ شریعۃ" رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے خطابۃ کا شہنشاہ تو بنایا ہی تھا اُس کے ساتھ ہی قلم کے ذریعہ اظہارِ مافی الضّمیر کی زبردست صلاحیۃ و قوۃ بھی عطا فرمائی تھی جس کا بڑا واضح ثُبوت آپ کے بیاض و خُطوط وغیرہ کی انتہائی سادہ و سہل، شُستہ و شگفتہ اور جامع تحریرات میں ملتا ہے، لیکن ایک[1] تو تصنیف و تالیف اُفتادِ طبع کے مطابق نہ تھی اور نہ ہی اُس کی طرف کچھ میلان اور شوق تھا، دوسرے[2] جس قسم کی مصروف ترین عوامی زندگی، تبلیغی جِدّ و جُہد میں بہ حدِّ آخر انہماک اور ریل جیل کے چکّر نے آپ کو گھیر لیا تھا، اُس حالۃ میں یہ شُغل اختیار فرما بھی لیتے تو نبھ نہ سکتا ـــ ورنہ اپنی سراپا باغ و بہار فطرۃ، آمادہ و مُستعِد اور موزون طبیعۃ، ذہانۃ و فطانۃ، فراسۃ و بصیرۃ، علمی، ادبی اور شعری ذوق، چہل[40] سالہ بے پناہ مطالعہ و مُشاہدہ اور عملی تجربہ کے پیشِ نظر جو کچھ بھی قلم بند فرماتے وہ ضخیم دفاتر پر مُشتمل، تمام مسائل پر حاوی دستاویز اور حرفِ آخر کا درجہ رکھتا، اس میں ـــ "پیغُونِ دہر" ـــ کے ہر تماشا کی روداد تو ہوتی ہی ـــ لیکن ہر تحریک و جماعۃ اور اُن کی بڑی بڑی ہَول ناک بھاری شخصیّات کے مکھوکھلے اور وحشۃ انگیز کرداروں سے متعلّقہ ـــ "اَندرونِ خانہ" ـــ کے سینکڑوں سربستہ رازوں کی نقاب کُشائی اور حقیقۃ نُمائی بھی ہوتی، کہ آج ہم تاریخِ سیاسۃ و حُرّیّۃ کے مطالعہ و تحریر میں اُن مخفی داستانوں کی ایک

ایک سطر کے لیے بے شمار گز مُجمل مطبوعات کے محتاج ہیں، پھر رطب و یابس اور حق و باطل کا ملغوبہ اخباری ذخیرہ اور دشمنانِ اسلام و دشمنانِ تحریکِ آزادی کے بُغض و انتقام کے زہر میں بُجھے ہوئے ظالم قلم سے دن رات میں دھڑا دھڑ نکلنے والے "یَہُودِ یَّانَہ لِٹریچر" کا انبار سامنے ہے جو ہمارے لیے تعجب و حیرۃ اور افسوس و حسرۃ اور فکرِ مستقبل کی مجسّم دعوۃ بنا ہوا ہے۔!

ب:

حضرۃ مولانا "حَبِیْبُ الرَّحْمٰن" لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اکثر خطوط و بیانات لکھنے اور کتابی مواد بہت کم قلم بند فرماتے تھے، تاہم "خُطْبَۂ صَدَارَت" "خُودنوشت سوانحی خاکہ" "اسلامی حکومۃ" وغیرہ عنوانات سے جو چند اوراق بھی آپ نے لکھے وہ اُن کے عقائد اسلامی کی طرح مستحکم، اٹل، واضح دینی فکر، صیقل شدہ سیاسی شعور و بصیرۃ، ذکاوۃ و نکتہ رسی اور تدبّرِ کامل کے آئینہ دار ہیں۔!

ج:

قائدِ احرار محترم شیخ "حُسَامُ الدِّین" رحمۃ اللہ علیہ اصطلاحی طور پر کوئی مصنّف یا مؤلّف نہ تھے۔ البتّہ فطری استعداد، علم دوستی، ادب و انشاء سے والہانہ ربط و دلچسپی، ذوقِ شعر و سخن فہمی، وسیع سیاسی مطالعہ و مشاہدہ، تاریخ عہدی پر محیط دینی، قومی اور ملکی معاملات میں تلخ و صبر آزما سیاستہ کا عملی تجربہ۔ اور سب پر مستزاد اپنے عہد کے جیّد علماء و صُلحاء اور آزمودہ کار احباب و قائدین کی سراپا شفقۃ، صحبۃ اور برکۃ آمیز تربیۃ۔ ان اجزاء و عناصر نے اُن کی طبیعۃ اور مزاج کو تصنیف و تالیف اور ترجمہ کے فن سے بہت مانوس و قریب کر دیا تھا لیکن ہر لحظہ کی پُرخطر انقلابی زندگی کے بے پناہ مشاغل کے سبب سے انہیں بھی یکسوئی اور استقلال کے ساتھ اِس فن کے مقتضیات پورے کرنے کی مہلۃ نہ مل سکی، تاہم اس افراتفری میں بھی اُن کے قلم سے چند ایک قابلِ قدر اور مفید چیزیں ضبطِ تحریر میں آگئی ہیں، مجلسِ احرار اسلام کے اُصول و مقاصد اور جدّ و جہدِ آزادی کے دوران میں اُس کے مثلیت لائحۃ العمل کے اظہار کے لیے مختلف مواقع میں آپ کے چند ایک خطبات، بہت سی تقاریر اور متعدّد بیانات کا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے۔ یہ تحریرات قومی نفسیات پر اُن کی گہری نگاہ، فرنگی کی عیّارانہ ڈپلومیسی نیز اُس کے

ہندو مُسلم گماشتوں اور ملّۃ و وطن دشمن رجعت پسند ٹوڈی تحریکات کے پس منظر سے آگاہی کی دلیل ہیں اور خصوصاً بین الاقوامی سیاستہ سے اُن کے غیر معمولی شغف اُس کے عالمانہ شعور، وطنِ عزیز اور عالمِ اسلام کے مستقبل پر یہود و نصاریٰ اور دہریوں کے بے پناہ و روز افزوں اقتدار و تسلّط کے اسباب و علل پر ماہرانہ عبور اور مبصرانہ تجزیہ نگاری کا عکسِ جمیل ہیں، جماعۃ کی "مَرْکَزِی عَامِلَہ و مَجْلِسِ مَنْدُوْبِیْن" (جنرل کونسل) کے اجتماعات میں مرتّبہ اکثر و بیشتر قراردادیں حضرۃ شیخ صاحب مرحوم کی فکری پختگی اور سیاسی بصیرۃ کے تجزیہ کے لیے بہترین معیار و میزان کا درجہ رکھتی ہیں، ایک فرنگی مصنّف کی مشہور سیاسی کتاب کا مفید مطبوعہ اردو ترجمہ بنام "انقلابِ سن ستاون (۱۸۵۷ء) کی تصویر کا دوسرا رخ"۔ اہم تاریخی خدمۃ کا درجہ رکھتا ہے۔ نیز پچاس (۵۰) سال پہلے جب روس اور اُس کے ماحول میں ایک خالص مادّہ پرستانہ فکری بغاوۃ اُبھری اور عالمی سطح پر انتہائی مؤثّر و خطرناک، دہریّۃ آمیز و اباحیّۃ انگیز اشتراکی انقلاب برپا ہوا تو اُس وقت روس میں ایک غیر ملکی مبصّر و مؤلّف مقیم تھا، جس نے داستانِ انقلاب کو جامع صورۃ میں محفوظ رکھنے کے لیے ایک زبردست تاریخی اور سیاسی کتاب تالیف کی، حضرۃ شیخ صاحب مرحوم نے اُس کتاب کا دو (۲) ضخیم جلدوں میں معنیٰ خیز، شُستہ و شگفتہ اور سلیس و رواں اُردو میں ترجمہ کیا، جو اُن کی زبان دانی، انشائی صلاحیّۃ، مقصودِ مصنّف اور موضوع و مضمون کے صحیح فہم و احساس، اُس کی کامیاب عکّاسی اور بھرپور ترجمانی کا بہترین شہکار ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے متعدد خطبات و بیانات نیز ملکی اُمور اور وقتی تحریکات میں قائدانہ رہنمائی کے نقطۂ نظر سے بہت سی تقاریر کا ایک ذخیرہ بھی موجود ہے جو مجلس اور قوم کی نئی پود کے لیے جماعتی عقائد و افکار، اُصول و مقاصد اور بنیادی محرکات و عوامل کا محتاط جائزہ کہلانے کا مستحق ہے۔ جماعۃ کے خلوص و ایثار، حیرۃ انگیز و روح پرور، ایمان افروز، قابلِ رشک احوال اور ناقابلِ تردید واقعات پر مشتمل یہ ذخیرہ جو اُس کی تاریخ کے ایک اہم باب اور ملکی سیاستہ کے لیے آئینہ حقیقۃ نما کی حیثیّۃ رکھتا ہے اپنوں کے لیے روشن و شاندار ماضی کی عظیم فکری دستاویز ہے اور اغیار کے لیے ایک دفترِ نصیحۃ و عبرۃ۔۔۔!

د:

جناب مولوی "مَظْہَرْ عَلِی اَظْہَرْ" شیعہ مذہب ہونے کے باوجود اپنے وقت میں جماعۃ کے بلند پایہ

سیاسی ترجمان، اس کی ملکی پالیسیوں کے بہترین مجوزہ و شارح اور معترضین و مخالفین کے مقابلہ میں بے نظیر جوابی مقرر تھے۔ علمی و اصولی بحث کے وقت روشن فکر، شستہ زبان اور استدلال و منطق کے ہتھیاروں سے مسلح۔ بے باک نقاد و مبصر تھے، انہوں نے بھی متعدد خطبات و مضامین سپردِ قلم کیے، خصوصاً "تحریکِ شہید گنج" ۔ "تحریکِ مدحِ صحابہ" ۔ اور ۔ "ہمارے فوقہ وارانہ فیصلے کا استدراج" ۔ یا ۔ "جداگانہ انتخاب سے پاکستان تک" ۔ جیسی اہم تالیفات کے ذریعہ تاریخِ سیاستہ و اجتماعیات کے اساتذہ اور خوشہ چینوں سے بے پناہ خراجِ تحسین وصول کیا ۔ !

۵ :

مفکرِ احرار، امیر ۔ "افضل حق" ۔ رحمۃ اللہ علیہ بنیادی طور پر ایک مفکر و مصلح اور خوش فکر ادیب و انشاپرداز تھے، ابتدا سے ہی قلم و قرطاس سے لگاؤ تھا۔ دینی نقطۂ نظر، اصلاحِ اخلاق و اعمال خصوصاً قومی اور سیاسی زندگی کو سرمایہ پرستی، معاشی استحصال اور ظلم و تشدد کی آلائشوں سے تطہیر و تہذیب سے ہمکنار کرنا اُن کا فطری جذبہ اور دل پسند و تحقیقی موضوع رہا، چنانچہ ۔ "دُنیا میں دوزخ" ۔ "تہذیب" ۔ "جواہرات" ۔ "شعور" ۔ "دیہاتی رومان" ۔ "آزادیِ ہند" ۔ "محبوبِ خدا" ۔ "میرا افسانہ" ۔ "دینِ اسلام" ۔ نیز متعدد خطبات، بیانات اور توضیحی مضامین کے مختلف عنوانات کے تحت ان کے خامۂ گوہر بار کے ذریعہ ہزاروں صفحات میں پھیلا ہوا بیش بہا تحریری سرمایہ موجود ہے، جو اُن کے تقدسِ عقائد، علوِ فکر، اخلاصِ نیت، جذبۂ اصلاح و دردمندی، نفسیاتی تبحر، سلامتِ ذوق، حسن و معصومیتِ تعبیر، نفاستِ طنز، بلاغتِ تطبیق یعنی عروجِ انسانیت اور کمالِ اسلامیت کا امین اور عکاس و ترجمان ہے ۔ !

۳ ــــــ ● ان اوصاف کے ساتھ ساتھ ہر بزرگ عقائد، تبلیغ، سیاست، معاشیات وغیرہ مختلف مضامین میں سے کسی نہ کسی موضوع کی طرف ایک مخصوص طبعی رجحان رکھتے تھے، نیز اپنے اپنے فقہی مسلک اور مذہب سے وابستگی کی بنا پر مختلف خیالات کے بھی پابند تھے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اختلافِ فکر و مذہب مختلف قومی مسائل پیدا ہونے پر ہر موقع کی مناسبت سے بالکل واضح طور پر سامنے بھی آجاتا، بڑے پیارے انداز میں ضابطہ کی شکایات بھی ہوتیں اور اُن پر بحث و تمحیص بھی ہوتی۔ کیوں کہ ارضِ ہند و پاک کی مختلف اقوام

میں کفر و اسلام کا اختلاف اور مذہبی گروہوں میں مسلکِ حق و باطل کی نسبت قائم ہونے کے باوجود چونکہ آزادی کا مرحلہ ابھی دور تھا اور جذبۂ خود اختیاری کے مطابق دینی بنیادوں پر سب کے حقوق کی تعیین اور دستور و قانون سازی کا مسئلہ ابھی زیرِ بحث اور زیرِ عمل لانے کا وقت ہی نہیں آیا تھا بلکہ غلامی کی صدیوں سے محیط اور ملک گیر آفت کے سدِ باب کے لیے ۔ نیز سر دست ایک ظالم و غاصب بیرونی اقتدار کی جڑیں اکھیڑنے کی غرض سے مشترک دشمن ۔ "انگریز" ۔ کے خلاف اصل محاذ قائم تھا اور آزادیٔ وطن کے بعد خود مختار قومی حکومت کی تشکیل کے ذریعہ ایک روشن مستقبل اور پُر امن و فراغت زندگی کی حسین اُمید و آرزو اور پاکیزہ جدوجہد پیشِ نظر تھی اور یہی موضوع اپنی بنیادی اور مرکزی حیثیت کے سبب سے تمام مسائل پر حاوی تھا۔ اس لیے خطرناک سے خطرناک ابتلا کے وقت بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! جماعت اندرونی طور پر کبھی بھی فرقہ وارانہ کشمکش کا شکار نہ ہوئی اور مختلف الخیال و مختلف المسلک لوگوں کا یہ عجیب و غریب اجتماع نہ تو کبھی راہِ راست سے انحراف کا ذریعہ اور نہ ہی منزلِ مقصود سے اُس کی دوری کا سبب بن سکا، بلکہ اس کے بالکل برعکس ہوتا یہ تھا کہ یہ بزرگ لوگ مناسب دماغی جنگ اور محتاط علمی اختلاف کی سیر و تفریح کے بعد پھر اصولی اتحاد کی قدرِ مشترک پر جمع ہو کر اپنے اصل مقصد کے لیے مصروفِ کار ہو جاتے تھے، غرض اُن کی دوستی، اجتماع و اختلاف، بحث و نزاع اور اتحاد ساری جدوجہد صرف اور صرف دین اور قوم و وطن کے لیے تھی ذاتی غرض کا اُس میں شائبہ تک نہ تھا ۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ ؛

افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی !

یہ تمام صورتِ حال جماعت کے حق پرست اکابر اور وسیع الظرف، بہادر اور جان نثار کارکنوں کے خلوصِ نیت، سچی لگن اور محنت کا ثمرہ تھا۔ ورنہ حقیقۃً نہ تو اس سے پہلے اور نہ ہی بعد میں حتیٰ کہ آج تک بھی ایسے مختلف و متنوع عناصر کا ایسا کامیاب اجتماع بروئے کار آسکا اور نہ ہی قومی معاملات میں ملک گیر پیمانہ پر ایسے بارونق و پُر تاثیر اور مثبت انقلابی نتائج ہی برآمد ہو سکے اور آئندہ کے لیے تو ان باتوں کی اُمید بلکہ خیال بھی دیوانہ کا خواب بن کر رہ گیا ہے، اور یوں تو جب تک "سانس تب تک آس" ۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۔ !

پھر بھی واضح رہے کہ دیوبندی، بریلوی، غیر مقلد، تفضیلی شیعہ، حتیٰ کہ انقلابِ روس سے کچھ متاثر آزاد خیال چند نوجوانوں کے اس عجیب و غریب اور بظاہر متضاد اجتماع کے وقت بھی شیعہ تو ملکی سطح پر بھی حد سے حد دس سے زائد نہ تھے، البتہ مقلد، حنفی، بریلوی اور غیر مقلد اہلِ حدیث کی تعداد بلا شبہ سینکڑوں تک پہنچتی تھی اور ان کے بعد تو جماعت کے ہزاروں اور لاکھوں متعلقین کی قطعی اکثریت اُمت کے ننانوے (۹۹) فی صدی متفقہ عقائد کے مطابق "اَہْلُ السُّنَّۃِ وَالْجَمَاعَۃِ" اور "اَکابرِ دیوبند" کے مسلک پر کاربند تھی۔ یعنی پوری جماعت پر اُصولاً ہمیشہ سے صحیح العقیدہ اکابر اراکین و معاونین اور رضا کاروں کی جمہوریت قابض اور اُس کی تمام دینی اور ملکی مہمات میں کار فرما روح و رواں تھی اور اس اکثریت کی نہایت بہتر و موزوں نمائندگی کے لیے بھی قدرت نے سید الاحرار حضرت امیرِ شریعت اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہما کو منتخب کر دیا تھا۔ اُن کا اعتقادی تصلّب، غیرت مندانہ موقف و مسلک اور خاندانی و شخصی وجاہت اختلاف اور شک و شبہ سے بالاتر تھی، جماعت کی اصل دینی و سیاسی قیادت اِن "عَبْقَرِیُّ الْفِطْرَۃِ" (جینیئس) اور اہل ترین اشخاص کے فکر و عمل سے مربوط ہونے کے سبب سے بفضلہٖ تعالیٰ ہر قسم کے فکری اختلال اور عملی تزلزل سے محفوظ رہی، جماعت کے صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی ایک تو یہی بنیادی وجہ تھی اور دوسری وجہ جو اسی سے ملتی جلتی ہے وہ یہ کہ اکابرِ احرار کے توسط سے جماعت کو وقت کے جید علماء و مشائخ کی علمی و روحانی سرپرستی کا بیرونی سہارا بھی حاصل تھا۔ نتیجۃً اندر باہر نیکی کے اس تعلق سے بحمد اللہ! جماعت میں خیر ہی خیر کا پہلو بہر طور اور بہر دور غالب رہا، چنانچہ اسی پالیسی نے ایک ایسی پُرجوش دینی فضا قائم کر دی تھی کہ پچھلے چالیس سال کے طویل عرصہ میں دہریت، عیسائیت، مرزائیت، چکڑالویت، سبائیت، بدعت پرستی نیز انگریز کے ہوا خواہوں اور نمک خواروں کی ہر غدارانہ تحریک، قوم فروشانہ اور وطن دشمن سیاسی گٹھ جوڑ، غرض ہر فتنہ و سازش اور اُس کے سرغنوں کو "احرار" نے ایک لمحہ کے لیے کبھی بھی معاف نہیں کیا، بلکہ ہزار انسانی کمزوریوں اور مادی بے سروسامانیوں کے باوجود۔ اپنی استعداد و ہمت اور بساط و قوت سے سینکڑوں گنا بڑھ چڑھ کر دفاعِ دینِ مقدس کا فریضہ ادا کیا، اپنے اکابر کی مشہورِ عالم اور بے نظیر قوتِ خطابت،

اور محدود تر اشاعتی وسائل کے ساتھ ملعون "اَنگریز" کا منہ توڑنے، اُس کے تمام ذلہ خواروں اور خود کاشتہ پودوں کی پوری سرکوبی اور بیخ کنی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی، تو پھر محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور فضل و کرم کے شاملِ حال ہونے، نیز حضور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے ازواج و اولاد اور اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم کی روحانی تاثیر و توجہ اور فیض و برکت سے ہر دور و مرحلہ اور دین و سیاست کے ہر شعبہ میں خلافِ امید و توقع مناسب کامیابیاں بھی جماعت کو حاصل ہوئیں، اور کچھ بھی نہ ہوتا تو یہی ایک چیز کیا کم قابلِ فخر و موجبِ شکر ہے؟ کہ اس غریب گر مخلص جماعت کے وجود سے بفضلہٖ تعالیٰ حق پرست علماء و مشائخ کی پگڑیاں محفوظ ہو گئیں اور انھیں سیاسیات میں عوامی سطح پر دخل انداز ہونے کے مواقع میسر آئے، مدارس و مجالس اور صحیح اہل السنۃ والجماعۃ کا وقار بلند ہوا اور اُن کا حوصلہ دو چند ہو گیا، غلبۂ اسلام کی تحریک کو زبردست قوت حاصل ہوئی، بے زبانوں کو زبان اور طاقتِ گفتار مل گئی، اسلام اور انقلاب کا نام لینے والے گھروں سے نکل کر جہادِ آزادی میں صفِ اول کے شریک اور دینی محاذ پر مورچہ بند ہو گئے۔ وَکَفٰی بِہٖ فَخْرًا وَّشُکْرًا!

۴ —— • جماعت کے قومی مآثر اور قابلِ فخر کارناموں میں تقسیمِ ملک سے پہلے اپنی تنظیم کا اعلان کرتے ہی سب سے پہلے تحریکِ کشمیر ۱۹۳۱-۳۲ء کی زبردست آزمائش پیش آئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے فتحِ مبین عطا فرمائی، اُس کے بعد بالترتیب تحریکِ کپورتھلا ۱۹۳۳ء، تحریکِ مسجد شہید گنج لاہور ۱۹۳۵ء، تحریکِ مدحِ صحابہ لکھنؤ ۱۹۳۶-۳۷ء، تحریکِ بہاول پور ۱۹۳۸ء، تحریکِ مسجد منزل گاہ سکھر ۱۹۳۹ء، تحریکِ قیامِ حکومتِ الٰہیہ ۱۹۴۳ء اور پھر تقسیمِ ملک کو اوّلاً بطورِ "وفاقی حکومت" اور آخر میں "تشکیلِ پاکستان" کی صورت میں قبول کرنے کے لیے۔ تحریکِ تکمیلِ آزادی ۱۹۴۶ء کی عظیم جنگ لڑی گئی! یہ تمام تحریکات مذکورہ بالا نتائج کے لیے مرحلہ وار اور زندہ بیجا جو مسلسل اور بے پناہ جِدّ و جُہد کی گئی۔ اُس کے دعویٰ کے زندہ ثبوت اور سچی گواہی کے انمٹ نشان ہیں، تقسیمِ ملک کے بعد جب لیگ کے "اِسْلَامِیْ پَاکِسْتَان" والے جھوٹے نعرہ کے بھرتے میں آ کر لُٹ جانے والے مسلمانوں میں فطری طور پر دین سے والہانہ اور باشعور وابستگی کا باقاعدہ اظہار شروع ہوا، پوری

ملّت کے دل میں اُسوۂ صحابہ کی روشنی میں کتاب و سنّت پر مبنی نظامِ زندگی برپا کرنے کی پرانی آرزوئیں
مچلنے اور اُمیدیں کروٹیں لینے لگیں، فرنگی کے بنائے ہوئے مردم شماری کا دفتر اُلٹ کر کفر و اسلام کا
صحیح قانونی فرق اور شریعت میں کافر و مسلم کے مقررہ حقوق کا تعیّن و امتیاز، خصوصاً مرزائیوں کا کفر
و ارتداد واضح کرنے کا اٹل عزم و جذبہ بروئے کار آگیا۔ تو پھر توحید و ختم نبوۃ اور ناموسِ ازواج و
صحابہ کے تحفظ کے لیے عاشقانہ ایثار و قربانی کے عدیم المثال مظاہرہ کے طور پر۔ "تحریک
مقدس تحفظ ختمِ نبوۃ ۱۹۵۳ء" بنارۂ نور بن کر نمودار ہوئی، جس کی شدّۃ، قوۃ
وسعۃ اور عظمۃ کے طفیل سے بے مروّۃ و بے وفا اربابِ اقتدار کے برسوں پہلے لگائے ہوئے
کھوکھلے اور جھوٹے اسلامی نعروں کی قلعی کھل گئی، ازلی احرار دشمنوں، انگریزی ٹاوڈوں، ٹوڈیوں، سرکاری
مولویوں نیز ہر فرقہ کے خود غرض اور شیطانی بغض میں مبتلا، ناپسندیدہ افراد نے۔ تحریک کو تہ و بالا
کرنے اور اُس کے متعلقین کو خاک و خون میں تڑپانے کے لیے ظالم حکومۃ سے ناپاک گٹھ جوڑ اور
سازش کا جو گھناؤنا کردار ادا کیا تھا، اس کے راز طشت از بام ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ "جماعۃِ اسلامی"۔
جو اھل السنّۃ والجماعۃ کے خلاف چل کر۔ "خوارج و روافض" کی طرح ایک من بھاتے اور بالکل
نئے اجتہادی مذہب کو رواج دے کر بھی "اصل اسلام" کی اجارہ داری سنبھالے بیٹھی ہے اور "مسلم لیگ"
کی ریس میں پچاس (۵۰) سالہ تاریخِ آزادی کو مسخ کر کے بزعمِ خویش قوم کی فرضی واحد نمائندگی کی مدّعی اور در حقیقۃ
ایک مغرور اور غلط کار قیادۂ عظمٰی کی علمبردار بنی ہوئی ہے، "اسلام! اسلام!" کی رٹ لگانے میں
بڑی فنکار اور پروپیگنڈے "پبلسٹی" کی جدید برطانوی اور نازی جرمنی والی استادکاری اور تکنیک میں
ماہر و مشّاق ہے۔ اِس جماعۃ نے تحریک کے مدّ و جزر پر موقع پرستانہ نگاہ رکھی، بہ شرطِ کامیابی ساتھ ہونے
کا دعویٰ رکھنے اور بہ صورۃ ناکامی۔ اپنی اخلاقی براءت کو دلیلِ فرار بنانے کی دوغلی پالیسی اپنائے رکھی، بظاہر
حکّام اور احرار سمیت تمام دوسری تنظیمات کے مخالف ہو کر اپنی مصنوعی میانہ روی، امن پسندی، اور
قانون پروری کا عیّارانہ پروپیگنڈا جاری رکھا، لیکن اپنی اصل حقیقۃ اور فطرۃ کے بالکل مطابق مفت کے
کریڈٹ، جھوٹے وقار اور آرزوئے اقتدار کی خاطر عین وقت پر۔ "وغدر معاف۔ "سلطانی گواہ"

کا روپ دھار لیا، جنوری ۱۹۵۳ء کے دوران میں سابق وزیر جناب الحاج۔ "مولانا بخش سومرو" کی کوٹھی
پر کل پاکستان۔ "مجلسِ عمل" کی مرکزی کراچی کنونشن میں ملک کے ہر فرقہ سے متعلقہ پانچ سو (۵۰۰)
نمائندہ علماء سمیت اِس کے امیر المومنین جناب۔ "مودودی" صاحب نے علانیہ شرکت کی اور
حضرۃ امیرِ شریعت کے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھے ہوئے تحریک کی راست اقدام والی آخری قرارداد
پر واضح دستخط کیے۔ چنانچہ سینکڑوں دستخط والی اس قرارداد کا اصل کاغذ بطورِ ثبوت تحقیقاتی
کورٹ میں پیش ہو کر جھوٹوں کا منہ بند بھی کر چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود "صالحین" — اور اُن کے
— "قائدِ اعظم" — نے کچہری میں اِن سب باتوں سے دیدہ دلیرانہ انحراف و انکار اور قوم سے
غدّاری کا مکروہ ارتکاب کر ڈالا۔

حضرتِ ناصح نے مئے پی کر یہ اچھی چال کی؛
محتسب سے جا ملے، رندوں کے مخبر ہو گئے!

لیکن سارے جتن کر گذرنے کے بعد بھی فرضی پاک دامنی ثابت کرنے اور چمڑی بچانے کی ہر کوشش
ناکام ہو گئی، واقعہ کے مطابق حکومۃ نے مجرم قرار دے کر سزا بھی دے ڈالی بحال آنکہ اگر یہی افتاد اعلانِ حق کے ساتھ
قبول کی جاتی تو عینِ ایثار و جہاد کی نعمۃ سے سرفراز ہوتے، مگر مقدّر کی روسیاہی چھا کر رہی، چنانچہ اس گروہ کے
ہر چھوٹے بڑے نے اپنی مخصوص و معیّن خفیہ پالیسی کے مطابق ہر حجّۃ تمام ہو جانے کے باوجود دورانِ تحریک، دورانِ
تفتیش، بعد از خاتمۂ تحریک آزاد ہو کر۔ اور دورانِ مارشل لا بھی زبان و قلم اور عمل کا ہر حیلہ استعمال کر کے پوری
ڈھٹائی سے اپنی تاجرانہ ذہنیّۃ اور دو رُخی پالیسی کے درست ہونے پر مجرمانہ اصرار جاری رکھا، حتّٰی کہ آج تک بھی
پیسے اور پروپیگنڈے کے زور پر اُس کی طرف سے اپنے باطل کو حق ثابت کرنے کی مذموم کوشش پوری ہٹ دھرمی سے
جاری و ساری ہے۔ مجاہدینِ احرار اور علماء کی اس نئی مدّعی تجدید دین۔ حزبِ مخالف اور مسلمانوں کی ان جیسی
کئی دوسری بوگس اور فراڈ قسم کی خیر خواہ ٹولیوں کا گریز و فرار اور بغض و نفاق بھی اسی تحریک کی برکت سے
عالَم آشکارا ہو کر رہا، احرار کے زیرِ سایہ آٹھ دوسری مسلمان جماعتوں کی رفاقت میں چلنے والی یہ سراپا امن و
قانون، عوامیّۃ و جمہوریّۃ کی مکمل تائید سے مسلّح، تاریخ ساز عظیم الشان تحریک۔ احرار کے دین و دنیا کی

سب سے بڑی۔ "متاع"۔ اُس کے لیے باعثِ ہوا۔ عزّۃ و افتخار سرمایہ اور مُوجبِ فلاح و نجاۃ عَمَلِ صالح ہے، کہ اِن تمام بدعہد، غدّار، قومی اور دینی مُجرمین کے اِنکار اور بھگوڑے پَن کے بالکل برعکس "قوم" "مُنبر تحقیقاتی کورٹ" اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حسن عظیم و بے مثال تحریک کے اوّل و آخر کی تمام تر ذمّہ داری قبول کرنے کا شرف بھی صِرف احرار کے امیرِ کارواں حضرۃ "أَمِيْرِ شَرِيْعَةْ" رحمۃ اللہ علیہ کا روشن نصیب ہُوا۔ اور قیامت تک کے لیے اس گناہ گار مگر مخلص و ایمان دار جماعۃ کے اِجتماعی محاسن کا طُرّۂ امتیاز بن گیا، "وَذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ"۔!

۵ —— ● بہرکیف اپنے عجیب و غریب عوامی اور جمہوری اِجتماع اور تاریخی پس منظر کے مطابق مجلسِ احرار اسلام کا بنیادی مَوقِف اور مجموعی کردار یہ رہا ہے کہ مُسلم عوام کو اِنفرادی ضروریات اور قومی حوادث میں رہنمائی دینے کے لیے اُس نے اپنی بادلیل فقہی رائے کے باوجود اکثر و بیشتر۔ حُجّۃ الاسلام حضرۃ علّامہ۔ "مُحَمَّدْ أَنْوَرْ شَاہْ"۔ انصاری کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ، فقیہ اعظم، حضرۃ علّامہ مُفتی۔ "مُحَمَّدْ كِفَايَةُ اللہْ"۔ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور قُطب العصر حضرۃ مولانا شاہ۔ "عَبْدُ الْقَادِرْ"۔ رائے پوری نَوَّرَ اللہُ مَرْقَدَہٗ جیسے اکابرِ علمائے حق کے مَسلک پر اعتماد کیا اور خالص ملکی اور سیاسی مشکلات میں اُمّت کے اجماعی فتویٰ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی مستقل رائے کو اپنے دستوری ضوابط کے ساتھ اپنایا اور پھر تنظیمی لائحۂ العمل کے طور پر پوری قوم کو اس کی روشنی میں بھرپور جِدّ و جُہد اور زیادہ سے بہرہ ور کیا، طبعی اُصول کے مطابق ملکی مسائل میں بہت سے مواقع پر حضرات علمائے کرام سے پورے خلوص و دیانت کے ساتھ دلائل و شواہد کی بنیاد پر زبردست اختلافات بھی ہوئے، لیکن ایسی جداگانہ سیاسی آراء بھی محض اختلافی بات نہ تھیں بلکہ اُن کے اندر بھی بزرگوں ہی کا ایک جمِّ غفیر احرار کا مؤیّد و ہم نوا رہا، وہ آراء اُن سے اِستصواب اور اُن کے مشورہ سے کبھی خالی نہیں رہیں، اس سلسلہ میں حضرۃ رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ تو خصُوصیّۃ کے ساتھ ہر مرحلہ پر اور ہر مُہِم میں نہ صرف یہ کہ چند اکابرِ احرار کے شیخ طریقۃ ہونے کی حیثیّۃ میں ہی فیض رساں تھے بلکہ آخری دم تک پوری جماعۃ کے پیر و مُرشد اور روحانی مُربّی و سرپرست کا

منصب بھی سنبھالے رہے، اور ایک زمانہ گواہ ہے کہ ایسے بزرگوں کی الہامی تائید کے ساتھ ہر وہ کام کرنے والا احرار کا ہر فیصلہ بحمد اللہ! روزِ روشن کی طرح واضح اور دو دُونی اور دو دُو چار کی طرح اٹل حقیقۃ بن کر قوم سے ہمیشہ خراجِ تحسین وصول کرتا رہا۔!

● تحریک سے متعلقہ لٹریچر بہ شمولِ تاریخ احرار کے سلسلہ میں جماعۃ کے مختلف عناصر کا جو نفسیاتی تجزیہ سابقہ صفحات میں پیش کر دیا گیا ہے، اُسے ملحوظ رکھنا بہر طور ضروری ہے، اس کا اُصولی مُفاد یہ ہے کہ جماعۃ کی طرف سے کسی بھی مطبوعہ مضمون و خطبہ اور کتاب میں بوقت مطالعہ قارئین کو اگر کسی لکھنے والے بزرگ کے فکر و مسلک اور جماعتی عقائد و مقاصد میں کوئی بُعد و تضاد محسوس ہو تو مذکورہ بالا تجزیہ دیکھ کر ایسے اختلاف کو فی الحقیقۃ جماعتی منشور کا معنوی اختلاف و تضاد سمجھنے کا خطرہ ٹل جائے گا، کیوں کہ ایسی مشکوک تحریر لازماً جماعۃ میں شامل رہتے ہوئے کسی دوسرے فرقہ سے متعلّق رہنما اور کسی خاص علمی و سیاسی موضوع سے دلچسپی رکھنے والے بزرگ کے ذاتی تأثّر و خیال اور انفرادی رُجحان و رائے کے تحت ہی شائع شدہ مضمون ہوتی ہو گی، بطورِ اُصول پوری جماعۃ کے مرکزی فکر و عمل سے اُس کا کوئی تعلّق نہ ہو گا۔ کیوں کہ جماعتی منشور و دستور، اُس کی مطبوعات، اُس کے تحریک و عمل اور اکابر کے فکر و مسلک میں بحمدِ اللہ کوئی حقیقی اختلاف و تضاد ہے ہی نہیں، اب چاہے شیعہ سنّی مسلک کی تحقیق ہو یا دیوبندی، بریلوی اور غیر مقلّد مکتبِ فکر کی کوئی بحث، ایسے ہی مسئلہ اصلاحِ مُعاشرہ اور کسان مزدور کی تنظیم کا ہو یا ملکی دستور و قوانین کی تدوین و تشکیل کا، اور وہ مضمون و کتاب یا خطبہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مُفکّرِ احرار امیر افضل حق، مولانا داؤد غزنوی اور مظہر علی اظہر کی کوئی نگارش ہو؟ یا شیخ حُسام الدین، ماسٹر تاج الدّین اور حافظ علی بہادر خاں کا کوئی نقشِ قلم ——! جس موضوع کی تشریح میں جہاں کہیں کوئی رائے جماعتی اُصول و مقاصد سے اجنبی اور اُس کی تحریک و جدّ و جُہد سے مختلف اور مُتناقض محسوس ہو اُس سے اصل عقیقۃ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ جماعۃ کی بنیادی ساخت اور قبل از تقسیم والے اُس کے طریقِ کار پر تاریخی نظر رکھنے والا ہر شخص اُسے بہرکیف و بہرحال کسی بزرگ کا ایک اتفاقی اور انفرادی احساس و تأثّر اور ذاتی رائے تو سمجھے گا، جماعۃ کا کوئی فکری منصوبہ اور اُس کا اجتماعی منشور۔

نظام ہرگز قرار نہیں دے سکتا، کیوں کہ ہزار وحدتِ فکر و یگانگتِ عمل اور ہزار جماعتہ و اجتماعیتہ کے رنگ میں ڈوب جانے کے باوجود بھی گلہائے رنگارنگ سے چمن کو زینت دینے والے "اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ" کا ضابطۂ تخلیق یہی ہے کہ ہر شخص کی ذات اور انفرادیتہ بہرحال اپنا اظہار چاہتی ہے اور اس کے اظہار میں اختلاف اور انوکھا پن اصولِ فطرۃ کے عین مطابق ہے، کوئی عیب اور موجبِ اعتراض امر نہیں۔!

وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ — تمہاری زبانوں اور رنگتوں کے جداپن میں بلاشک
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (الروم پ۲۱) — اہلِ علم کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

ب

۶— • مصنفِ کتاب کے مفصل و مستند سوانح تو انشاء اللہ تھوڑے عرصہ تک ایک مستقل کتاب کی صورۃ میں نیز "شعرائے اخوانہ" نامی زیرِ ترتیب کتاب میں شامل کر کے کچھ مدۃ بعد نذرِ قارئین کیے جائیں گے، البتہ خلاصہ احوال ملاحظہ کریں۔

رعنا قد، گٹھیلا جسم، کشادہ سینہ، شگفتہ رنگ، تبسم فشاں چمکیلی شربتی آنکھیں، ابھرے ہوئے رخسار، گول چہرہ، ہلکی ہلکی ملگجی ڈاڑھی، لمبی ستواں ناک، تیکھے نقوش، نکیلے خط و خال، آواز بلند اور پاٹ دار۔ مگر جیل میں سرمہ کھلاتے جانے کے بعد سے آخر عمر تک دبی گھٹی اور وقفہ وقفہ سے کھلنے والی، لہجہ متین اور باوقار، مزاج میں رنگینی اور لطافۃ، طبیعۃ میں ظرافۃ و شرافۃ، خاندانی وجاہۃ و تمکنۃ کا مثالی پیکر۔ "افضل حق" نام "مفکر اخوانہ" لقب، تخلص نامعلوم، خاندانی وطنِ مالوف گڑھ شنکر، ضلع ہوشیار پور، مشرقی پنجاب، راجپوت برادری کے ایک معزز، شریف اور نیک گھرانے میں جناب چودھری "امین خان" مرحوم کے ہاں ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے، بعض مخصوص حالات کی وجہ سے گھر والوں کا "امرت سر" میں قیام ہو گیا تھا، ۱۳۱۶ھ۔ مطابق ۱۸۹۹ء کے دوران امرت سر کے ایک سکول میں داخل ہوئے، فطری استعداد اور ذہانۃ نے ہر جماعۃ میں ممتاز رکھا، ماحول ابتدا ہی سے دینی تھا، خصوصاً والدۂ محترمہ بڑی پارسا خاتون تھیں، بچپن میں ہی مذہب سے شغف تھا، گھر والوں کی دیکھا دیکھی عبادۃ میں مشغول ہو جاتے، فرائض کے علاوہ نوافل کے بھی پابند ہو گئے تھے۔ خود نوشت سوانح میں فرماتے ہیں۔

اس زمانے میں شاید ہی کوئی نماز قضا ہوتی ہو۔" انگریز پرستوں سے قدرتی طور پر شروع سے ہی متنفر و بیزار تھے اور اس دورِ جبر و تشدد میں بھی جو حضرات انگریز دشمنی کا دم بھرتے مرحوم ان کے مداح ہوتے تھے، سوءِ اتفاق کہ سکول میں جانے کے بعد نئی تعلیم و تہذیب کا جوں جوں رنگ چڑھتا گیا۔ بے لوث طبیعۃ اس کے خطرناک اثرات کا عکس لیتی رہی، قربِ بلوغت کے وقت ہی افکار میں سخت برہمی اور عقائد میں تذبذب پیدا ہونے لگا، حتیٰ کہ نوعمری میں ہی وہم و خیال نے وجودِ باری تعالیٰ کے انکار تک پرواز کی، اس مرض کے علاج کے لیے کچھ مدۃ سرگرداں رہے اور اسی حالۃ میں ایک "بزرگ" کے ہاتھ پر بیعۃ کر ڈالی، ذوقِ صحیح اور فہم سلیم تھا، نیکی ورثہ میں ملی تھی، خارجی تربیۃ، ذکر اللہ میں مشغولیۃ اور کثرۃ عبادۃ نے اشہبِ عقل کی تیز گامیوں کا رخ بجائے بے راہ روی کے پھر صراطِ مستقیم کی طرف موڑ دیا اور انکارِ مذہب کا شیطانی وسوسہ بحمد اللہ دور ہو گیا، کئی برس کی محنۃ سر سے چڑھی اور فضل حق بجائے ایک آوارہ و ناکارہ شخص کے۔ جوانِ صالح کے روپ میں نمودار ہوئے، امرت سر میں انٹرنس تک تعلیم پائی، ۱۳۲۸ھ۔ مطابق ۱۹۱۰ء کے دوران میں لاہور آ کر "اسلامیہ کالج" میں پڑھنا شروع کیا، سوءِ اتفاق سے ۱۳۳۰ھ۔ مطابق ۱۹۱۲ء میں ایف۔ اے میں فیل ہو گئے، ۱۳۳۲/۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں۔ "دیال سنگھ کالج" میں داخلہ لے لیا، یہاں کا فطرۃً اجنبی ماحول طبیعۃ پر بہت اثر انداز نہ ہوا، تاہم ابتدا عمر سے فکر و عمل پر چوں کہ دین غالب چلا آتا تھا اسی کا اثر معاون بنا، کالج کی اعلیٰ تعلیم اور بھی آزادانہ تھی، اس لیے سابقہ تجربہ کے پیشِ نظر ہر قابلِ غور مسئلہ کو تحقیق و تفتیش سے حل کرنے کی فکر طبیعۃ کا عام انداز بنا رہا، دفاعی تدابیر کے باوجود دورانِ تعلیم ہی اسی کالج کے ایک ہندو پروفیسر مسٹر "ہنسراج" کے ساتھ "تصوف" کے موضوع پر بحث ہو گئی، بساط کے مطابق جواب دہی کرتے رہے، لیکن علومِ دینیہ سے عدمِ واقفیۃ اور اسلام کے شعبۂ عبادات کی صوفیانہ تعبیر سے علمی اور فنی لگاؤ نہ ہونے کے باعث ان کی تشریحات کے متعلق مدۃ مدیدہ تک دل میں ایک کھٹک باقی رہی، دورانِ تعلیم میں ہی آپ کی صحۃ خراب رہنے لگی، خصوصاً کھانسی کی تکلیف شدۃ اختیار کر گئی، حالات پر قابو نہ رہا تو آپ نے کالج کی تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی، باوجودیکہ مرحوم شروع سے ہی باغیانہ رجحانات

رکھتے تھے، لیکن فرنگی کا یہ سارا نظامِ تعلیم ہی چونکہ حقیقی علم سے دُوری کا سبب اور صرف مُلازمت و نوکر شاہی کے کارندے پیدا کرنے کا مہذّب ذریعہ ہے، پھر اسی نظام کے تحت نوجوانوں کو تربیت کا لادینی ماحول نصیب ہوتا ہے اور اُس کے بالکل منفی اثرات ظاہر ہوتے ہیں، لہٰذا۔ مرحوم کو بھی اِنہی اُمور سے سابقہ پڑا اور اُسی قسم کے نتائج بھی ترکِ تعلیم کے وقت مرتّب ہوئے، چنانچہ کچھ مدّت کے انتظار اور غور و مشورہ کے بعد۔ آپ پولیس میں سب انسپکٹر بھرتی ہو کر ٹریننگ کے لیے۔ "قلعہ پھلور" ضلع لدھیانہ ہی چلے گئے اور فراغت کے بعد لدھیانہ میں۔ "تھانہ صدر" کے سب انسپکٹر متعیّن ہو کر کچھ مدّت تک وہیں مقیم رہے، ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم ترکی کی شکست پر ختم ہوئی، اِتحادی ممالک نے اُس کے مقبوضات اور اُس کی حدود میں شامل تمام اہم مقامات بندر بانٹ کر کے آپس میں تقسیم کر لیے، خلافتِ عثمانیہ کی موت کے پروانہ پر دستخط ہو گئے، مسلمانوں کے بین الاقوامی مصائب کے نئے باب کا افتتاح ہوا، پوری اسلامی دنیا میں اس حادثہ سے کہرام برپا تھا، ہر فردِ بشر بقدرِ شعور و احساس متاثر ہوا، آپ بے حد حسّاس اور غیور تھے سخت اثر لیا، خصوصاً رعایا اور ملازم ہونے کی دوہری غلامی نے تازیانہ کا کام کیا، خود نوشت سوانح میں فرماتے ہیں کہ۔ "انگریزی ملازمت کی ایک ایک گھڑی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔" ایک سچے مسلمان کی حیثیت میں طبیعت کی اشتعال انگیز اثر پذیری اور غمِ کائنات کی وسعت و ہمہ گیری، خصوصاً انگریز سے وحشت، اُس کے کفریہ اقتدار کے ساتھ غیر اختیاری تعاون تک سے ذہنی بغاوت، دل برداشتگی اور گریز آپ کے نظریاتی تغیّر اور عملی انقلاب کا بڑا اور بنیادی سبب تھا، اُنہی دنوں آپ کے بڑے بھائی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، اس ذاتی صدمہ نے قومی صدمات میں زبردست اضافہ کیا، طبیعت مذبذب ہو گئی اور ملازمت سے چھٹکارے کی تدابیر سوچنے لگ گئے۔!

۷ ● ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے جو تحریکِ خلافت کا دورِ عُروج تھا، بسلسلہ تحریک لدھیانہ میں ہی ایک قومی اجتماع منعقد ہوا حضرۃ امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ اور حضرۃ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریک اور اس جلسہ کے روح رواں تھے انہی کا خطاب تھا، سرکاری رپورٹر پولیس کے

مکمل عملہ کے ہمراہ۔ "کِرَامًا کَاتِبِیْنَ" ۔ کا فرض ادا کر رہے تھے، اِسی حلقہ میں ایک قوی ہیکل جوانِ رعنا، جس کی خاندانی شرافت و وجاہت اُس کے چہرہ سے عیاں تھی، زیادہ اِنہماک سے رپورٹ منضبط کر رہا تھا، حضرۃ امیرِ شریعت نے تلاوتِ قرآن کریم کے بعد واقعات و حقائق اور شعر و ظرافت کے امتزاج کے ساتھ فرنگی کی ازلی و ابدی اسلام دشمنی کی مفصّل تاریخ بیان فرمائی، ترکی سے خلافت کے خاتمہ اور سلطانِ ترکی کی معزولی، جنگِ عظیم ثانی میں ترکوں کی مظلومی و رسوائی، ارضِ ہند میں تحریکِ آزادئ وطن کے دوران میں فرنگی کے انسانیت سوز مظالم، ہندو اکثریت سے متوقّعہ خطرات اور مسلمانوں کی دوگونہ بے کسی و مجبوری کی داستان دہرائی تو مجمع مسحور ہو چکا تھا، فضا وجد کر رہی تھی تفتیش و تجسّس کی پگڈنڈیوں میں بل کھاتا ہوا قلم یکایک رُک گیا اور وہی نوجوان جو چند گھڑیاں پہلے۔ "طَوْعًا وَّ کَرْهًا" ۔ اِطاعتِ فرنگ کا لبادہ اوڑھے ہوئے سامراج کے باغی، اِمامِ خطابت اور وقت کے عظیم دینی رہنما کی بے باکانہ تقریر سرکاری مسل میں محفوظ کر رہا تھا، اُس پر حقیقت آشکارا ہو گئی، غیر ملکی اقتدار و تسلّط کے مظالم کی داستان دل کی کایا پلٹ کر گئی، نیم خفتہ جذبات بھڑک اُٹھے، قلم رُک گیا، آنکھیں آنسوؤں کی شبنمی جھالر بُننے لگیں، رپورٹر۔ "اَفْضَلْ حَقْ" ۔ اپنی جگہ سے ہل گئے، فطری استعداد اور نسلی خودداری نے سونے پر سہاگے کا کام دیا، جلسہ کے بعد جیسے کیسے ہیڈ کوارٹر واپس پہنچے، دل و دماغ میں اِنقلاب آ چکا تھا، مردِ قلندر کی برق آفرین نگاہ اپنا مخفی کام کر ہی چکی تھی، اُدھر حضرۃ امیرِ شریعت اپنی تقریر کی پاداش میں میانوالی جیل پہنچے اور اِس طرف چودھری صاحب نے اہلِ خاندان، اربابِ محکمہ اور دوسرے تمام فرضی خیرخواہوں کی ہر نصیحت کو بالائے طاق رکھ کر ملازمت سے استعفا دے دیا اور حضرۃ امیرِ شریعت کے دامنِ محبت و رفاقت میں پناہ لے لی ع

شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے !

اس پر بس نہیں کی شدّتِ تاثر اور فرطِ جذبات کے تحت چند روز بعد اپنے مستقر۔ تھانہ صدر کے قریب ہی اسی موضوع پر خود ایک کامیاب تقریر کر ڈالی، عوام و خواص اور خود حکومت والے

اِس رُوحانی انقلاب و تغیّر پر حیران تھے۔!

۸ —— ● آخر گھر واپس آ گئے، تعمیری سرگرمیاں شروع کر دیں، گڑھ شنکر اور مضافات میں از خود جلسہ کا اہتمام کر کے عوام کو اُن کے فرائض و حقوق اور تحریک کے اُصول سے آگاہ کرتے، غلامی کی آہنی گرفت مضبوط تھی، حضرت "سَیِّدْ اَحْمَدْ شَہِیْدْ" بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریکِ حکومتِ الٰہیہ، اُن کے جہاد و شہادۃ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے نتائج سے ڈرتے ہوئے مُسلمان معمولی اِصلاحی اور رفاہی اقدام سے بھی خائف تھے، آپ کے استعفاء کے بعد حکومت کی خاص نگرانی کے پیشِ نظر لوگ علانیہ تعاون سے گریزاں رہتے بلکہ عافیۃً کوشش مُخالفت و مُزاحمت کرتے، ہندو اور سکھ چونکہ کانگریس کی بدولت نسبتاً زیادہ ہوشیار و بیدار اور منظّم و بے باک ہو چکے تھے اس لیے زیادہ متوجہ ہوتے، حکومت نے گڑھ شنکر کو گہری نظر سے دیکھنا شروع کیا آپ کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر و رُسوخ اور قومی اعتماد کا جائزہ لینے کے لیے۔"کِمِشْنَرْ ھَرْکِشَنْ لَاْلْ کَوْلْ"۔ جو بعد میں ریاستہ کشمیر کا وزیر اعظم بنا تھا خود وہاں پہنچا، اُس نے گفتگو کے لیے بلایا آپ نے انکار کر دیا، اُس نے برادری میں سے ایک ذیل دار کو واسطہ بنا کر مُتاثّر کرنے کی تدبیر کی تو جواب دیا کہ "اُس کے پاس نہیں جاؤں گا البتہ تمہاری خاطر اپنے مکان پر ملاقات کرتا ہوں"۔ خلافِ توقع جواب پا کر کمشنر واپس چلا گیا، "تَحْرِیْکِ تَرْکِ مُوَالَاۃْ"۔ یا۔ "عَدَمِ تَعَاوُنْ"۔ جو بن پر تھی، اس ہنگامہ آرائی میں آپ نے دو[۲] سال تک بڑے جوش اور پامردی کے ساتھ حصہ لیا، سِول نافرمانی شروع ہو چکی تھی، خلافتی، کانگریسی رہنما اور کارکن دھڑا دھڑ جیلوں میں جا رہے تھے، آپ نے تقلیداً سخت مُخالفانہ تقاریر کیں، سابقہ انتہا پسندانہ رویّہ اور یہ سرگرمیاں سبب بنیں، آپ کو زیرِ دفعہ سترہ[۱۷]، الف، ب مقدّمہ بنا کر وارنٹ دکھائے بغیر پہلی[۱] مرتبہ گرفتار کر کے۔ "مَاْھِلْ پُوْرْ"۔ حوالات میں پہنچا دیا گیا، چند روز بعد سماعتِ مقدّمہ کی غرض سے مورخہ ۱۲ جمادی الاُخریٰ ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۹۲۲ء بروز جمعہ۔ "ھُوْشْیَاْرْ پُوْرْ جیْلْ" میں منتقل کر دیے گئے، ابتداءً سپیشل کلاس میں رکھا گیا، تحریری بیان کے لیے صرف دو[۲] روز کی قطعاً ناکافی مہلت دی گئی تھی، اِس لیے آپ نے ۱۸ جمادی الأخریٰ ۱۳۴۰ھ مطابق۔ ۱۶ فروری ۱۹۲۲ء کو یک شنبہ

(اتوار)۔ کو کچہری میں منشی تک اُنجا جا کوئی بیان نہ دیا، مختصراً سخت بحث کے بعد چھ[۶] ماہ کی سزا دی گئی، جیل میں بھی آرام سے نہ بیٹھے، بلکہ قیدیوں کے مُعاشرتی و اخلاقی مُعاملات اور سیاسی حقوق اور دوسرے کئی جائز مُطالبات کے لیے بھوک ہڑتال تک نوبت پہنچی، جسے تحمّل و وقار کے ساتھ نبھایا، حکّام نے تنگ آ کر آپ کو ایک سکھ ساتھی کے ہمراہ۔ "اَنْبَالَاْ جِیْلْ"۔ میں منتقل کر دیا، وہاں بھی یہی کچھ پیش آیا تو آپ کو قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا، قریباً تیرا چودہ[۱۳، ۱۴] گھنٹے پاؤں میں بیڑی اور ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر کڑیاں باندھی گئیں، دورانِ خون معطّل ہونے سے یہیں فالج کا حملہ ہوا، اسی جیل میں آپ کو گندی غذا کے ساتھ ساتھ سُرمہ کھلایا گیا، جس سے عمر بھر کے لیے گلے کی بندش کا موذی عارضہ لاحق ہوا، نیز کھانسی، دمہ اور دائمی قبض جیسے مہلک امراض کا بھی شکار ہو گئے! اس کے باوجود اپنے کام میں مصروف رہے کئی مُطالبات منظور کرا لیے، جیل میں اصلاحات کا آغاز ہوا، آپ کی مُبارک صُحبت سے بلبلیوں قیدی پاک باز بن گئے، جیل گھر کی طرح خوشگوار ہو گئی اور چھ[۶] ماہ کا عرصہ گذر گیا، رہائی کے بعد پھر سابقہ دینی، قومی اور سیاسی مشاغل کا آغاز ہوا، اسی دوران ہی اللہ تعالٰی نے ماحول اتنا سازگار فرما دیا کہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہو گئے، اور بارہ[۱۲] برس تک اہم قومی اور اسلامی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۳۴۵-۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں راولپنڈی کے سکھ مُسلم فسادات کے خطرناک نتائج سے فکرِ مستقبل کے طور پر سکھوں کی۔ "کِرْپَاْنْ"۔ کے مُقابلہ میں مُسلمانوں کے لیے۔ "کُلْھَاڑِیْ"۔ رکھنے کا بل پیش کیا اور بڑی صبر آزما جدّوجہد کے بعد اُسے منظور کرا کے دم لیا، یہ آپ کا اہم کارنامہ ہے جس کے لیے قوم ہمیشہ کے لیے آپ کی ممنون رہے گی۔!

۹ —— ● اِس کے بعد دو[۲] سال کا عرصہ سیاسی لحاظ سے بڑا طوفانی دور تھا، پنجاب کی۔ "کَمْیُوْنِسْٹْ دَھْشَتْ پَسَنْدْ پَاْرْٹِیْ"۔ نے تشدّد آمیز کارروائیاں شروع کر دیں۔ "سَاْئِمَنْ کَمِیْشَنْ"۔ جو اقوامِ ہند کی مُشترکہ مشکلات حل کرنے کے لیے مرتّب کیا گیا تھا جب اُس میں خود ہندوستانی نمائندوں کو ہی جگہ نہ دی گئی تو ہندو مسلمان دونوں مشتعل ہو گئے، اسی گڑبڑ میں لالہ۔ "لَاْجْپَتْ رَاْئِےْ" ایک انگریز افسر کی لاٹھی سے سخت مضروب ہو کر جان دے بیٹھے، یہ واقعہ ایک مستقل ہیجان کا ذریعہ بنا، تھوڑے وقفہ سے دہشت پسندوں نے انتقام میں بم مار کر ایک دوسرے انگریز افسر۔ "سَاْنْڈَرْسْ"۔ کے پرخچے

اُڑا دیے، سرکاری تجسّس و تفتیش کے ذریعہ تمام کارروائیوں کا راز کھل گیا۔ "بھگت سنگھ"، "دت" اور "یونس" جیسے سرغنہ انقلابی پکڑے گئے اور ہزار جتن کے باوجود بھی رہائی نہ ملی، پھانسی پر لٹکائے گئے اور اُن کی لاشیں جنگل میں جلا کر دریائے "ستلج" میں بہادی گئیں، عوامی جذبات سرد ہو گئے، پھر کچھ مدّت بعد بدنامِ زمانہ "نہرو رپورٹ" سکھوں کی ضد، بے اعتباری و خیانت اور ہندوؤں کی معروف متعصّب اور فریب آمیز سیاست گریز و فرار اور مسلمانوں کے حقوق کے نقصان کے خطرے نے ہما ہمی پیدا کی، علی برادران اور چند دوسرے مسلم رہنما کانگریس سے الگ ہو گئے۔ "مسلم کانفرنس" کی بنیاد رکھ دی گئی، بقیہ اکابر جو بعد میں بانی احرار ہوئے اُن کی اکثریت ابھی تک خلافت اور کانگریس سے وابستہ تھی، ۱۳۴۷-۴۸ھ ۱۹۲۹ء کا یہ سال بڑا عجیب اور ہنگامہ خیز زمانہ تھا، خلافت اور کانگریس کی مشترکہ جد و جہد سے آئینی انقلاب کے واضح آثار پیدا ہونے لگے تو لارڈ "اِرون" وائسرائے ہند نے "گاندھی جی" کو صلح کی پیش کش کر دی، گفتگو ناکام ہو گئی، تا آنکہ لاہور میں کانگریس کا مشہور آل انڈیا اجلاس منعقد ہوا جس میں "قانون نمک سازی" کی خلاف ورزی کرتے ہوئے "عام نافرمانی" اور "حصولِ کامل آزادی" کی قرار داد منظور کر لی گئی، آزاد خیال مسلم رہنما اس وقت دو دھڑوں میں تقسیم تھے، یعنی "خلافت" اور "مسلم لیگ" "مسلم کانفرنس" اور "خلافت" اور "کانگریس" علی برادران صرف اپنی منوانا چاہتے تھے، انہوں نے خلافت کے پنجابی رہنماؤں میں سے حضرۃ امیر شریعۃ، محترم شیخ "حسام الدین" مولانا "داؤد غزنوی" رحمۃ اللہ علیہم، جناب مولوی "مظہر علی اظہر" اور مرحوم چودھری صاحب کو مطلقاً "باغی گروپ" قرار دے دیا گیا اور مولانا "عبد القادر" قصوری اور جناب مولوی "ظفر علی خان" مرحومین پر محض گروہ بندی اور جاہ و اقتدار پسندی کا جرم عائد کیا گیا، چودھری صاحب مرحوم اپنے دوسرے رفقا سمیت خلافت سے الگ ہو گئے، اسی موقع پر یہ سب معتوب رہنما ایک جگہ، غالباً دفتر خلافت بیرون دہلی دروازہ لاہور جہاں تقسیم ملک کے کچھ عرصہ تک اخبار "احسان" کا دفتر قائم تھا جمع ہوئے اور حضرۃ مولانا "ابو الکلام آزاد" رحمۃ اللہ علیہ کے خاص ایما و مشورہ اور زبردست خواہش اور تجویز کے مطابق "مجلسِ احرارِ اسلام" کے نام پر ایک مستقل انقلاب و آزادی پسند

خالص اسلامی جماعۃ کے قیام کا فیصلہ ہوا، بانی حضرات میں اصولاً صرف یہ بزرگ شامل تھے۔ "سید الاحرار" حضرۃ[1] امیر شریعۃ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حضرۃ مولانا حبیب[2] الرحمن لودھیانوی، محترم شیخ حسام[3] الدین مفکرِ احرار جناب امیر فضل[4] حق رحمۃ اللہ علیہم، جناب غازی عبد الرحمن[5] امرت سری، جناب مولوی مظہر[6] علی اظہر۔ مولوی ظفر علی خان صاحب مرحوم علی برادران کے ذریعہ مطعون ہو کر بھی احرار کے بانی بزرگوں کے گروہ سے متفق نہ ہوئے، فطری "تلوّن"، مصیبت خیز اختلاف پسندی، کسی سے بھی نباہ نہ کر سکنے، زبردستی آگے نکلنے اور مستقل لیڈری کی زمین ہموار کرنے کی خوگر سیمابی طبیعۃ" اور خطرناک منتقم مزاجی اُن کا عُرف و شعار تھا، چنانچہ انہی اثرات کے مطابق اپنی الگ ٹولی بنانے کے لیے اندرونی پُخت و پَز کی، اکابرِ احرار کے بے مقصد دیرینہ حریف جناب ڈاکٹر محمد عالم گجراتی مرحوم اور انگریز کے چند سرکاری درباری لوگوں کو ساتھ ملایا، اور جس دن لاہور میں مجلسِ احرار اسلام کی باقاعدہ تشکیل ہو رہی تھی۔ "بالمقابلے زمیندار" مرحوم عین اُسی روز لاہور ہی میں ڈاکٹر محمد عالم مرحوم کے مکان پر احرار کے بالکل متوازی، ایک نئی فرضی جماعۃ بنام "مسلم نیشنلسٹ پارٹی" کی تشکیل میں مصروف تھے۔ اُدھر نمکین ستیاگرہ شروع ہو چکی تھی۔ مولانا "آزاد" رحمۃ اللہ علیہ اپنی جگہ مرحوم چودھری صاحب کو بلا مشورہ اپنا قائم مقام نامزد کر گئے، آپ کی صحۃ خراب تھی، جیل جانے کا ارادہ نہ تھا، تاہم مرکزی کانگرس ورکنگ کمیٹی کے خلاف قانون اجلاس منعقدہ "دہلی" میں شرکت کی تو محترم ڈاکٹر "مختار احمد انصاری" مرحوم، پریذیڈنٹ "وٹھل بھائی پٹیل" پنڈت "مدن موہن مالویا" اور دوسرے اراکین کے ہمراہ گرفتار ہو کر قریباً ۹ ماہ کے لیے سزایاب ہو گئے، یہ دوسری قید محرم ۱۳۴۹ھ مطابق مئی ۱۹۳۰ء میں ہوئی، چند روز تک آپ کو دوسرے ساتھیوں سمیت "دہلی جیل" میں رکھا گیا، پھر ڈاکٹر انصاری مرحوم، لالہ دُنی چند اور سکھ لیڈر منگل سنگھ "گجرات جیل" میں بھیج دیئے گئے، چونکہ پہلی گرفتاری کے وقت آپ کے احتجاجی طرزِ عمل سے حکومتِ پنجاب پہلے ہی باخبر اور چوکنّی تھی، اس لیے آپ کو پنجاب کی کسی بھی جیل میں رکھنے سے انکار کر دیا، چنانچہ تھوڑے وقفہ سے پھر تقسیم کی گئی، پنڈت مالویا کو "بنارس" پریذیڈنٹ پٹیل کو "انبالہ" اور آپ کو "گورکھپور جیل" میں منتقل کر دیا گیا، اسی جیل میں آپ نے خالص اسلامی ادب کا نمونہ اور انشاء عالی شہکار، اپنی مشہور و مقبول اور بے نظیر

کتاب "زندگی" تصنیف فرمائی۔

۱۰ ـــــ ● کچھ مدّت بعد حکومت اور کانگریس میں مصالحت ہوگئی جس کا نام "گاندھی اِرون پیکٹ" مشہور ہوا، اِس معاہدہ کے تحت ۲۵ شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء بروز پنج شنبہ تمام سیاسی قیدی رہا کردیئے گئے، آل انڈیا کانگریس کے اجلاسِ کراچی کی طیّاری شروع ہوگئی، اِس کی نئی ورکنگ کمیٹی کا انتخاب ہونا تھا، پنجاب کانگریس کی نمائندگی کے لیے مرکز میں کوئی معروف و مقبول اور وزنی شخصیّت موجود نہ تھی، غالباً مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم نے تعلّقات کی بنا پر مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کو آمادہ کیا اور دونوں نے مل کر گاندھی جی کو ڈاکٹر محمد عالم مرحوم کی نام زدگی کا مشورہ دیا، پنجابی خلافتی گروہ کے نمائندگان اور کئی دوسرے مسلم رہنما ڈاکٹر مرحوم کے سیاسی کردار اور عدمِ صلاحیّت کے پیشِ نظر اس تجویز کے سخت خلاف تھے، نتیجۃً جب گاندھی جی نے اجلاس میں ڈاکٹر عالم کی نام زدگی کا اعلان کیا تو سارا پنڈال مخالفانہ آوازوں اور احتجاجی نعروں سے گونج اُٹھا، لیکن گاندھی جی کے شخصی اور جماعتی وقار نے کسی کی نہ چلنے دی۔ مرحوم چودھری صاحب نے اس موقع پر ہمّت کرکے ذرہ انداز بدل کر یہ فرمایا کہ "ڈاکٹر کی جگہ مولانا عبدالقادر قصوری ہی کو نام زد کردیا جاتا تو بہتر تھا"۔ اس سے ڈاکٹر مرحوم سخت ناراض ہوگئے، اس تمام احتجاجی مظاہرہ کی ترتیب و انگیخت کا کلّی ذمہ دار چودھری صاحب کو قرار دے دیا۔ نتیجۃً "آپ" کے تمام خلافتی رفقا بھی اس غصّہ و عتاب کی زد میں آگئے، حتّٰی کہ آں جہانی پنڈت "جواہر لال نہرو" نے بھی سخت بُرا منایا اور بعد میں ایک غلط تاثّر کے تحت اپنی سوانح کی کتاب میں یہاں تک لکھ مارا کہ "بعض ممبروں کو اس انتخاب پر اعتراض تھا کہ اُن کے حلقے میں سے کسی کو بھی کانگریس کی مرکزی ورکنگ کمیٹی میں نشستیں نہیں دی گئیں، اس لیے یہ لوگ کانگریس ہی کے خلاف ہوگئے اور انہوں نے مجلس احرار کے نام سے ایک الگ اور مستقل اسلامی انجمن بنا ڈالی"، حال آنکہ حقیقۃً اس کے بالکل خلاف تھی، اس واقعہ اور جھوٹے الزام نے پنجابی زعما اور کانگریس کے درمیان بُعد اور کشیدگی میں اضافہ کردیا، کیوں کہ نہرو رپورٹ میں یہی بزرگ کانگریس کی تائید کرکے مسلم عوام کے ہیجان و تنفّر اور ہندو سکھ کے شک آمیز گریز و فرار اور اختلافی مظاہرہ سے کافی زک اُٹھا چکے تھے، لیکن جب کانگریس نے ۱۹۲۹ء کے اجلاس لاہور میں اُس کی تائید کے باوجود اس رپورٹ کو خود

ہی مسترد کردیا" اور اس کے بعد بھی ڈاکٹر انصاری مرحوم نے۔ ہندو، سکھ کے انحاد سے سیاسی پلیٹ فارم کی مضبوطی کے لیے سکّھوں کو تناسُبِ آبادی سے زائد حقوق دینے اور انتخابات میں بے جا مراعات تک سوچنے کے نظریّہ سے قدم پیچھے نہ ہٹائے۔ تو اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر اکابرِ پنجاب خلافت اور کانگریس کا اشتراکِ عمل مشکل ہوگیا، چنانچہ بالآخر یہ پورا گروہ کانگریس سے مستعفی ہوگیا" مرحوم چودھری صاحب بھی اس میں شامل تھے، آپ نے مرکزی کانگریس کے نام اپنے استعفا میں پوری تاریخی اور سیاسی کیفیّت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر انصاری مرحوم کو لکھ بھیجا کہ "پنجاب کے سودے میں تو رتّی کی گنجائش نہیں آپ دھڑیاں تول رہے ہیں؟ جب مُسلم قوم نے نہرو رپورٹ کو نہ مانا تو مزید حقوق دینے پر اُس کو کیسے آمادہ کرسکیں گے؟ اس لیے میں پنجاب کی سیاسی گتّھی سُلجھانے میں اور گنجائش نہ پاکر "مُستعفی" ہوتا ہوں۔"!

۱۱ ـــــ ● احرار کی ذہنی نقشہ کشی اور قانونی تشکیل تو ۲۷ رجب ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء بروز یک شنبہ (اتوار) ہی کو ہوچکی تھی، اسی اجلاس میں حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے زیرِ صدارت جداگانہ حقوق و انتخابات اور جداگانہ تنظیم کے عنوان سے عوام کو تعاوُن کی دعوت دی، صرف اس نئے نام اور پلیٹ فارم سے عملاً مصروفِ کار ہونے کا مرحلہ باقی تھا، مرحوم چودھری صاحب سمیت خلافتی اکابر کے کانگریس سے استعفا کے بعد یہ مشکل بھی قدرۃً آسان ہوگئی، چنانچہ تشکیلِ جماعت سے پونے دو سال بعد ۲۴ صفر ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۹۳۱ء بروز شنبہ (ہفتہ) حبیبیہ ہال لاہور میں اس نئی فعّال و مخلص اور انقلابی اسلامی جماعت کا پہلا اہم اجتماع عام منعقد ہوا، جس میں کانگریس اور لیگ سے بنیادی اختلافات کی نشان دہی اور اغراض و مقاصد کی تشریح کرکے قوم کو نیا لائحہ عمل دیا گیا، مرحوم چودھری صاحب کو جماعت میں شروع سے ہی مرکزی حیثیّت حاصل ہوگئی، تھوڑے وقفہ سے جماعت کو اپنی سب سے پہلی اور سب سے بڑی عوامی جدّ و جُہد "تحریکِ کشمیر" میں مصروف ہونا پڑا، تقریباً چھ مہینوں میں پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) رضاکار گرفتار ہوئے، سب اکابر جیلوں میں بند ہوگئے، اِتّفاقاً چودھری صاحب مرحوم اپنی علالت اور بہ ظاہر عملی سرگرمیوں سے فارغ ہونے کے سبب بچے ہوئے تھے، لیکن عوام اور جماعت کے متعلّقین پر مرزائیوں، ٹوڈیوں اور دُوسرے دشمنوں کے پروپیگنڈے کا بُرا اثر پڑنے لگا تو آپ نے

باوجود بیمار و کمزور ہونے کے کام شروع کر دیا، حکومۃ نے چند گھنٹے کی مہلت دے کر پہلے تو لاہور سے نکال کر آپ کو اپنے وطن گڑھ شنکر ضلع ہوشیارپور میں نظر بند کیا، مگر آپ نے وہاں بھی تبلیغ و تقاریر کے ذریعہ تحریک کا کام شروع کر دیا تو تیسری[۳] دفعہ گرفتار کر کے رفتار کے پاس "مُلْتَانْ نِیُوْ سَنْٹرَلْ جَیْلْ" میں ایک[۱] سال کے لیے قید کر دیئے گئے، شروع سے ادیبانہ طبع و مزاج رکھتے تھے، حضرۃ امیر شریعۃ رحمۃ اللہ علیہ اور اپنے اکثر دوسرے بے تکلف احباب کا مجمع ملا تو جیل میں محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا اس لیے ذہن پر قدرۃ زور دے کر شعر گوئی شروع کی، لیکن رہائی کے بعد یہ مشغلہ ختم ہو گیا اس دور کی یادگار، چند منظومات و غزلیات اور متفرق اشعار موجود ہیں۔ ۱۳۵۳ھ ۔ ۱۹۳۴ء میں مرزائیت کے منظم تعاقب سرکوبی کے لیے خاص ۔ "قَادْیَانْ"۔ میں جماعۃ کا شعبۂ تبلیغ قائم کر کے دفتر، مسجد، مدرسہ وغیرہ کا افتتاح کیا گیا، اس وقیع تجویز میں آپ کا اُصولی مشورہ شریک تھا، درمیان میں ۔ "تَحْرِیْکْ مَسْجِدِ شَہِیْدْ گَنْجْ"۔ کا دل دہلا دینے والا خونریز و دردناک قضیہ شروع ہو گیا، غلط کار لیڈروں، سرکار پرستوں اور مرزائیوں کے اشتراک سے اس کے لیے چلائی گئی تحریک سے جماعۃ الگ رہی، فرنگی اقتدار اور اُن عناصر کی مشترکہ سازش، زہرناک اور تباہ کن سیاسی پروپیگنڈے نے جذباتی قوم کو پاگل کر دیا، دشمن کی چال بڑی حد تک کامیاب ہوئی، جماعۃ زبردست اشتعال و مخالفۃ کی زد میں آگئی، اُس کے عوامی رسوخ و وقار کو سخت دھکا لگا، اور دو[۲] سال بعد اواخرِ و اوائل ۱۳۵۵/۵۶ھ ۔ مطابق ۔ آغاز ۱۹۳۷ء میں منعقد ہونے والے ملکی انتخاب کے موقع پر کام کرنا اور الیکشن لڑنا مشکل ہو گیا، تاہم زخمی ہو کر بھی جماعۃ نے بارہ[۱۲] نشستیں جیت لیں، تیرھویں[۱۳] سیٹ چودھری صاحب مرحوم کی تھی آپ کی مرکزی شخصیۃ و اہمیۃ نیز سابقہ مفید اور روشن کارناموں سے حکومۃ اور مذکورہ عناصر خار کھائے بیٹھے تھے، انہوں نے یہاں تک کمینگی کی کہ پنجاب کے مختلف شہروں سے لولے، لنگڑے اور مختلف حادثات میں مجروح شدہ اپاہجوں کو زبردستی جمع کیا، ٹرکوں میں بھر بھر کر آپ کے حلقہ میں پہنچائے اور معذوروں کو پٹی پڑھا کر اُن کی زبان سے یہ شیطانی پروپیگنڈا کرایا کہ "چودھری اور اُس کی جماعۃ احرار نے شہید گنج گروا کر ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں سے ہم لوگوں کو تباہ کر دیا ہے۔ اب یہ شخص پھر الیکشن لڑ کر اسمبلی میں جانا چاہتا ہے اس سے بچو اور اِس کو گراؤ۔" نتیجہ یہ نکلا کہ جاہل اور بے خبر عوام برافروختہ ہو گئے، علاقہ بھر میں آگ لگ گئی اور آپ اپنی برادری، پرانے

قومی رسوخ اور مقبولیۃ کے باوجود پڑنے چودہ[۱۴] برس بعد صرف اٹھانوے[۹۸] ووٹوں سے ہرا دیئے گئے، اس خطرناک مہم کے بعد بھی قومی خدمۃ میں مصروف رہے، اس زمانہ میں ۔ "جَوَاہِرَاتْ"۔ "شُعُوْرْ"۔ نامی مختصر اخلاقی افسانوں کے مجموعات لکھے اور اِسلامی سیاسۃ کا تاریخی کردار واضح کر کے ملکی آزادی میں ادیبانہ رہنمائی کے طور پر ۔ "آزَادِیْ ہِنْدْ"۔ جیسی زبردست مؤثر و معنیٰ خیز اور انقلاب انگیز کتاب تصنیف فرمائی، کچھ عرصہ بعد، ۱۰ رجب ۱۳۵۷ھ ۔ مطابق ۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء بروز دوشنبہ (پیر)۔ "بَرْطَانِیَہْ"۔ نے ۔ "جَرْمَنِیْ"۔ کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے دُنیا کی دوسری بڑی جنگ کا آغاز کر دیا، انقلاب پسند اِسلامی جماعۃ کی حیثیۃ سے مجلسِ احرار اسلام کے لیے۔ انگریز کو موت و حیات کی اس کشمکش میں بیش از بیش نقصان پہنچا کر آزادی کی منزل قریب لانے کا بہترین موقع ہاتھ آیا، چنانچہ حسبِ روایات ۔ "فَوْجِیْ بَھَرْتِیْ بَائِیْکَاٹْ"۔ نام سے زبردست مخالف تحریک شروع کر دی گئی، کانگرس مصالحۃ و معاہدہ کے چکر کے ذریعہ صوبجات سے یک دم مرکز پر تنہا قبضہ کا منصوبہ بنائے بیٹھی تھی، اور لیگ اپنا مستقبل پُرامن و عیش رکھنے کے لیے نہ کانگریس کی ہم نوا ہوئی نہ اُس نے انگریز کی مکمل تائید کا کھل کر اعلان کیا، بلکہ تاجرانہ ذہنیۃ، ریاکارانہ عافیۃ کوشی، سب سے الگ تھلگ، تکبر آمیز اور گول مول پالیسی کے ذریعہ سب کو دھوکے میں رکھنے کی چال چلتی رہی، پھر بھی اُس کے اکثر بیانات اور تقاریر علانیۃ انگریز کے حق میں گئیں، آزادی خواہ انقلاب پسندوں کو اِن دونوں بڑی جماعتوں کی غلط پالیسی سے سخت نقصان پہنچا، احرار سمیت دوسرے تمام قوم پرور عناصر اور اُن کے درمیان اختلاف و بُعد کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی، آنجہانی ۔ "بَابُوْ سُبْھَاشْ چَنْدَرْ بُوْسْ"۔ کی جماعۃ ۔ "فَارْوَرْڈْ بَلَاکْ"۔ ملک بھر میں واحد تنظیم تھی جس نے احرار کے اِس فکر و عمل کی کھل کر تعریف و حمایۃ کی، فرنگی کی عیاری و جفاکاری کا نشانہ بننے کے لیے تحریکی محاذ پر احرار کو تنہا چھوڑ دیا گیا تھا، تاہم سرفروشوں کی یہ جماعۃ احساسِ فرض اور ادائے فرض کے جذبہ سے بخوشی قبول کر کے ہر کڑی سزا جھیلی گئی، حسبِ دستور کارکنوں کے ساتھ اکابر کو بھی دعوۃِ دار و رسن قبول کرنی پڑی، جناب شیخ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی مظہر علی اظہر سمیت مرحوم چودھری صاحب بھی چوتھی[۴] دفعہ گرفتار ہو کر ڈیڑھ ۱½ سال کے لیے

"ڈسٹرکٹ جیل" میں پہنچا دیئے گئے، آپ پہلے ہی دائمی مریض چلے آتے تھے، یہاں آکر صحت کا ڈھانچا
اور بھی ہل گیا، تاہم آپ نے دینی اور علمی و ادبی معمولات جاری رکھے، اسی جیل میں سیرۃ النبی علیہ السلام
کے متعلق آپ نے اپنی محبوب ترین کتاب۔ "محبوبِ خدا" کا تتمہ لکھ کر اُسے مکمل کیا، جو بعض جزئی
خیالات و تعبیرات کے سوا اپنے موضوع پر بہترین کتاب شمار کی گئی ہے، ساتھ ہی اپنے بچوں
کے نام لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ مرتب کیا جو آپ کی وفات کے بعد۔ "خطوطِ افضل حق"۔ کے نام
سے شائع ہوا، تحریری آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آغازِ جنگ اور قید سے پہلے ہنگامی
دور ہیں ہی۔ "تاریخ احرار"۔ کا مواد فراہم کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن پوری کتاب نہ لکھ سکے
تھے کہ جنگ کی قیامت ٹوٹ پڑی، کچھ طبیعت کا میلان اور بعض دوسری مذکورہ تصانیف کی تکمیل کا عزم
حائل ہو گیا، اس لیے فرضِ تکمیل کی طرف بعد میں متوجہ ہوئے، مسلسل علالت سے سخت نحیف اور
مغموم و مایوس ہو رہے تھے، رہائی کے بعد بحالی صحت کے لیے کچھ عرصہ۔ "کراچی"۔ وغیرہ میں بھی
گزارا، لیکن ضعف و انحطاط نہ رکا، بیماری کا آخری حملہ کارگر ہو گیا، لیکن اس حالت میں بھی اپنے
زر و جواہر سے قیمتی افکار قلم بند کرنے میں مصروف رہے، اسی دوران میں۔ "مسئلۂ ملکیتِ مال و جاگیر"۔
پر امرتسر کے مشہور عالم، استاد زادہ امیرِ شریعت مولانا۔ "ابو الضیاء محمد بہاء الحق قاسمی"۔
زید مجدہ کے ساتھ ایک تحریری بحث شروع ہو گئی، سخت علمی معرکہ برپا ہوا، بالآخر جانبین کو مائل
بہ اعتدال کر کے حضرۃ امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قلمی مناظرہ ختم کرا دیا، اسی مضمون کے بعض
حصص سے مفاد پرستانہ استدلال کر کے کمیونسٹوں، سوشلسٹوں اور کئی ناقص دینی معلومات اور ناپختہ
ذہن رکھنے والے جدت پسندوں نے آپ کو زبردستی ہی اپنا مؤید و حامی مشہور کرنا شروع کیا، اس
سے دینی عناصر میں بدگمانیاں پیدا ہوئیں، خصوصاً ایسے موقع کی تاک میں رہنے والی نئی خود غرض
حریف تنظیم۔ "جماعۃ اسلامی"۔ نے جو انہی دنوں تازہ تازہ ولادت پذیر ہوئی تھی حسبِ مزاج
و معمول برسوں تک مرحوم مفکرِ احرار اور جماعۃ احرار کے عقائد و مسلک کے متعلق زبانی اور تحریری
طور پر نہایت غلط اور مکروہ پروپیگنڈا ——— جاری رکھا اور جو بہ تغیّرِ عنوان اب بھی کسی نہ کسی

طرح جاری ہے، لیکن اکابر اور جماعۃ کی کتاب و سنۃ اور اجماعِ اُمۃ کے مطابق بے پناہ تقریری مہم
اور مسلسل و ناقابلِ تردید عملی صفات نے اس نفس پرستانہ مخالفۃ کا منہ توڑ کر رکھ دیا۔ آپ کی یہ
علمی تحریر۔ "اسلام میں اُمراء کا وجود نہیں"۔ کے عنوان سے شائع ہو کر کارکنانِ جماعۃ،
علمائے کرام اور دوسرے اسلام پسند اہلِ فکر و نظر کو دعوۃِ غور کا باعث بن گئی۔

۱۲ ——● مجلس کی دعوۃ و تحریک اور اس کے مختلف ادوارِ زندگی کی سن وار تاریخ و رُوداد کے ضمن میں وہ
اپنے جماعتی منصب اور حیثیۃ کے پیشِ نظر بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے، شروع میں مختلف تحریکات
کے ہنگاموں نے سانس نہ لینے دیا اور جب کچھ فرصت میسر آنے لگی، تو مذکورہ موانع پیش آ گئے،
"امیرجیشی جنگی قوانین" اور "سنسر وغیرہ کی آفۃ" سر پر مسلط تھی، برصغیر پر۔ "سراج الدولہ"۔ اور۔ "ٹیپو شہید"
رحمۃ اللہ علیہما سے لے کر شہدائے کشمیر و شہید گنج تک تمام مظلومینِ حق اور کشتگانِ لیلائے آزادی افراد و
تحریکات کے دوش بدوش انگریزی دسیسہ کاریوں اور ستم رانیوں کے لرزہ خیز واقعات قلم بند کرنے کا
پختہ عزم تھا، لیکن قانونِ کفر و جبر حائل ہونے کے سبب سے ہزاروں اوراق پر مشتمل ہونے والا دفترِ
ایثار و قربانی۔ "تاریخ احرار"۔ کے چند سو صفحات میں سمٹ کر رہ گیا، پھر یہ مختصر روداد بھی تو
برداشت نہیں ہوئی، مسلمان نما کفر پرور، زلہ خوارانِ افرنگ، لیگی اور غیر لیگی پشتینی کاسہ لیسوں اور
غداروں اور دشمنِ اسلام و قوم تجارۃ پیشہ سیاسی ٹولیوں کے خفیہ راز طشت از بام ہوتے دیکھ کر پنجاب
گورنمنٹ نے تاریخ احرار کے مسودہ پر سنسر اور عدمِ اشاعۃ کے قانون کا چھرا چلا دیا، نتیجۃً ؎

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خلقِ خدا کے خوف سے ناگفتہ رہ گئے

بہرکیف اس نام سے جو کچھ بھی معزز رہنما نے جمع اور شائع کیا۔ مجبوری کا نام صبر کے مصداق
ہزار غنیمۃ سمجھا گیا، تمام اکابر اور لاکھوں خدّامِ احرار نے اس پرخلوص کوشش کو اپنی حسین آرزوؤں اور
معصوم اُمیدوں کی نقشہ کشی کی طرف ایک مثبت و مفید اور نتیجہ خیز تعمیری اقدام شمار کیا، اتحادیوں
کے حق میں جنگ کا پانسا پلٹ جانے کے بعد تکمیلِ مقصد کی غرض سے چودھری صاحب مرحوم نے

دوسرا قدم اٹھایا اور "پاکستان اور اچھوت" کے نام سے انگریزی میں ایک بڑا پُر مغز سیاسی مقالہ
مُرتّب کیا، جو آپ کی وفات کے کچھ مدّت بعد "اِکرامِ قمر" صاحب کے اُردو ترجمہ کے ساتھ
کتابی صورت میں شائع ہوگیا، اسی دوران میں اسلامی عقائد و احکام کی حکمت کے موضوع پر آپ نے
"دینِ اسلام" کے نام سے بڑی پُر مغز اور معرفت آمیز کتاب لکھنا شروع کی اور موت کی گھڑیوں
تک اُسی کی تحریر میں مشغول رہے، حتّٰی کہ وفات کے بعد آپ کے سرہانے سے اُسی کا مکمل شدہ
مُسوّدہ اٹھایا گیا تھا، جسے بفضلہ تعالیٰ اُن کے ایمان پر و رحُسنِ خاتمہ کے لیے عنوان و دلیل شمار کیا گیا
ہے، اِس کے بعد کچھ اور مقالات کتابچوں کی شکل میں یکے بعد دیگرے چھپ رہے تھے۔ "احرار اور
پاکستان" کے موضوع پر بڑی مُناسب و مُدلّل اور مُسکت و اطمینان بخش تشریح کے ساتھ علمی گفتگو
جاری تھی لیکن صحت کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا نہ مل سکا، اور طویل علالت کے بعد آپ کے اور ہمارے
درمیان موت کی اٹل دیوار حائل ہوگئی۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔"

۳— مُفکرِ احرار رحمۃ اللہ علیہ گوناگوں امتیازات و خصائص کی حامل شخصیت کے مالک تھے، فطرۃً فہمِ سلیم
اور قلبِ مُستقیم لے کر آئے تھے، طبیعت علم و تجسّس کی خُوگر، ذوق۔ ادب اور اِنشاء کے سانچے میں
ڈھلا ہوا، مزاج۔ خالص اسلامی اور روحانی اقدار سے رنگین و مُنوّر، کفر و اسلام کی کشمکش کو تاریخ و
سیرۃ کے آئینہ میں دیکھا بھالا، بقدرِ وُسعت و استعداد۔ اُردو، فارسی، انگریزی اور جُزوی طور پر
عربی میں اسلامی اُصول و احکام سے تعارف حاصل کیا، اپنے پیش رَو اکابر کے علمی، فقہی، سیاسی
اور جماعتی مسلک و مؤقف سے پوری طرح متفق ہوکر آزادیٔ وطن اور غلبۂ اسلام کی جدّ و جہد میں
رضاکارانہ شرکت کرلی، اطاعت، خدمت، غازیانہ عزم اور مجاہدانہ ایثار و قربانی کے بے مثال جذبے کے
ساتھ عظیم کارنامے سرانجام دیئے، اپنی خداداد قابلیت و بصیرت کے زیرِ اثر چند دنوں میں ہی جماعت کے مُفکر اور
سیاسی و انقلابی دماغ کی حیثیت سے اُفقِ شہرت و مقبولیت پر جلوہ فگن ہوگئے، پھر زمانہ نے ہر ملکی و قومی مدّ و جزر
کے وقت اُن کی ذہانت و فراست کی عجوبہ کاریاں اور اُن کے حلم و تدبّر کے حیرت انگیز مظاہرات دیکھے، آخر عمر
میں علمی و تاریخی ذوق و شعور اتنا نکھر گیا اور اسلامی معلومات اتنی وسیع تھیں کہ بلند پایہ اہلِ علم کے ساتھ اہم دینی

موضوعات پر زبان و قلم کے ذریعہ ناقدانہ مُبادلۂ افکار کرسکتے تھے، انتہائی سُتھرے اور نکھرے ہوئے پاکیزہ اخلاق
کا پیکرِ متحرک، صوم و صلوٰۃ کے پابند اور فلسفۂ دین و روحانیت سے عارفانہ لگاؤ رکھنے والے تھے، اگر سیاسی جھمیلوں
سے کچھ مدّت تک کے لیے الگ ہوکر کسی شیخِ وقت سے باقاعدہ استفادہ کیا ہوتا تو بجائے خود ایک مرشدانہ
خانقاہی زندگی کے حامل ہوتے، لیکن اصل یہ ہے کہ حکیمِ مطلق نے ازل میں جس شخص کو جس کام کے لیے منتخب
فرمادیا ہے وہ دُنیا میں فطرۃً اور عملاً اُسی وظیفۂ حیات کی تکمیل اور فرضِ بندگی کی ادائیگی میں ہی لازماً مشغول رہ کر
مشیّت ایزدی کا مظہر بنا رہتا ہے، اور بعینہٖ یہی حال مرحوم چودھری صاحب کا تھا، کہ گھر کا آرام، جاگیر و
جائداد کی بافراغت زندگی، مزید براں انگریزی دور میں سرکاری ملازمت، خصوصاً پولیس سے وابستگی کا شاہانہ
طمطراق اور خود مختارانہ دبدبہ، یہ سب لوازمِ عیش و راحت تیاگ کر، عمر بھر کے لیے تحفّظِ ختمِ نبوّۃ کے درویشان
خدامست کے سلسلۂ عالیہ میں بیعت کی، خانقاہِ تحفّظِ ناموسِ اصحاب و ازواجِ رسول کے متوالے قلندروں کے
ہم پہلو اخلاص و ایثار کے زاویہ میں معتکف ہوکر سلوکِ عشق کی منازل طے کرڈالیں، حاصل یہ ہے کہ اُن کی
زندگی ارشادِ رسول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام۔ "خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ"۔ بہترین انسان وہ ہے جو
انسانوں کے کام آئے) کی روح کا پرتو تھی، انگریز دشمنی، آزادی کی تڑپ، قومی برتری کی آرزو، قدیم و
خالص اور موروثی اسلام کے احیاء، عُروج اور غلبہ و نفاذ کی حسرت و تمنّا، اقتصادی اعتدال اور معاشی
مُساوات کا عملی جذبہ، مُلوکیت و جبّاریت اور دولت پرستی کے خاتمہ اور عوام و غرباء کی خوش حالی و فارغ البالی
کی اُمنگ، دین کی بھرپور تبلیغ کے لیے مجاہدہ اور عملِ پیہم، بڑوں اور چھوٹوں سے حسبِ درجات احترام و
تعظیم اور محبّت و شفقت کا سلوک، اقارب و احباب اور اغیار کے ساتھ حُسنِ معاشرت، خدمتِ خلق، جماعتی
قومی اور دینی اُمور میں سرگرمی، چستی و چابک دستی، محنت و جاں فشانی، خلوص و ایثار، حمیّت و غیرت، حلم و
تدبّر اور صبر و استقامت کا ہر ممکن عملی مظاہرہ اور اُس کی دعوت، خصوصاً نوجوانوں میں رضاکارانہ جذبۂ
اطاعت و خدمت، جوشِ جہاد اور جماعتی تنظیم سے وفادارانہ وابستگی کا داعیہ اُبھارتے رہنا اُن کی زندگی
کا مقصدِ عظیم (مشن) تھا، جس کے لیے وہ صحت و علالت، فقر و غِنا اور قید و آزادی ہر حالت میں
عاشقانہ جنون کے ساتھ سرگرمِ عمل رہے اور بالآخر اسی روش پر گامزن رہتے ہوئے اپنے مولائے حق

سے جا ملے" اور خلوص و وفا کی حد یہ ہے، کہ جس جماعت کے دفتر میں اداءِ فرض کے لیے داخل ہوتے وقت اُن کی سواری آ کے رُکی تھی، جیتے جی اُسے نہ چھوڑا بلکہ اُسی دفترِ احرار سے اُن کا جنازہ اُٹھایا گیا!

آپ نے مورخہ ۱۹ ذوالحجہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۸ر جنوری ۱۹۴۲ء بروز پنج شنبہ (جمعرات) سابق دفتر مجلس احرارِ اسلام ہند و دفتر روزنامہ "آزاد" لاہور، بیرون دہلی دروازہ لاہور کی بالائی منزل میں انتقال فرمایا اور "قبرستان مُوْنگ" اچھرہ وہیں مدفون ہوئے۔ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ مَغْفِرَتُہٗ وَ رِضْوَانُہٗ عَلَیْہِ۔ آمین۔

۱۴ــــــ● مُفکرِ احرار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعد۔ بڑی صابرہ و شاکرہ "مُطیع و وفادار اور نیک بیوی کو سوگوار چھوڑا، چار فرزندوں میں سب سے بڑے عزیزی۔ "شمس الحق" ۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈووکیٹ، صاحبِ عیال ہیں، نہایت شریف الطبع، شگفتہ مزاج و با اخلاق۔ ساہی وال میں مقیم ہیں۔ عزیزی۔ "ضیاءُ الحق" ۔ کالج تک کی تعلیم کے بعد کئی برس سے۔ "جرمنی" میں بہ سلسلہ ملازمت مقیم ہیں۔ عزیزی۔ "قمرُ الحق پاشا" ۔ سکول مدرس ہیں اسی سال شادی ہوئی ہے۔ عزیزی۔ "اظہارُ الحق ادیب" والدگرامی قدر کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے، ماشاءاللہ شادی شدہ اور پاکستانی فوج میں عہدہ دار ہیں۔ تین صاحبزادیاں بحمداللہ اپنے گھروں میں آباد ہیں، یہ گھرانا مفکرِ احرار مرحوم کی زندگی میں بھی معزز تھا، آپ کے وصال کے بعد بھی پوری جماعت آپ کی اہلیہ کے لیے ایک قابل صد فخر و احترام خاتون کی حیثیت سے پُرخلوص جذبات رکھتی ہے اور آپ کی اولاد کو عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، راقم الحروف کو حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں ہی مفکرِ احرار مرحوم کی خدمت میں کئی بار سلام کے لیے حاضر ہونے کا موقع ملا، دوگونہ تعلقات کے باعث میں مرحوم کو چچا جی کہتا۔ اباجی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی اہلیہ کو بہن بنایا تو اُن کو پھوپھی اور چچی کہہ کر سلام عرض کرتا، دونوں بے انتہاء شفقت و محبت فرماتے، آپ کی اولاد میں عزیز شمس الحق قریباً میرے ہم سِن ہیں، دونوں بہنیں غالباً بڑی ہیں، عزیزی ادیب کے سوا بقیہ بہن بھائیوں میں گھنٹوں بلکہ دنوں کھیلتا رہا ہوں، آج تک اس معصوم دور کی حسین یادیں زندہ ہیں، دعا ہے کہ۔ اللہ تعالیٰ تادمِ آخر ہمیں اس گھرانے کے ساتھ دین اور جماعت کے رشتہ سے وابستہ رکھیں اور اس خاندان

کے ہر فرد کو بھی اپنے بلند مرتبہ پیش رو کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے اپنی قدیم و مخلص اور تعاون کی مستحق جماعت کے ساتھ حقیقی اور دائمی وابستگی نصیب فرمائیں۔ "آمین ثُمَّ آمین"۔

۱۵ــــــ● ہ:

آخرِ کلام میں نشر و اشاعت کے متعلق چند ضروری باتیں عرض ہیں؛ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ؛ ثُمَّ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ! کہ پورے ۲۶ برس کے بعد مجلس احرارِ اسلام پاکستان کے نئے مکمل دستور کی اشاعت کے ذریعہ۔ جماعت کے مکتبہ مرکزیہ کا مبارک و انقلاب انگیز افتتاح ہو چکا ہے۔ اس دورِ سیاہ میں جبکہ انگریز پرستوں، سبائی، مرزائی، پرویزی اور شیطانی بغض و تعصب کے اسیر قلم کاروں نے یہودیت کو اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے" اور تحریف و خیانت کے مرتکب لیگی و غیر لیگی پرچہ نویسوں نے سیاسی دھاندلی اور علمی ڈکیتی کا خوف ناک طوفان برپا کر رکھا ہے، اس سیلابِ بلا کے آگے بند باندھنا ملک کے علمی و تاریخی مستقبل کے تحفظ کے لیے ایک فرض کی صورت اختیار کر چکا ہے، چنانچہ تحریکِ آزادی کی جامع، مکمل اور مستند تاریخ کو صحیح ترتیب کے ساتھ منظرِ عام پر لانے کی غرض سے دستورِ جماعت میں مذکورہ وسائل کار کی شق پر فوری اور بھرپور عمل درآمد کرتے ہوئے اہم ذخیرہ فراہم کر لیا گیا ہے، مختلف دینی، سیاسی اور ملکی موضوعات سے متعلق کئی ایک کتب و رسائل زیرِ اشاعت ہیں، البتہ جماعتی نقطۂ نظر سے قریباً سوا چھبیس ۲۶ برس کے بعد مختصر۔ "تاریخِ احرار" ۔ کو اس کی اصولی و مرکزی حیثیت کے مطابق ترجیح دے کر طبعِ ثانی ۲ کی صورت میں سب سے پہلے پیشِ خدمت کیا جا رہا ہے، تاکہ رُبع (۱/۴) صدی سے جماعت کے بنیادی لٹریچر کے لیے بے چینی سے منتظر و مشتاق عوام اور خود اہلِ جماعت کی علمی و تاریخی تشنگی کسی قدر سیرابی اور سکون سے بدل سکے، اس کے بعد جماعتی اور غیر جماعتی مطبوعات، نیز ملفوظاتِ اکابر پر مشتمل مفصل تاریخ، کل ہند و پاکستان مرکزی مجلسِ عاملہ و مجلسِ مندوبین کی منظور کردہ رہنما قراردادوں کا مجموعہ۔ نیز اکابرِ احرار کے اسلامی فکر و شعور، سیاسی بصیرت اور حکمت و تدبر کی آئینہ دار تقاریر و خطبات کی عظیم تاریخی امانت قوم کے سپرد کی جائے گی، علاوہ ازیں دوسرا تمام مطلوبہ مواد بھی پوری آب و تاب کے ساتھ اور ہماری اشاعتی روایات کے مطابق بتدریج منظرِ عام پر آتا رہے گا۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

ب

خصوصیّت کے ساتھ ملحوظ رہے کہ وہ لٹریچر جو کسی جماعتی رہنما یا کارکن کی سعی کا نتیجہ ہو اوّلاً تو اس کے ساتھ لکھنے والوں کے انفرادی حقوق وابستہ ہیں اور جماعت کے تعلق سے اس میں دوہرے حقوق شامل ہیں، ایسے ہی وہ تحریکی اور تبلیغی مواد جو بلا ذکرِ مصنّف و مؤلّف شائع ہو وہ بھی اگرچہ شخصی مفادات سے تو خالی نہیں تاہم اس میں بھی جماعتی حقوق بدرجۂ اولیٰ شامل ہیں، لیکن زبانی تعارف، چند روزہ شناسائی اور کسی قسم کے تعلق کو بہانہ بنا کر ذات اور جماعت دونوں کے مفادات پر شبخون مارنے والے بہت سے بے نام و بے رشتہ نئے نئے وارث پیدا ہو گئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، خصوصاً لٹریچر تو ہر وقت اِن اشاعتی چھاپہ ماروں کی زد میں رہتا ہے، اس لیے قارئین کو بالعموم اور مذکورہ لٹریچر کو بلا اجازت ہضم کرتے رہنے کے خوگر اصحاب کو خصوصاً واضح طور پر مطلع اور متنبّہ کیا جاتا ہے کہ حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے بیاض و ملفوظات، بیانات و خطوط، مقدّمات اور خطبات و تقاریر نیز مرحومین میں سے مفکّرِ احرار امیر افضل حق، محترم شیخ حُسام الدین، محترم حافظ علی بہادر خاں، باقیات میں سے محترم شیخ تاج الدین لدھیانوی اور جناب مولوی مظہر علی اظہر کے تحریکی مضامین، خطبات و تقاریر، بیانات و خطوط اور کتب و رسائل کا تمام مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ذخیرہ خالصتہً بہت سے خاندانوں اور خود جماعت کی ملکیّت ہے اور اِن سے وابستہ افراد ہی اِس کے اصل وارث ہیں۔ لہٰذا! ۔ اوّل تو کوئی شخص یا ادارہ اِن چیزوں کی خفیہ یا علانیہ اشاعت کر کے دینی، اخلاقی اور قانونی جرم کا ارتکاب نہ کرے، اور اگر وہ کسی بھی خیال یا نسبت سے ایسا غلط قدم اُٹھا چکا ہو۔ جیسا کہ بعض کم ظرف اور سنگدل لوگوں نے اپنا لایعنی تعلق اور سراسر جھوٹا حق جتلا جتلا کر "مالِ مفت دلِ بے رحم" کے مصداق بن کر ہمارا بہت سا ذاتی اور جماعتی لٹریچر بالکل زبردستی نہایت لغو، غلط اور بھونڈی شکل میں چھاپ چھاپ کر بیچ کھانے کو پیشہ بنا رکھا ہے اور وہ اپنے اس گناہ پر بجائے ندامت کے اپنی دھاندلی پر پوری ڈھٹائی سے قائم ہے تو بہتر یہی ہے کہ وہ آئندہ کے لیے اس مکروہ فعل سے بالکل دست بردار ہو جائے تاکہ لٹریچر کے اصل مالکین اور اُس کے درمیان ناگزیر تصادم رُونما نہ ہو، ورنہ واضح

رہے کہ اگر اس ذخیرہ میں سے کوئی بھی مواد اُس کی اصل حالت یا بدلی ہوئی صورت میں مکمّل یا تحریف کر کے کسی بھی حیلہ سے شائع کیا گیا، تو ذمّہ دارانِ مجلس اور مکتبۂ مرکزیّہ کے منتظمین ایسے ہر فرد یا ادارہ کے خلاف ہر قسم کی قانونی چارہ جوئی میں بالکل آزاد و خود مختار اور مکمّل حق بجانب ہوں گے، بعد میں ان کی کوئی غلط تاویل، جھوٹا عذر یا فرضی جواب قابلِ پذیرائی نہ ہو گا اور وہ ہرگونہ نقصان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ چنانچہ اسی ضابطۂ اخلاق کے ساتھ معلوم رہنا چاہیے کہ مفکّرِ احرار رحمۃ اللہ علیہ کا وہ ذاتی لٹریچر جو لاہور کا ایک ادارہ زندگی میں مرحوم کی اجازت سے اور بعد میں اُن کے اہلِ خانہ کے ساتھ مُعاہدہ کے مطابق شائع کر رہا ہے اُسے چھوڑ کر آپ کی زیرِ نظر کتاب ۔ "تَارِیْخُ اَحْرَار" ۔ نیز مضامین و خطوط، بیانات، تقاریر و خطبات اور کتب و رسائل کے جملہ حقوقِ اشاعت راقم الحروف نے مرحوم کی اہلیہ محترمہ اور فرزندِ اکبر عزیزی چودھری ۔ "شَمْسُ الْحَقّ" ۔ کی وساطت سے زبانی اور تحریری اجازت کی شکل میں خصوصیّت کے ساتھ حاصل کر لیے ہیں، لہٰذا! ۔ کوئی شخص یا ادارہ ان چیزوں کے متعلق بھی کوئی غیر شریفانہ ارتکاب نہ کرے ورنہ نتائج کا خود ذمہ دار ہو گا۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ ۔ !

ج

ربِّ کریم سے التجا ہے کہ وہ جماعت کے بلند اُصول و مقاصد کی تکمیل کے لیے ۔ ہماری دیرینہ تبلیغی و اشاعتی آرزوئیں پروان چڑھائیں تاکہ مجلس کے خُدّام موجودہ اور آئندہ نسل کو اُن کے تحریکی ماضی کے مدفون کارناموں، مستور تاریخی حقائق اور اس کی نیتی برحق و صواب جدّ و جُہد کی دینی و سیاسی امانت ۔ بہ خیر و خوبی سپرد کر کے اپنے حقیقی فرض سے سُبکدوش ہو سکیں، آمِیْن ثُمَّ آمِیْن ۔ ! انسان حاجات اور عُیوب کا مُرقّع ہے، انبیاء علیہم السلام تو بھی معصوم و مُستغنی ہونے کی شان کے باوجود ۔ اللہ تعالیٰ سے عالمِ اسباب میں اپنے لیے ساتھی اور مدد طلب فرماتے رہے، اُن کے سامنے ہم گنہگاروں کی کیا حیثیّت ہے؟ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک؟ اس لیے جملہ ہمدردانِ دینِ حق، طلب گارانِ تنظیم و اتّحاد اور مخلص متعلقینِ جماعت کا فرض ہے کہ وہ کفر و الحاد کے تسلّط اور مظلومیٔ اسلام و اہلِ حق کے اِس نازک دور میں آگے بڑھیں اور جماعت کو دامے، درمے، خیالے، سُخنے، قدمے ہر قسم کے تعاوُن سے بہرہ ور کر کے رضائے خداوندی، حسنِ خاتمہ اور نجات و

کامرانی کے مستحقین میں شمار ہوں۔ "وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ أَجْرٌ عَظِیْمٌ۔" !

د

کا لعدم وسائل اور درویشانہ انداز میں جو ہو سکا وہ پیشِ خدمت ہے، اِن شاء اللہ نفع سے خالی نہ ہو گا، خود پڑھیں اور اِس نایاب تاریخی تحفہ کے ساتھ ساتھ جماعت کی ہر تحریر اور پیغامِ حق کو ملک کے کونے کونے میں پہنچائیں، خلوصِ نیّت کے ساتھ ہر ممکن محنت و سعی جاری رکھیں، نتائج اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اِن شاء اللہ ذرّہ برابر عمل بھی ضائع نہ ہو گا، دنیا دار العمل ہے اور اجر کی جگہ عالمِ آخرۃ !—— وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلٌ ۵ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ۵ خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ أَصْحَابِہٖ وَأَزْوَاجِہٖ وَ أَوْلَادِہٖ وَ أَتْبَاعِہٖ أَجْمَعِیْنَ ۵ اٰمِیْن۔!

راقم السطور، خادمِ احرار، ابن امیرِ شریعت، سید ابو معاویہ۔ ابوذر بخاری
ناظمِ اعلیٰ مجلسِ احرارِ اسلام پاکستان، کاشانۂ معاویہ ۲۳۲ کوٹ تغلق شاہ، ملتان شہر

شب چہار شنبہ | ۳۰/۱۰/۱۳۸۷ھ
۳۱/۱/۱۹۶۸ء

—— • • ✯ • • ——

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ   نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

محترم "تاج الدین" لدھیانوی

پیش لفظ

مجلسِ احرارِ اسلام کو پروردگار نے ایسے بلند پایہ ادیب، مخلص قائد اور بے مثال خطیب عطا کیے تھے کہ دوسری تمام سیاسی اور مذہبی جماعتیں احرار رہنماؤں کا لوہا مانتی تھیں افتاد یہ پڑی کہ مجلس احرار کو ابتدا رہی میں ہنگاموں نے گھیر لیا۔ ابھی ایک تحریک ختم نہ ہوتی تھی کہ کوئی دوسرا محاذ کھل جاتا، حالات ایسے تھے کہ مدتوں بعد دورِ غلامی کا جمود ٹوٹا، فرزندانِ وطن کے سامنے ملکی اور ملّی مسائل کا ایک لا متناہی سلسلہ موجود تھا، ہر محاذ پر عملی اقدام کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں میں اُس وقت مجلسِ احرار کے سوا کوئی اور فعّال جماعت موجود نہ تھی دوسری جو بھی جماعت تھی میدانِ عمل میں قدم بڑھانے سے ہچکچاتی تھی۔ دیوانوں کا یہی سرفروش گروہ جسے احرار کے نام سے پکارا جاتا ہے مذہبی ہو یا سیاسی ہر محاذ پر نبرد آزما تھا۔ عملی اقدامات کی کڑیوں کی ایک طویل زنجیر بنتی جا رہی تھی غرضیکہ مجلسِ احرار کے ذمہ دار اور قابلِ احترام رہنماؤں کو آئے دن کی مصروفیتوں نے بری طرح اُلجھا رکھا تھا۔ میدانِ کارزار میں احرار کا طوطی بول رہا تھا کہ اچانک موت نے حملہ کیا۔ کسی قافلے کے محبوب سالار یکے بعد دیگرے قافلے کو میدانِ آزمائش میں بے یار و مددگار چھوڑ جائیں تو اس مجروح دل قافلے کی پریشانی کا کیا حال ہو گا؟ ہوا یہ کہ تقریباً سبھی ذمہ دار رہنما اس انتظار میں دُنیا سے رخصت ہو گئے کہ حالات پُرسکون ہوں تو مجلسِ احرار کی تاریخ کے صحیح خط و خال سپردِ قلم کیے جائیں تاکہ آنے والی نسلیں صحیح صورتِ حال سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کر سکیں اور انہیں معلوم ہو سکے کہ اسلام کے مخلص فرزندوں کو خدمتِ ملک و ملت کے میدان میں کن روح فرسا اور حوصلہ شکن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا چودھری افضل حق جنہیں مجلسِ احرار کا دماغ سمجھا

جاتا تھا سختی سے محسوس کر رہے تھے کہ حالات کتنے بھی ناسازگار کیوں نہ ہوں مجلس احرار کے ماضی کی تاریخ جس حد تک بھی ممکن ہو ضبطِ تحریر میں آجانا چاہیئے مگر...... جب زبان اور قلم پر قدغن لگی ہو اور قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں تو کوئی کیا کرے؟ بہرحال چودھری صاحب موصوف نے جرأت سے کام لے کر اپنی زندگی ہی میں احرار کے ماضی کی اجمالی صورت پیش کرنے کی کوشش کی مگر "تاریخ احرار" لکھنے وقت ہزار احتیاط کے باوجود جو کچھ لکھا اسے حکومت نے من و عن برداشت نہ کیا۔ فرنگی غلاموں اور سرکاری کارندوں کی ملی بھگت نے موصوف کی لکھی ہوئی "تاریخ احرار" پر جہاں جا بجا خط تنسیخ کھینچ دیا سنسر کی تلوار اپنا کام کر گئی اور چودھری افضل حق مرحوم صبر کا تلخ گھونٹ پی کر رہ گئے۔ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ برطانوی کارندے اور اس کے لگے بندھے گروہ مختلف ناموں سے میدانِ آزادی میں روک ٹوک اور رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے موجود تھے حکومت اور اس کے ان کارندوں کے ہاتھ کھلے تھے۔ غریب احرار جو حقیقتاً غریبوں ہی کے نمائندے تھے ہر طرح کی دنیاوی آسائشوں اور آسانیوں سے یکسر محروم تھے۔ احرار کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ احرار کو اپنے مرکز یعنی خطۂ پنجاب میں جن طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا ان کی پشت پر براہ راست برطانوی اقتدار کا ہاتھ تھا یہی خطۂ پنجاب، ہندوستان میں برطانیہ کی ریڑھ کی ہڈی اور بازوئے شمشیر زن سمجھا جاتا تھا برطانوی سرکار پنجاب کو ہر قسم کی سیاسی آلائشوں سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ پنجاب میں ٹوڈیانِ کرام اور سرکاری پیرانِ عظام کے علاوہ برطانیہ نے بکمال ہوشیاری و عیاری پیرانِ پیر یعنی اپنے ڈھب کا ایک نبی بھی لا کھڑا کیا اور انہی چند عناصر کے ذریعے پنجاب کو مضبوطی سے جکڑ لیا گیا۔

دورِ غلامی میں خطۂ پنجاب حکومت برطانیہ کا مضبوط قلعہ بن چکا تھا اس طرح نظر بظاہر مسلمان قوم برطانوی اقتدار کے لیے ممد و مددگار اور ایک حد تک قابلِ اعتماد بھی سمجھی جاتی تھی۔ ان دنوں مسلمانوں کو قوم پرور (نیشنلسٹ) جماعتوں سے دور رکھنے کی انتہائی کوشش کی گئی۔ اس کوشش میں برطانوی حکومت تقریباً کامیاب بھی تھی۔ ایسے مایوس کن حالات میں مجلسِ احرار ایسی غریب مسلمان جماعت کا نعرۂ حق بلند کرتے ہوئے میدانِ کارزار میں اُترنا نارِ نمرود میں کودنے کے مترادف تھا مگر خلوصِ نیت سے اللہ پر بھروسا کر کے اسلام کی سربلندی اور ملک و ملت کی فلاح کے لیے کام کیا جائے تو خلافِ توقع کامیابی کے آثار نمایاں ہونے

لگتے ہیں، چودھری افضل حق مرحوم نے احرار کے ماضی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے عام فہم زبان اور قلمِ حق رقم سے احرار کی تاریخ جن مجبوریوں میں لکھی ہے اسے بیتے دنوں اور جنگ آزادی کے ابتدائی دور کی دلدوز اور خونچکاں داستان کا ہلکا سا عکس سمجھیے واقعات اور حالات چونکہ مجملاً آ گئے ہیں اب یہ بات قطعی نامناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی کی جائے۔ حالات کی ناسازگاری اور مشکلات کا ہجوم نہ ہوتا تو چودھری صاحب کیا کچھ لکھنا چاہتے تھے اور وہ احرار جال فروشوں اور کفن بردوش مجاہدوں کے کارناموں کو الفاظ کا کتنا خوب صورت جامہ پہناتے؟ آزادی کے ساتھ موصوف اپنی تحریر کے اچھوتے انداز میں جو کچھ لکھتے ان کی وہ تصنیف ایک نادر دستاویز کی صورت میں موجود ہوتی! مگر...ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

چودھری افضل حق مرحوم جنگ آزادی کے انجام اور آفتاب آزادی طلوع ہونے سے قبل ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے بعد......ع

پھر ان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

مجلس احرار کو آزمائش کی انتہائی خطرناک راہوں سے گذرنا پڑا آرزوئیں اور امیدیں غم کے بوجھ تلے دب گئیں بندے جو کچھ سوچتے ہیں وہی کچھ جوں کا توں ہو جائے تو بندے خدا نہ بن جائیں؟ وہی کچھ ہونا ہے جو اللہ کو منظور ہو جماعت احرار کے لیے جو کچھ لکھا گیا ہے جماعت نے اسی کو غنیمت سمجھا اور خدا کا شکر ادا کیا چند سال قبل کی بات ہے احباب نے مجھ سے تقاضا کیا کہ چودھری صاحب نے اپنی زندگی میں ماضی کے حالات تو قلم بند کر دیئے ہیں اس کے بعد کے حالات اور واقعات ضبطِ تحریر میں آجانا چاہیئیں۔ جب اس تقاضے نے زور پکڑا تو میں اپنی استطاعت کے مطابق سرگذشت کے عنوان سے لکھنے بھی بیٹھ گیا ابھی اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی دور کے واقعات ہی قلم بند کیے تھے تو مجھے معلوم ہوا کہ شیخ حسام الدین مرحوم "تاریخ احرار" لکھنے کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں میرا بوجھ ہلکا ہو گیا میں نے جو کچھ لکھا تھا اسے لپیٹ کر رکھ دیا۔ انہی دنوں آغا شورش نے شیخ صاحب سے تبادلہ خیال کیا طے یہ پایا کہ شیخ صاحب لکھاتے جائیں اور کوئی سمجھ دار پرانا ساتھی لکھتا جائے۔ اس کے بعد مسودہ پر ذمہ دار احباب نظر ثانی کر لیں

اور مکمل تاریخ احرار شائع کر دی جائے۔ کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ اشرف عطا صاحب روزانہ دو گھنٹے شیخ صاحب کے دردولت پر جا کر اس کارِ خیر میں ہاتھ بٹائیں۔ بدقسمتی سے اس فیصلے کے بعد اچانک شیخ صاحب ضیق النفس کے دورے میں مبتلا ہو کر صاحبِ فراش ہو گئے۔ اشرف عطا صاحب روزگار کے سلسلے میں گوجرانوالہ چلے گئے۔ اس طرح یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ واحسرتا کہ ضیق النفس کے یہی نامراد دورے بالآخر احرار کے بہادر جرنیل اور قابلِ فخر رہنما شیخ حسام الدین مرحوم کے لیے موت کا پیغام بن گئے اور مجلس احرار کا لٹا پٹا قافلہ موت کی چیرہ دستیوں سے مضمحل ہو کر رہ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

چودھری افضل حقؒ کی تصنیف "تاریخ احرار" اب تقریباً نایاب ہو چکی ہے اس لیے احباب نے ضرورت محسوس کی کہ دوسری جلد کی ترتیب و تدوین سے قبل چودھری صاحبؒ کی لکھی ہوئی "تاریخ احرار" دوبارہ شائع کر دی جائے تاکہ میدانِ سیاست کے نو واردوں کو کچھ تو معلوم ہو کہ قصرِ آزادی کی بنیادوں میں کن غازیانِ اسلام کے مقدس خون اور ہڈیوں سے کام لیا گیا۔ احرار کے جانبازوں نے آزادی کی ابتدائی منزل کو کس بے جگری سے پار کیا۔ اور احرار کے جیالے رضاکاروں نے کس طرح کفر پر مسلمانوں کے رعب کا سکہ بٹھایا۔

ایک اندیشہ

مجھے اب بھی اندیشہ ہے کہ ہمارے بعض دیرینہ کرم فرما "تاریخ احرار" سے اپنے مطلب کے نتائج کانٹ چھانٹ کر حسبِ سابق تنقید کے زہر آلود تیروں سے احرار کو چھلنی کرنے اور احرار کے خلاف ناانصافی سے کام لیتے ہوئے پراپیگنڈا کرنے کی ناکام کوشش کریں گے۔ چودھری افضل حقؒ کی زندگی ہی میں ایک بار اس قسم کی بے ہودگی اور ناانصافی سے کام لے کر یہ پراپیگنڈا کیا گیا تھا کہ احرار تو پاکستان کو پلیدستان کہتے ہیں یہ دیکھیے ان کے لیڈر کی اپنی تحریر میں "تاریخ احرار کے فلاں صفحے پر واضح الفاظ میں یہ فقرہ موجود ہے۔" ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں اور جب تک مرزائیت کا طلسم ٹوٹ نہیں جاتا وہ بڑی عیاری سے مسلمانوں کو بہکانے اور گمراہ کرنے کے لیے احرار کے خلاف چھینٹا بازی کرتے ہی رہیں گے مگر حق کبھی باطل سے دبا نہیں ہے۔ احرار کے جری اور بہادر رہنماؤں نے ہمیشہ حق بات کہی اور ہمت و مردانگی سے اس کی سزا بھی بھگتی وقت پر مسلمانوں نے دشمن کے پراپیگنڈے

سے متاثر ہو کر احرار کو جھٹلایا گر وقت گذر جانے پر ساری قوم وہی بات دہرانے لگی جو احرار نے ابتدا میں کہی تھی۔ مسجد شہید گنج کے واقعے ہی کو لیجیے اب مسجد شہید گنج کی مسمار شدہ عمارت جوں کی توں موجود ہے مسجد گرا کر انگریز چلا تو گیا گر جاتے جاتے مسجد کا ملبہ احرار پر گرا گیا۔ اس سنگ دلانہ واقعہ کے بعد کسی نے احرار کے مخالفین کو یہ نہ پوچھا کہ بھلے لوگو بیگانی شہ پر بیگانی حکومت میں کعبے کی بیٹی کا ماتم کرتے تھے اب تو اپنی حکومت اور اپنا راج ہے کعبہ کی بیٹی کا کیا بنا؟ بھولی بھالی جذباتی قوم اپنے ہی مخلص خادموں کو ذبح کر کے اب کہتی ہے کہ احرار سچ تو کہتے تھے، برطانوی حکومت اور اس کے کارندوں نے مسلمانوں کو دھوکے میں مبتلا کر کے احرار کے خلاف خطرناک چکر چلا دیا تھا وقت گذر گیا احرار شکوہ نہیں کرتے کہ انہوں نے بیگانوں کی جھوٹی بات سُن کر اپنے سچے اور مخلص خادموں کو بلاقصور بے عزت کیا اور قوم کے مخلص مجاہدوں کی راہ میں کانٹے بکھیر دیے ایسا تو ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا جسے خدا اور رسول کی خوشنودی کے لیے خدمت کرنا مقصود ہے اس کو ان مشکل اور صبر آزما راہوں سے گذرنا ہی پڑے گا۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دردمندانہ گذارش

"تاریخ احرار" کا مطالعہ کرتے وقت یہ خیال رہے کہ چودھری افضل حقؒ نے پاکستان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور جن خیالات کا اظہار کیا ہے یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسلم لیگ قرارداد لاہور کے ذریعے مطالبہ پاکستان کا اعلان کرنے کے بعد پاکستان میں طرزِ حکومت کی بحث میں الجھ رہی تھی۔ مجلس احرار نے اُنہی دنوں یعنی ۲۶ اپریل ۱۹۴۳ء کو اجلاس سہارنپور میں حکومت الٰہیہ کی مندرجہ ذیل تجویز منظور کر کے اپنی جماعتی پالیسی کا اعلان کر دیا۔

حکومتِ الٰہیہ زندہ باد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

"مجلس احرار اسلام حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی خواہاں ہے"

مجلس مرکزیہ احرار اسلام ہند کا اہم فیصلہ

اکھنڈ بھارت، پاکستان اور آزاد پنجاب کے بارے میں اظہار خیال

مجلس احرار اسلام ہند نے اپنے اجلاس سہارن پور میں ۲۶ اپریل ۱۹۴۳ء کو موجودہ ملکی وسیاسی صورت حالات کے پیش نظر مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی

مجلس احرار اسلام ہند نے اکھنڈ بھارت، پاکستان اور آزاد پنجاب وغیرہ سکیموں کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جنگ عالم گیر کی تباہ کاریوں اور جنگی رقبوں سے ہزاروں میل دور علاقوں میں جنگ کے تکلیف دہ اور فتنہ زا اثرات پر دھیان دیتی چلی آئی ہے۔

مجلس تمام غوروفکر کے باوجود اپنے آپ کو اپنا یہ پرانا مسلک چھوڑنے پر آمادہ نہیں پاتی۔ کہ ہندوستان کی سیاست کا پیچیدہ مسئلہ بہرحال اس ملک کے رہنے والے لوگوں کے درمیان امن واعتماد باھمی کے ذریعہ ہی حل ہو سکتا ہے اس لیے مجلس ان تمام سکیموں کے حامیوں سے بھی عرض کرنا چاہتی ہے کہ اکھنڈ بھارت، پاکستان یا آزاد پنجاب جیسی کوئی سکیم بھی باھمی اعتماد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کسی فریق کا یہ خیال ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے سہارے سے

اپنی کوئی اسکیم منوا سکتا ہے۔ تو اسے یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے۔ کہ انگریزی سہاروں کے سہارے جو سکیم بھی منوائی جائے گی وہ انگریز کی غلامی پر مجبور کرے گی اور اسی وقت تک قائم رہ سکے گی جب تک اس غلامی کا طوقِ گراں بار موجود ہو۔

ایسے اکھنڈ بھارت، پاکستان اور آزاد پنجاب کے نمونے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں انگریزی حکومت کی آمد کے وقت سے موجود چلے آرہے ہیں۔ اس لیے سیاسیین ہند کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی گرم روی میں ایسے حالات پیدا نہ کریں۔ جو بالآخر چند ایک اور مجبور و محصور ریاستیں ہندوستان میں پیدا کر دیں اور بس۔

اندریں حالات مجلس احرار اسلام اپنی روش کا اظہار ان الفاظ میں کر دینا مناسب سمجھتی ہے:-

(۱) مجلس احرار اسلام کو کسی ایسی تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی جس کی کامیابی کے لیے لندن کے طواف کی ضرورت یا انگریزی سنگینوں کی احتیاج ہو۔

(۲) مجلس احرار اسلام اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ہندوستان میں ایک مرکز قائم کیا جائے یا زیادہ اور اس کے صوبوں کی موجودہ تقسیم کو روا رکھا جائے۔ یا اس میں تبدیلی کرنے کی خواہش ہو۔ ہر حالت میں صلح جویانہ عہد و پیمان اور امن و آشتی کا ماحول ہی بہترین فیصلہ میں مدد دے سکتا ہے۔

(۳) مجلس احرار اسلام اس منافرت انگیز پراپیگنڈا کو جو کسی طرف سے بھی کیا گیا ہے یا کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے مستقبل یا اکھنڈ بھارت یا پاکستان یا آزاد پنجاب وغیرہ کے قیام کے لیے مہلک سمجھتی ہے اور اس لیے ہر اسکیم کے حامیوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ملک کی فضا کو مسموم کرنے والی تقریروں، تحریروں اور دیگر پراپیگنڈا سے باز رہیں اور اپنے راستے میں خود ہی کانٹے نہ بوئیں۔

(۴) مجلس احرار اسلام زمانہ کے موجودہ حالات میں فیصلہ کر چکی ہے۔ کہ اب ہمیں ملک کو اندرونی فساد کے فرقہ وارانہ یا اقتصادی خطروں سے بچانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے اسی کام پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ پس جہاں مجلس اس وقت حکومت سے متصادم نہیں ہے۔ وہاں وہ مذہبی یا سیاسی اختلاف کی بنا پر بھی کسی فریق یا جماعت سے تصادم مناسب نہیں سمجھتی اور جہاں

وہ ہندو، سکھ یا عیسائی وغیرہ سے تصادم یا فتنہ انگیز اختلاف مناسب نہیں سمجھتی۔ وہاں وہ مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی پیدا کرنا ہرگز ہرگز پسندیدہ تصور نہیں کرتی۔

(۵) گو مجلس موجودہ وقت میں حکومت برطانیہ سے کوئی مطالبہ کرنا پسند نہیں کرتی اور اپنی قسمت کو اللہ کے سپرد کرنا زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔ پھر بھی وہ ہندوؤں اور مسلمانوں یا مسلم لیگ اور کانگریس کے سمجھوتے کی راہ میں سنگ گراں بننے کی خواہش مند نہیں ہے۔ اسے ایسے سمجھوتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔ تاہم جو لوگ اس وقت سمجھوتے کی کوشش کرنا چاہیں وہ اُن کو روکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ ان حالات میں وہ سمجھوتے کی علیحدہ کوشش کر کے مسلمانوں میں باہمی خلفشار کو ہوا دینا نامناسب سمجھتی ہے اور واضح کر دینا چاہتی ہے کہ جو کوئی سمجھوتا چاہتا ہے وہ بے شک مسلم لیگ سے اور جس کسی جماعت سے چاہے باتیں کرے۔ لیکن وہ مجلس احرار سے امید نہ رکھے کہ وہ ایسے مخمصوں میں پھنس کر مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی کا دروازہ کھولے گی۔

(۶) مجلس احرار اسلام واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ کسی جغرافیائی یا نسلی یا لسانی وغیرہ حدود کو قائم کرنا یا برقرار رکھنا مسلمان کا مذہبی یا حقیقی اور قطعی فریضہ ہے بلکہ ہر حالت میں خدا اور رسول کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا، دُنیا میں نیکی سے رہنا، نیکی سے تعاون کرنا۔ نیکی کی حکومت قائم کرنا اور نیکی کو رواج دینا ہی خلقتِ انسانی کی خداوندی حکمت و مصلحت ہے اور مجلس احرار اسلام دنیا کے جس حصہ میں بھی ممکن ہو، حکومت الٰہیہ کے قیام کی خواہاں ہے تاکہ دُنیا کو دکھایا جا سکے کہ اسلام کے زرّیں اُصولوں پر کاربند ہو کر کس طرح دُنیا کے مصائب کا علاج کیا جا سکتا ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے؟

اس ضمن میں مجلس احرار اسلام یہ واضح کر دینا بھی مناسب سمجھتی ہے کہ کسی علاقہ میں محض مسلمانوں کی اکثریت یا افراد کے ہاتھوں میں حکومت کا آجانا حکومت الٰہیہ کا مُترادف نہیں بلکہ ایسی شخصی یا جماعتی حکومتوں نے جو اسلام کے نام پر اپنی اغراض کی تکمیل کے درپے رہیں، اسلام کے روئے روشن پر دھبّا لگایا اور دنیا کو اسلام سے متنفر ہونے کی گنجائش دی۔ مجلس کسی ایسے تجربہ کو

دہرانے کے لیے مسلمانوں کی دین سے بے بہرہ کسی جماعت یا گروہ کے ہاتھ حکومت دے کر مطمئن نہیں ہو سکتی اور وہ مُسلمانوں سے پرزور درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا فوری اور کلی احساس کریں اور اپنی نگاہ سے حکومت الٰہیہ کو اوجھل کر کے اسلام کے نام پر الحاد و زندقہ کے فروغ کا موقع نہ دیں۔ بلکہ سب مسلمانوں کو اطاعت خدا و رسول پر کمربستہ ہونے کی تلقین و تاکید کریں۔

دیگر سیاسی جماعتوں سے اشتراکِ رُکنیت کا خاتمہ

دوسری قرارداد جو مجلس مرکزیہ احرار اسلام ہند نے سہارن پور میں ۲۷ اپریل ۱۹۴۳ء کو منظور کی:۔

"مجلس احرار اسلام ہند کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ مجلس احرار اسلام کا کوئی ابتدائی ممبر کسی دیگر سیاسی جماعت کا ابتدائی ممبر نہ بنے تاکہ مختلف سیاسی جماعتوں کے اشتراک سے باہمی کشمکش کا سبب پیدا نہ ہو سکے۔"

حکومت الٰہیہ کی قرارداد اور واضح پالیسی کے اعلان کے بعد مجلس احرار کتاب و سنّت اور اُسوۂ صحابہ کے مُطابق اسلامی آئین کی تشریح کرتے ہوئے مسلم عوام کو حکومت الٰہیہ کے خط و خال سمجھانے میں مصروف ہو گئی۔ پراپگنڈا جاری تھا، مجلس احرار کے سحر بیان مُقرر واضح الفاظ میں قیام حکومت الٰہیہ اور عوامی حقوق کی مُساویانہ اسلامی تقسیم کا مژدہ سناتے وقت ایک خدشے کا اظہار کرتے تھے وہ یہ بات برملا کہتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ نئی بننے والی قومی حکومت میں اسلام کے نام پر کوئی سراسر غیر اسلامی نظام اور دستور مُسلط کر دیا جائے اور مسلم عوام کے حقوق ہندو سرمایہ داروں سے چھین کر مسلمان سرمایہ دار کے سپرد کر دیئے جائیں اور غریب مسلم عوام مُنہ تکتے رہ جائیں۔ احرار کے اس جائز اور خالص اسلامی مطالبے پر مسلم لیگ کا سرمایہ دار طبقہ ٹھٹک رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ احرار کی یہ بنیادی بات عوام کے ذہن نشین ہو جائے یہی سرمایہ دار طبقہ احرار اور مسلم لیگ کے درمیان حدِ فاصل بن کر کھڑا ہو گیا۔ ورنہ مسلم لیگ اور احرار کا مطالبہ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا تھا یعنی پاکستان کے بغیر حکومتِ الٰہیہ قائم نہ ہو سکتی تھی اور حکومت الٰہیہ کے بغیر پاکستان شرمندہ معنی رہتا۔ مسلم لیگی سرمایہ داروں کی مخالفت کے باوجود

احرار نے بالآخر اپنے حلقۂ اثر میں پاکستان کی حیثیت کے بارے میں ہر قسم کی بحث ختم کرتے ہوئے ذمہ داری سے یہ اعلان کر دیا کہ لفظِ پاکستان دکھی دلوں کی پکار ہے۔ اس کی مخالفت یکسر ختم کر دی جائے مطلب یہ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ احرار کا جائز مطالبہ سرمایہ دار طبقہ اگر نہیں مانتا تو نہ مانے سرمایہ دار طبقے کا قبضہ ہوتا ہے تو ہو جائے۔ عوام کے حقوق کے لیے پاکستان بن جانے کے بعد بھی خاطر خواہ تصفیہ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ مسلم لیگ کے سرمایہ دار طبقے اور احرار کی تنازع کی اصل بنیاد مساویانہ تقسیم حقوق تھی۔ ورنہ احرار خود ہندو ذہنیت کی تنگ دلی سے سخت نالاں تھے۔ احرار کا جذبۂ ناراضگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی جس کی واضح اور ناقابلِ تردید شہادت یہ ہے کہ تحریک خلافت کے خاتمہ پر مجلس احرار کی بنیاد رکھنے والے تمام مسلم زعماء خصوصاً پنجاب سے تعلق رکھنے والے اکابر ایک ایک کر کے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی اور پھر آخر میں اس کی رکنیت سے بھی مستعفی ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے اجلاس کراچی سے واپسی پر چودھری افضل حق مرحوم نے مستعفی ہو کر ہندو ذہنیت سے بیزاری اور مسلمانوں کے لیے تحفظ حقوق کی جداگانہ تحریک و جماعت سازی کی ضرورت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اور اسی سال ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مجلس احرار اسلام ہند کی بنیاد رکھ دی گئی۔ بہرحال مجلس احرار کے بیدار مغز اور دور اندیش رہنما چودھری افضل حقؒ نے مستقبل کے خطرات کی صرف نشان دہی کی تھی اور وہ نشان دہی کسی بدنیتی پر مبنی نہ تھی انصاف سے کام لیا جائے تو آج بھی ہر منصف مزاج پاکستانی مسلمان چودھری صاحبؒ کے خدشات کی اہمیت کو محسوس کرے گا۔ موصوف نے پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کے بارے میں اسلام کے تقاضوں کے عین مطابق اصولی بحث کی ہے اور یہ بحث بھی ایسے نازک دور کی بحث ہے جب ہم برطانوی سامراج کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ تنگ دل ہمسایہ بہت بڑی عددی اکثریت رکھنے کے باوجود مسلمان اقلیت کے حقوق تسلی بخش صورت میں طے کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ مجلس احرار جس نے وطن عزیز کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے غیر مسلموں سے کم قربانیاں نہ کی تھیں مسلم حقوق کے تحفظ کے لیے اسی طرح بے چین تھی جس طرح ایک مسلمان جماعت کو ہونا چاہیے تھا یہ الگ بات ہے کہ مجلس احرار کا انداز فکر دوسروں سے جدا تھا مگر حق طلبی میں احرار کا نقطہ نظر خالص اسلامی تھا۔

کیا یہ درست نہیں کہ اسلام عوام پر خدا کی حاکمیت قائم کرتا ہے؟ اسلام مال و دولت کی مساویانہ تقسیم کا قائل ہے؟ اور غریب عوام کو عقیدہ، جان اور مال جیسے بنیادی حقوق کا تحفظ حاصل ہونا چاہیے؟ اور کیا برسوں پہلے مسلمانوں کے لیے ان اصول پر مشتمل پاکیزہ نظام زندگی برپا کرنے کی غرض سے مسلم لیگ سمیت تمام مسلمان جماعتوں کو قیام حکومت الٰہیہ کا نعرہ لگا کر مجلس احرار نے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت نہیں دی؟

مگر احرار کی اسی حق پسندی کو جھوٹے پراپگنڈے کے زور پر ”غدّاری“ سے تعبیر کیا گیا اور احرار کے خلاف مخالفت کی آندھی چلائی گئی۔

آج ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ احرار نے سلطنت سے پہلے اس کے لیے نظامِ زندگی اور آئین کا مسئلہ طے کرنے کی تجویز پیش کر کے اور اس کے لیے پُرامن اور مثبت تحریک چلا کر۔ مسلم عوام کے دکھے دلوں کی صحیح ترجمانی کی تھی یا نہیں؟ اور جن لوگوں نے اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد قوم کو دستوری مسئلہ کے جنجال میں پھنسانے کا پروگرام بنا رکھا تھا کیا انہوں نے بیس برس گذرنے پر بھی اپنا وعدہ پورا کیا؟ عوام ہندو سرمایہ داری کے پنجے سے نکل کر مسلمان سرمایہ داروں کے چنگل میں پھنسنے سے بچ گئے؟ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو گئی؟ عوام کے حقوق کا تحفظ ہو گیا؟ کیا مسلمانوں کی زندگی کی سب سے بڑی متاع اُن کے دین و دنیا کی مشکلات کا صحیح حل کتاب و سنّت اور اسوۂ صحابہ کے مطابق خالص اسلامی نظام نافذ کیا گیا؟ اور کیا پاکستان مسلم لیگ کے نعروں اور دعویٰ کے مطابق اصلی اور حقیقی پاکستان بن گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان تمام سوالات کا جواب واضح اور مکمل نفی میں ہے! گویا احرار کا خدشہ آج واقعہ اور ناقابلِ تردید حقیقت بن کر سامنے آ چکا ہے لیکن غیروں کے اس جرم پر بھی غریب احرار ہی کو سزا کا مستحق سمجھا گیا ہے ع

آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے؟

اب آپ ”تاریخ احرار“ کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اس جماعت نے بے سروسامانی میں خدمت خلق کا بیڑا اٹھا کر کتنی خدمت کی اور اسے کن کٹھن منزلوں سے گذرنا پڑا۔ مجلس احرار غریبوں کی جماعت ہے یہ غلطی بھی کر سکتی ہے مگر سوال نیت کا ہے ہو سکتا ہے کہ ”تاریخ احرار“ کے مطالعہ کے بعد بعض حضرات آج بھی احرار کی رائے یا عمل کے کسی حصّے سے اختلاف کریں مگر اختلافِ رائے کا کیا یہ طریقہ مناسب ہے کہ احرار کی تمام قربانیوں پر خطِ تنسیخ کھینچ کر مرزائیوں کو احرار کے خلاف پراپگنڈے کا موقع بہم پہنچایا جائے؟ مجھے اس گذارش کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ابھی حال ہی میں امت مرزائیہ نے ”تاریخ احمدیت“ کی ساتویں جلد میں اس قسم کی تمام تحریریں جو مسلمانوں کے نام سے احرار کے خلاف لکھی گئیں درج کر کے دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ ”مسلمانوں میں صرف احرار

ہی ایک ایسی جماعت ہے جو قادیانی نبوّت کے خلاف پراپاگنڈا کرتی ہے مگر مسلمان قوم اس جماعت کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی۔ امّت مرزائیہ کے پاس احرار کے معقول اعتراضات کا کوئی جواب نہیں ہے اس لیے ذمہ دار مرزائی حضرات براہ راست کوئی جواب نہیں دیتے۔ البتہ نہایت عیّاری اور چالاکی سے وہ مسلمانوں ہی میں سے کسی ایک کو بہکا کر احرار کے خلاف اوٹ پٹانگ لکھوا لیتے ہیں اور پھر اسے پمفلٹ اور اخبارات کے ذریعہ اُچھالتے ہیں۔ اس لیے دردمندانہ گذارش ہے کہ "تاریخ احرار" پر رائے کا اظہار کرتے وقت احرار کی مشکلات اور حالات کی ناسازگاری کو نظرانداز نہ کیا جائے ——— وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ ـ !

خادمِ احرار:

"تاج الدین"

شب پنج شنبہ	دفتر مجلس احرار اسلام پاکستان
۲۱/۷/۸۷ ھ	بیرون دہلی دروازہ، لاہور
۲۶/۱۰/۶۷ ء	

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ——— نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

مولانا عُبَیْدُ اللہ "اَحرار" فیروزپوری
امیر مجلس احرار اسلام پاکستان

اِشارات

ا ——— مغلیہ خاندان میں اکبر، ہمایوں کے گھر میں اُس وقت پیدا ہوا ——— جبکہ شیر شاہ سُوری اس کے تعاقب میں تھا وہ بیچارہ صحراؤں، دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا تھا اس مسلسل بے چینی کی وجہ سے ہمایوں، اکبر کی تعلیم و تربیت کا کوئی بندوبست نہ کرسکا، اس طرح یہ ذہین و فطین شہنشاہ ہر قسم کے عُلوم و فنون سے بالکل بے بہرہ رہا، اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں نہ صرف اپنی سلطنت اور قلم رَو کو وسیع کیا بلکہ سیاسی مصالح کی بنا پر ہندوؤں کو بہت زیادہ مُراعات دیں اور اپنی حرم سراؤں میں "ہندو بیگمات" کو داخل کرلیا، یہیں سے اس کے دربار و سرکار میں اِلحاد اور بے دینی کی ابتدا ہوتی ہے، اِس بے دینی کی رہی سہی کسر ــ "اَبُوالْفَضْل" ــ اور ــ "فَیْضِی" ــ کی مُلحدانہ سرگرمیوں نے پُوری کردی، ان کی زندیقیت آخر میں اکبر کے ــ "دِیْنِ اِلٰہِی" ــ کا رُوپ دھار گئی ــ اکبر کا اِلحاد روز بروز فروغ پذیر ہوتا رہا، اسے حکومت کی سرپرستی نے اسلامیانِ ہند کے لیے ایک عظیم فتنہ کی صورت پیدا کردی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی دربار میں سجدۂ تعظیمی لازم قرار دیا گیا، اکبر کو معصوم اور دینِ الٰہی کا باقی ثابت کیا گیا، محمدؐ اور احمدؐ کے نام پر بچوں کا نام رکھنا ممنوع قرار دیا گیا، ہندوؤں کی رعایت سے ذبیحۂ گاؤ حکماً بند کردیا گیا، ختنہ ایسے مسنون فعل کو جُرم گردانا گیا، اس قسم کی بے شمار خرافات، بدعات

سیئات، منکرات اور فواحش کو سرکاری سرپرستی میں پھیلایا گیا، اس قسم کی غلطی بھی نامعقول حرکات کی گئیں، ابوالفضل اور فیضی کی بارگاہ سے اُنہیں سندِ جواز مُہیّا کی گئی، ابوالفضل اور فیضی نے اپنے گھٹیا عقائد کے لیے ہمیشہ اکبر کے مذموم افعال کو مدلّل بنانے کی ناکام کوشش کی، یہ فتنہ اس حد تک پھیلا کہ شیخ ۔ "عَبْدُ الْحَقْ" ۔ مُحدّث دہلوی مرحوم ایسے یگانۂ روزگار اشخاص نے بھی سکوت اور عزلت گزینی میں ہی مصلحت سمجھی، لیکن ہر فرعونے را موسیٰ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دین کی تجدید و احیاء کے لیے محبوب سُبحانی، مجدّد الفِ ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کو پیدا فرمایا، حضرت شیخ سرہندی کا علم، تقویٰ، خُلوص، لِلّٰہیّت، حق گوئی، حق پسندی، جذبۂ اتباعِ سُنّت، استقلال، استقامت، دعوت، عزیمت اور مخلصانہ مساعی، جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں رنگ لائیں، یُوں خدا تعالیٰ نے دینِ حنیف اور ملّتِ بیضاء کی حفاظت و صیانت اور تحفّظ و دفاع کے سامان مہیّا فرمائے۔

۲ ——● حضرت سلطان "اَوْرَنْگ زِیْبْ عَالَمْگِیْرْ" رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد سترھویں [17] صدی عیسوی میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے زوال کے آثار بالکل نمایاں ہو چکے تھے، جنوبی اور مشرقی ہند کی طرف سے انگریز اپنی پوری ڈپلومیسی کے ساتھ ایک تاجر کے بھیس میں نہ صرف ہندوستان میں ڈیرے لگا چکا تھا بلکہ ۔ "پلاسی" ۔ اور ۔ "سرنگاپٹم" ۔ کے میدانوں میں اپنے "جَعْفَرْ" ۔ و ۔ "صَادِقْ" اور اُن کے زلّہ خواروں کی غدّاری و ملّت فروشی کی بدولت شیرِ بنگال "سِرَاجُ الدَّوْلَہْ" ۔ اور مجاہدِ دکن ۔ "ٹیپُوْ سُلْطَانْ" ۔ کو جامِ شہادت نوش کرانے کے خوفناک قاتلانہ منصوبہ کی تکمیل کر چکا تھا، مُسلسل اور بے راہ رو حکمرانی کی وجہ سے مسلمانوں کے علمی و فکری قُویٰ مُضمحل ہو چکے تھے، ان کے علمی اور فکری سوتے خشک ہو چکے تھے، جُمود و جہالت اور رہبانیت و بدعت پرستی ان کے ایوانِ علم و عمل میں دھرنا مار کر بیٹھ چکی تھیں، اُن کی سیاسی صفوں میں نہ صرف بُحرانی کیفیّت رُونما ہو چکی تھی بلکہ وُہ شدید انتشار کی نذر ہو چکے تھے، نتیجۃً مغلیہ اقتدار چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔

۳ ——● اس یاس و قنوط کے عالم میں ہندوستان کی راج دھانی ۔ "دِہْلِیْ" ۔ سے خاندانِ فاروقی کے

گلِ سرسبد حضرت شاہ عبد الرحیم کے لختِ جگر امامُ الہند حُجّۃ الاسلام حضرت شاہ ۔ "وَلِیُّ اللّٰہْ" ۔ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ گمنامی کی صفوں سے اُٹھے، اپنی خداداد قابلیّت، لیاقت، ذہانت، فطانت، علم، ریاضت اور تصنیفات کی بدولت شہرت کے آسمان پر پہنچے، حضرت شاہ ولی اللہ مرحوم نے خوب اچھی طرح یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اب شدید سیاسی بحران اور سیاسی انتشار میں مبتلا ہو چکے ہیں، ان کی وحدت و مرکزیّت ختم ہو چکی ہے، مُغلیہ دورِ حکومت کا آفتاب ڈھل چکا ہے، ان کا اقتدار چراغِ سحری ہے، جو بجھا چاہتا ہے، انگریز برق رفتاری سے پورے ہندوستان پر قبضہ اور حُکمرانی کے خواب دیکھ رہا ہے، مسلمان اُمراء دولت اور اعضاء و جوارحِ سلطنت اپنے ذاتی اقتدار، ذاتی مفاد اور خود غرضی کے دلدل میں ایسے پھنس چکے ہیں کہ اب انہیں یہاں سے نکالنا اور سیاسی سنبھالا دینا دشوار بلکہ ناممکن نظر آتا ہے، اِدھر دینی طور پر بھی مسلمان انتہائی تنزّل و انحطاط کی نذر ہو چکے تھے، توہّم پرستی، شرک و بدعت اور غیر اسلامی رسم و رواج ان میں گھر کر چکے تھے، توحید و سُنّت سے گریز اور شخصیّت پرستی ان کا وظیفۂ حیات بن چکا تھا، جاہل مولوی اور جاہل پیران پر مسلّط تھے، علمی و فکری طور پر یہ بالکل تہی کیسہ بلکہ یتیم ہو چکے تھے، الحاد اور بے دینی کو دین سمجھے ہوئے تھے، اخلاقی بیماریاں اُن پر مستزاد تھیں، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ حق پسندی اور حق گوئی کی یہ پوری قوّت سے شدید مخالفت کر رہے تھے، ظاہر ہے کہ ایسے دینی و سیاسی گھٹا ٹوپ اندھیروں میں حضرت شاہ ولی اللہ جیسی حسّاس اور درد دل رکھنے والی شخصیّت بھلا کب خاموش بیٹھ سکتی تھی؛ چنانچہ حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اپنی پوری قوّت سے بے شمار مشکلات کے باوجود ان کو علمی و فکری سنبھالا دینے کی مساعی کا آغاز فرمایا، ان کے قلمِ معجز رقم سے نہایت قیمتی محقّقانہ اور انقلابی تصانیف منظرِ عام پر آئیں یوں شاہ صاحب نے ایک نئے علمی و فکری انقلاب کی طرح ڈالی، جس کی مزید تکمیل ان کے واجب الاحترام فرزندانِ ارجمند حضرت شاہ عبد القادر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد الغنی، اور شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے فرمائی، اس انقلاب کو علمی جامہ پہناتے ہوئے شیرِ اسلام حضرت شاہ ۔ "مُحَمَّدْ اِسْمَاعِیْلْ" ۔ شہید اور مجدّد و مجاہدِ اعظم امیر المومنین حضرت سید "اَحْمَدْ"

شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خونِ مقدس سے بالاکوٹ کی وادی کو لالہ زار بنا دیا اور صفحۂ عالم پر اپنے ایثار و قربانی کے غیر فانی اور لازوال نقوش ثبت کر دیئے۔! ع

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق!

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما!

۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز چہار شنبہ (بدھ) کو سانحۂ "بالاکوٹ" کے بعد تحریکِ مجاہدین کی عملی قیادت علمائے صادق پور۔ پٹنہ۔ بہار بالخصوص مولانا ولایت علی مرحوم اور اُن کے جانشین مولانا عبداللہ، مولانا رحمۃ اللہ، مولانا نعمۃ اللہ، مولانا عبدالرحیم، مولانا احمد اللہ، مولانا محمد جعفر تھانیسری، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، مولانا محمد بشیر لاہوری، مولانا محمد علی قصوری ایم۔اے کینٹب رحمۃ اللہ علیہم کے ہاتھوں میں چلی گئی، راقم الحروف کے والد جناب حاجی۔ "نور محمد"۔ مرحوم، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ولی محمد فتوحی والے بھی اس تحریک سے وابستہ رہے، یہ لوگ عُسر و یُسر کی حالت میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمیشہ مستعد رہے، انگریز؟ جس کی سلطنت پر آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، ڈیڑھ صدی تک شریحِ مسکون پر داد حکم رانی دینے کے باوجود مٹھی بھر حق پسندوں اور مجاہدوں کی اس جماعت کو ختم نہ کر سکا، آج بھی اس قافلۂ حریّت کے میرِ کارواں حضرت صوفی۔ "عبداللہ"۔ صاحب مہتمم دارالعلوم اہلِ حدیث اوڈاں والا ضلع لائل پور کو دیکھا جا سکتا ہے،

۴ —— ● اب انگریز ہر طرف سے مطمئن ہو کر اپنے رسوائے زمانہ ضابطۂ سیاست "پھوٹ ڈالو حکومت کرو" کے ماتحت پوری دغا بازی اور عیاری و مکّاری سے ہندوستان کے قریباً اکثر حصّوں پر قابض ہو چکا تھا، اُدھر مجاہدینِ وطن اور محبّانِ آزادی کا اضطراب برابر بڑھ رہا تھا، فرنگی کے خلاف نفرت و بیزاری کے جذبات تیزی سے اُبھر رہے تھے، جذبۂ حریّت و استخلاصِ وطن کے احساسات و جذبات کا طوفان اُن کے سینوں میں موجزن تھا، عوام میں انگریز کے خلاف مسلّح انقلاب کا لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا جو بالآخر ۱۸۵۷ء میں پھٹ پڑا اور سارے ملک میں آزادی کی مسلّح تحریک چل نکلی، علمائے کرام اور دیگر مجاہدینِ وطن بلا امتیازِ مذہب و ملّت پورے شعور و اطمینان، عزم و ہمت اور صبر و استقامت کے

ساتھ صف آرا ہو کر انگریز کے خلاف مصروفِ جہاد ہو گئے، اگر ملّت کے غدّاروں اور وطن فروشوں کی سازشیں اور جفا کاریاں نیز محبّانِ آزادی میں باہمی نظم و ضبط کا فقدان جیسی چیزیں آڑے نہ آتیں تو ہندوستان بھر سے فرنگی سامراج کا ٹاٹ یقیناً اُسی وقت لپیٹ کر رکھ دیا جاتا اور ملک انگریز کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی کی نحوستوں سے بال بال بچ جاتا —— حکیم احسن اللہ خاں، رجب علی، غلام مرتضیٰ والد مرزا غلام احمد کادیانی متنبّی کادیان ایسے ذلیل غداروں کی بدولت جنگِ آزادی کا یہ آخری وار ناکام ہو گیا، فرنگی سامراج اور اس کے ازلی و ابدی کاسہ لیسوں نے اس جہاد کا نام۔ "غدر"۔ (انگریزی حکومت سے بے وفائی) رکھا، حالانکہ یہ تحریکِ آزادی کی ایک بھرپور اور شدید انگڑائی تھی، غدر قطعاً نہ تھا، ڈاکوؤں، لٹیروں اور بدمعاشوں کو ملک سے نکالنے کی تحریک کو غدر کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔!

۵ —— ● مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار۔ "سراج الدین بہادر شاہ ظفر"۔ مرحوم کے بیٹوں کو فرنگی ظالم نے وحشت و بربریت اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذبح کر ڈالا، بہادر شاہ ظفر کو اونٹ کی ننگی پیٹھ پر پابجولاں بٹھا کر رنگون (برما) کے طویل سفر پر بھیجا جا چکا تھا، عروس البلاد دہلی اُجڑ چکی تھی، شاہراہِ اعظم کے اُونچے اُونچے درختوں کے تنے مجاہدینِ وطن و محبّانِ آزادی کے لیے تختۂ دار بنائے جا چکے تھے، سقوطِ ہندوستان اور سقوطِ دہلی کا حادثہ اسلامیانِ عالم بالخصوص مسلمانانِ ہندوستان کے لیے سقوطِ بغداد اور سقوطِ اندلس (ہسپانیہ) سے کم نہ تھا، پورے ملک پر خوفناک سنّاٹا طاری تھا —— فرنگی سامراج نے چوں کہ اقتدار ہندی مسلمانوں سے چھینا تھا اُسے ہر وقت مسلمانوں کے اُٹھ کھڑے ہونے کا خطرہ لاحق تھا، اس لیے اُن کے وحشیانہ مظالم کا تختۂ مشق بھی مسلمان ہی تھے، فرنگی شاطر نے اپنے مظالم کا دوسرا بڑا نشانہ علمائے کرام کو بنایا چنانچہ کتنے ہی علماء کو پابہ زنجیر دریائے شور (کالا پانی) عبور کرا کے جزائر انڈیمان میں قید کیا گیا، بے شمار علماء اِس گناہِ بے گناہی کے جُرم میں تختۂ دار پر کھینچ دیئے گئے، بہت سُوں کو انبالا سازش اور قاضی کوٹ سازش کے نام پر فرضی مقدمات تیار کر کے حبسِ دوام کی سزائیں دی گئیں لیکن کیفیت یہ تھی کہ ع

بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد!

وہ نشۂ آزادی سے سرشار ہو کر ہر تعذیب و عقوبت پر مسکراتے رہے تھے، قید و بند، کالا پانی، عبورِ دریائے شور، حبسِ دوام، تختۂ دار، قتل و نہب، جائداد کی ضبطی، کوئی بھی فرعونیت اُن کو جادۂ حق سے نہ ہٹا سکی۔!

٥ ———● اب ہندوستان پر انگریز بلا شرکتِ غیرے حکمران تھے، شیخ المشائخ حضرۃ مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی، مولانا شاہ محمد اسحاق، مولانا شاہ محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہم بھی ہجرت کر کے مکّہ مکرمہ جا چکے تھے، حضرۃ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا احمد علی محدّث سہارن پوری، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا سیّد نذیر حسین محدّث دہلوی، مولانا نواب سیّد صدیق حسن خاں، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا سیّد عبداللہ غزنوی، مولانا محمد ابراہیم آروی، مولانا حافظ محمد لکھوی، مولانا حافظ عبدالمنّان وزیر آبادی، شیخ الہند حضرۃ مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا اور مولانا محمد بشیر سہسوانی رحمۃ اللہ علیہم حالات و ظروف کے مطابق مختلف مقامات پر علم کی مسندیں بچھا کر بیٹھ گئے اور پوری خاموشی، سکون اور یک جہتی سے دینی علوم کی تدریس شروع کر دی، اسی طرح بعض دیگر ہمدردانِ ملّت نے چند نظری اختلافات کے باوجود جدید دُنیاوی تعلیم گاہوں کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی تدابیر پر عمل پیرا ہوئے۔

٦ ———● اُنیسویں[19] صدی کے اختتام اور بیسویں[20] صدی کے آغاز پر ملک میں آزادیٔ استقلال کے لیے آئینی تحریکیں شروع ہو گئیں اور مختلف جماعتوں کا قیام عمل میں آگیا، اسی طرح ملّت کے دیگر علمی، ادبی، تبلیغی، تصنیفی، اصلاحی، قومی اور سیاسی محاذوں پر علمائے کرام کی خاصی بڑی تعداد مصروفِ عمل ہو گئی، اس سلسلہ میں حضرۃ مولانا فضلِ الرحمٰن گنج مراد آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سیّد عبدالحی ندوی، علامہ شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد سعید بنارسی، مولانا عصمۃ اللہ جے راج پوری، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سیّد عبدالجبّار غزنوی، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا سیّد عبدالواحد غزنوی، علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری، حضرۃ علامہ محمد انور شاہ کشمیری، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا عبدالسلام مبارک پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد جوناگڑھی، علامہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا شمس الحق ڈیانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی،

علامہ ابوالقاسم بنارسی، علامہ نواب محسن الانصاری یمنی، مولانا مفتی کفایۃ اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سیّد حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی، مولانا عبداللہ الباقی، مولانا عبداللہ الکافی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کی علمی، دینی، تبلیغی، اِصلاحی، سماجی، قومی، سیاسی، تصنیفی، تدریسی، ادبی اور تحقیقی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

٧ ———● اُنیسویں صدی کے اختتام پر انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل ایک سماجی اور اصلاحی جماعت کے بھیس میں عمل میں آ چکی تھی، جو بہت جلد ایک زبردست اور فعّال سیاسی جماعت کی صورۃ اختیار کر گئی، بیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں۔ "ڈھاکہ"۔ مشرقی پاکستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام بھی عمل میں آ چکا تھا جو اس وقت صرف نوابوں اور رئیس زادوں کی جماعت تھی اور اِن مسلم رؤسا اور جاگیرداروں کے حقوق کے تحفّظ کے لیے عالمِ وجود میں آئی تھی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد مسلم لیگ بھی ایک عوامی اور سیاسی جماعت بن گئی۔ اب غیر مسلم لیڈروں کے پہلو بہ پہلو امام الہند حضرۃ مولانا ابوالکلام آزاد۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرۃ موہانی، مولانا ظفر علی خاں، حکیم حافظ محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا مفتی کفایۃ اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی اور مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی سیاسیات میں بھرپور حصّہ لے رہے تھے، اور ان کی انقلابی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا ——— مولانا ابوالکلام آزاد کے "اَلْہِلَال"۔ و "اَلْبَلَاغ"۔ نے، مولانا محمد علی جوہر کے۔ "کامریڈ"۔ اور۔ "ہمدرد"۔ نے اور مولانا ظفر علی خاں کے۔ "زمیندار"۔ نے زوردار مقالات و مضامین کے ذریعہ مسلمانوں میں صُورِ بیداری پھونکا اور اُنہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے سلسلہ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے، جنہیں مؤرّخ کا قلم کبھی فراموش نہیں کر سکتا، اسی طرح علامہ اقبال مرحوم کے کلام اور تصنیفات نے نوجوانانِ ملّت کی بیداری میں مہمیز کا کام دیا" یہ اعاظمِ رجالِ عبقریِٔ زمانہ اور نوابغِ عصر حضرات بذاتِ خود ایک انجمن اور چلتے پھرتے ادارے تھے، ان کے خارا شگاف قلم کی معجز نمائیوں، ادیبانہ دلآویزیوں، خطیبانہ سحر طرازیوں، عالمانہ وجاہتوں اور مجاہدانہ جلالتوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جھنجوڑا اور خوئے غلامی کو توڑا ان میں مطالبۂ آزادی کا عزم و حوصلہ پیدا کیا، اُن کو اپنے اصل مقام سے روشناس کیا

اور اُن میں اُن کے شاندار ماضی اور عظمتِ رفتہ کو واپس لانے کے جذبات اُبھارے، اِن اکابر کی مُخلصانہ مساعی کا یہ ردِّ عمل ہوا کہ مُسلمانوں نے انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آزادیٔ وطن کا مطالبہ کیا اور جہادِ حُرّیّت میں شریک ہو گئے۔

۸ —— ۱۹۱۴ء میں اُفقِ عالم پر جنگِ عظیم اوّل کے مُہیب بادل چھا گئے، فرنگی غاصب نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اکثر مُسلم زُعماء کو پابندِ سلاسل کر دیا، انگریز نے جو جُوع الارض کا مریض تھا اپنی شاطرانہ چالوں سے جرمنی کے ساتھ ساتھ خلافتِ عثمانیہ (ترکی) کو بھی جنگ میں اُلجھا لیا اور شرقِ اوسط بالخصوص عرب ممالک کو ترکی خلافت سے کاٹ کر اُن کے تیل، پٹرول اور جنگی محلِ وقوع کے پیشِ نظر اُن پر خود قابض ہونے کے ناپاک منصوبے بنائے اور ذلیل سازشیں شروع کر دیں، حتّٰی کہ خاتمہ جنگ تک ترکی سلطنت کے حصّے بخرے کر کے متعدّد ممالکِ عرب پر ظالمانہ تسلّط جما لیا۔

۹ —— ۱۹۱۹ء میں جنرل ڈائر نے امرتسر کے جلیانوالا باغ میں ایک خوفناک خونی ڈرامہ کھیلا، بربریّت و بہیمیّت کا مُظاہرہ کرتے ہوئے چشم زدن میں مادرِ ہند کے ہزاروں بہادر سپُوتوں کو اپنی خون آشامیوں کا نشانہ بنایا اور گولیوں کی باڑ سے ان کے سینے چھلنی کر ڈالے، پنجاب مرحوم میں مارشل لاء نافذ کر کے دار و گیر کی ایک ہیبت ناک فضاء قائم کر دی، اس وقت اکثر مسلم اکابر اور عمائد جیلوں میں محبوس تھے، مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم نے لکھنؤ میں جرأت کر کے ہندوستان بھر سے مسلم زعماء اور علمائے کرام کو مدعو کر کے خلافتِ عثمانیہ کے تحفّظ و بقاء کی تدابیر و تجاویز پر غور کرنے کی طرح ڈالی، اسی مقصد کے لیے ہندوستان میں ایک زوردار تحریک چلانے کے عزم کا اظہار کیا، چنانچہ مُسلمانانِ پنجاب کی طرف سے مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی مرحومین، ملک لعل خاں اور آغا صفدر سیالکوٹی مرحوم اِس میں شامل ہوئے، اسی وقت "آل انڈیا مجلسِ خلافت" قائم کر کے نئی آئینی سیاسی جدّوجُہد کا آغاز کر دیا گیا، مجلسِ خلافت پنجاب کے پہلے صدر مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم مُنتخب ہوئے، حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی مرحوم کی تحریک اور کوشش سے حضرت امیرِ شریعت سیّد عطاء اللّٰہ شاہ بخاری رحمۃ اللّٰہ علیہ اور غازی عبدالرحمان امرتسری بھی تحریک میں

شامل ہو گئے۔ مسٹر گاندھی اور دوسرے ہندوؤں نے مسلمانوں سے کامل اشتراک کیا، لیکن۔ لالہ لاجپت رائے قسم کے متعصّب ہندو لیڈروں نے ہندو مسلم کے اس اتّحاد کو فرنگی شاطر کے ایماء سے پارہ پارہ کرنے کی ناپاک کوششیں شروع کر دیں، دو قومی اختلافات کے سُوال کو خوب ہوا دی، تا کہ ملک میں ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو کر فسادات شروع ہو جائیں اور موجودہ خوش گوار فضاء غارت ہو کر رہ جائے، نہرو رپورٹ نے کانگریس بالخصوص ہندو کی اصل ذہنیّت کو بالکل بے نقاب کر دیا، اور بعض کانگریسی ہندو لیڈروں نے متعصّب ہندو جماعتوں کی کھلم کھلا سرپرستی اور حوصلہ افزائی شروع کر دی، اس سے حسّاس اور مخلص بزرگوں کو شدید صدمہ پہنچا، ایسے سنگین اور نازک حالات میں ایک اولوالعزم، بہادر، مخلص، خالص عوامی اور اسلامی جماعت کی ضرورت شدّت سے محسوس ہونے لگی، تا کہ غیر مسلم جماعتوں کی زبردستیوں اور جارحانہ تحریکات کا ضروری سدّباب اور مستقل مُحاذ پر انگریز کا مردانہ وار مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ جماعت ملکی سیاسیات کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کے نفاذ اور حکومتِ الہٰیّہ کے قیام کی علم بردار ہو جو پوری قوّت، جرأت، اور استقلال کے ساتھ آزادیٔ وطن کی جنگ لڑ سکے، چنانچہ اسی غرض سے ۱۹۲۹ء میں مُسلم بہادروں، اُولوالعزم مجاہدوں، سربکف جان بازوں، عظیم الشان شجاعوں اور عظیم محبّ وطن انسانوں کی جماعت "مجلسِ احرارِ اسلام ہند" کے نام سے عالمِ وجود میں آئی، اس کے اوّلین بانیوں میں چودھری افضل حقؒ، مولانا حبیب الرحمٰنؒ لدھیانوی، مولانا ظفر علی خاںؒ، مولانا سیّد عطاء اللّٰہ شاہ بخاریؒ، غازی عبدالرحمٰنؒ امرتسری، ———— جناب شیخ حسام الدینؒ اور جناب مولوی مظہر علی اظہر شامل تھے، راقم الحروف بھی تاسیسِ جماعت سے ہی ابتلاء آزمائش اور ہر تنگی و آسانی میں مجلسِ احرارِ اسلام سے وابستہ رہا ہے اور بحمداللّٰہ اب بھی اہلِ حق کے اسی جاں باز گروہ کا حامی اور خادم ہے!

۹ —— مجلسِ احرارِ اسلام ہند کا قیام عمل میں کیوں آیا؟ اس کے اسباب، وجوہ کیا تھے اور پس منظر کیا تھا؟ اُس کے اُصول اور مقاصد کیا تھے؟ اُس کی تنظیم کیسی تھی؟ اُس کے کارکنوں کے کیا اوصاف و خصوصیات تھے؟ مجلسِ احرار کے قیام سے مُلک خصوصاً پنجاب میں کیا ردِّ عمل ہوا؟

اور سیاسی قبرستانوں میں اس نے حق کی اذانیں کس طرح بلند کیں؟ اُس کی سیاسی، سماجی اور تبلیغی خدمات کا دائرہ کتنا وسیع تھا؟ اس کے ہمہ جہتہ قومی اور اسلامی کارناموں کی تفصیل کیا ہے؟ کشمیر ایجی ٹیشن، مغل پورہ ایجی ٹیشن، کپورتھلا ایجی ٹیشن، تحریک شہید گنج، تحریک مدحِ صحابہ، فوجی بھرتی بائیکاٹ وغیرہ میں اُس کا کیا کردار رہا؟ اُس کے جیوش کی شان و شوکت کا کیا عالم ہوتا تھا؟ احرار کی تبلیغی و سیاسی کانفرنسیں اور قومی اجتماعات کس قسم کے ہوتے تھے؟ انگریز نے اِس پر کیا مظالم ڈھائے؟ ٹوڈی مسلمانوں، انگریز کے کاسہ لیس رئیسوں اور غاصب جاگیرداروں نے اِس سے کیا سلوک روا رکھا؟ کادیان کی لندن ساختہ نبوۃ کا ذِبہ کا تار و پود بکھیرنے اور اس کے بخیے اُدھیڑنے میں اس کا کیا طرز تھا؟ اور مرزائی ڈاکوؤں کے تعاقب میں اُس کا طریقِ کار کیا تھا؟ اِس نے مسئلہ ختمِ نبوۃ کا دفاع اور عقیدۂ ختمِ نبوۃ کا تحفظ کس انداز میں کیا؟ —— نیز زعماء اور کارکنوں کے سوانحی خاکے اور دیگر پوری تفصیلات "تاریخ احرار" کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، کہ جن کا اجمال اور خلاصہ مفکرِ احرار رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے مشکل وقت میں قلم بند کر کے ایک اہم فرض ادا کیا تھا۔ لیکن تفصیلات اور دوسرا تمام جماعتی لٹریچر عرصہ دراز سے زاویۂ خمول میں پڑا تھا، حقیقۃ یہ ہے کہ پاسبانِ ختمِ نبوۃ حضرۃ امیر شریعۃ مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین و فرزندِ اکبر حضرۃ مولانا حافظ سیّد ابو معاویہ ابوذر عطاء المنعم بخاری ناظمِ اعلیٰ مجلس احرارِ اسلام پاکستان نے مجلس کی تنظیمِ جدید کے بعد تاریخ احرار اور دوسرے جماعتی لٹریچر کی نئی اشاعۃ کا اہتمام کر کے اِسلامیانِ برِّصغیر بالخصوص احرار حلقوں پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے، اِس ضمن میں حافظ صاحب کے متعدد عظیم الشان علمی و تحقیقی شاہکاروں کی اشاعۃ سے بھی انشاء اللہ جماعتی تاریخ اور تحریکِ آزادی کے نہایۃ قیمتی باب ہمیشہ کے لیے محفوظ و مصئون ہو جائیں گے۔ سیّد ابو معاویہ یقیناً ہم سب کے شکریہ کے حق دار ہیں، جن کی علمی و ادبی کاوشوں اور جماعۃ کے لیے تقریری و تحریری خدمات سے ملک کا اہل علم طبقہ عظیم استفادہ کر سکے گا، حافظ صاحب موصوف اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِأَبِيْهِ (بیٹا باپ کے رازِ دل کا امین ہوتا ہے) کے عظیم مظہر

ہیں، اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو فصاحۃ و بلاغۃ، تقریر و خطابۃ، حق گوئی و حق پسندی، راستبازی و بے باکی، جرأت و حوصلہ مندی، اِستقامۃ و عزیمۃ اور صبر و ثبات کی بے بہا دولۃ سے نوازا اور سرفراز فرمایا ہے۔ قسّامِ ازل نے موصوف کو تصنیف و تالیف کے پختہ ذوق کا سرمایہ بھی پوری فیاضی سے عطا فرمایا ہے، ان کے ادیبانہ قلم کی جولانیاں قاری کو متأثّر کیے بغیر نہیں چھوڑتیں۔

قصّہ مختصر زیرِ نظر کتاب بہ وقتِ تصنیف نامُساعِد حالات کی وجہ سے گو اپنے موضوع کا اِحاطہ نہیں کر سکی اور بعد ازاں اُس کے مُصنّفِ گرامی قدر جناب مفکّرِ احرار امیر افضل حق رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے باعث مکمّل صورۃ بھی اختیار نہ کر سکی۔ تاہم موجودہ حالات میں جبکہ مختلف قومی اور سیاسی حوادث و آفات نے جماعۃ کے دفتری نظام اور شعبہ تصنیف و اشاعۃ کو مُعطّل کر دیا تھا یہ کتاب رفقائے جماعۃ کے لیے ماضی کا عظیم ورثہ، حال کے لیے دلیلِ راہ، خصوصاً نوجوان نسل کے لیے احرار کے اِخلاص و ایثار، عزم و عمل، صبر و ثبات، جہاد و قربانی اور شوقِ شہادت کے ایمان افروز مناظر سے رنگین تاریخ کے ساتھ تعارف و رُوشناسی اور مستقبل میں خالص اسلامی قیادۃ و رہنُمائی کا الہامی صحیفہ ثابت ہوگی نیز برّصغیر ہند و پاک کی مختلف سیاسی و دینی تحریکوں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے اس کا مطالعہ بیش از بیش مفید ہوگا۔ والسلام۔ وآخِرُ دعوٰنا اَنِ الحمدُ للہِ ربِّ العٰلمین ؂

عُبید اللہ احرار

لائل پور

بروز شنبہ | ۱۷ / ۱۱ / ۱۳۸۷ھ
۱۷ / ۲ / ۱۹۶۸ء

مُفکرِ احرار

رحمۃ اللہ علیہ

جہاں "افضل" کو پڑھ کے "انور" یہ راز سمجھا دماغ میرا

زعیمِ فطرت شکار بھی تھا، ادیب جادو نگار بھی تھا



دل و جگر کی حرارتوں میں حرارتِ قلب و زندگی تھی!

فقیرِ عالی وقار بھی تھا، غریب کا غم گسار بھی تھا!



(علامہ انور صابری)

"مَعنُون"

یہ تاریخ میں اُن احرار شہداء اور خاموش کارکنوں کے نام مَعنُون کرتا ہوں جنہوں نے اپنی زندگی کو جماعت احرار کے لیے مٹی میں ملا کر مٹی کر دیا لیکن کبھی نام و نمود کی خواہش نہ کی۔ جماعت کے لیے جل کر راکھ ہو جانے والے نوجوانو! تمہاری کیا ہی بات ہے ہم نے تمہاری گمنامی سے ناموری حاصل کی بخدا تم ہی خدا کے حضور میں نامور ہو در اصل ہم گمنام ہیں!



بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ حال

فرشتہ خصلت غریب پر قیامت گزر جائے کوئی نہیں پوچھتا۔ شیطان سیرت امیر کے سر درد کی خبر پا کر لوگ پیٹ پکڑے آتے ہیں اور گھر بیٹھے بھی پیر شہید مناتے ہیں۔ یہی حال سرمایہ دار اور غریب جماعتوں کا ہے۔ مجلس احرار قربانی کے کارناموں کی زندہ تاریخ ہے۔ مگر مفلس کا ایثار سرمایہ دار دنیا میں بے توقیر ہے۔ سردیوں کی چاندنی رات اور جنگل کے شگفتہ پھول کی طرح اس پر نگاہ ڈالنے کی کسی کو فرصت کہاں؟ لیکن جنگل کا پھول اور سردیوں کی چاندنی رات ذوقِ نظارہ کے لیے کم دعوت نہیں۔ مجلس احرار کو دنیا ہزار نظر انداز کرے۔ مگر اس کی جاذب تاریخ کو پڑھ کر ہر شخص مرحبا کہنے پر مجبور ہوگا۔ میں ایسی پریشان حالی میں اس کو لکھنے بیٹھا ہوں کہ مضمون کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکا۔ مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر بعض حصے تشنۂ تکمیل ہیں۔ قانون کی تلوار گردن کے بہت قریب لٹک رہی ہے۔ ایسے حال میں اسی تحفے کو دوست کی طرح قبول فرمائیں۔ بعض ضروری افراد اور احباب کا ذکر رہ گیا ہے اور بعض واقعات نظر انداز ہو گئے ہیں۔ ذرا حالات پُرسکون ہو لیں تو شاید جماعت کا کوئی اور دوست یا خود میں ہی فرصت پاؤں تو کبھی تکمیل کی کوشش ہو جائے۔ جماعتی ریزولیوشن بطور ضمیمہ شامل کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر کاغذ سونے کے تول بکنے لگا ہے۔ حجم بڑھ گیا تو اشاعت اور خریدو دونوں مہنگے سودے ہوں گے۔

زبان کو جہاں تک ہو سکا سادہ رکھا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوا قانون سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سنسر شدہ حصوں کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ اس لیے بعض جگہ سے عبارت بے ربط سی ہو گئی ہے۔ ربط پیدا کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تاکہ حکومت کو کوئی اعتراض باقی نہ رہے۔ جماعت کے لیے جماعتی تاریخ بے حد

ضروری ہے تاکہ گزشتہ تجربوں کی روشنی میں آئندہ کے کام کو درست طور سے کیا جائے۔

لوگوں کی سننے چاہیے کہ احرار کا پروگرام ہمیں سمجھ نہیں آتا پوچھو کہ انہیں کس جماعت کا پروگرام سمجھ میں آتا ہے؟ لیگ کا کوئی نصب العین معین نہیں پاکستان ابھی تک شرمندہ معنی ہے۔ یہ سکیم اور پاکستان کا نقشہ ابھی بطن شاعر ہی میں ہے۔ جناح پاکستان کی رٹ لگاتے ہیں۔ سر سکندر تحریک پاکستان کو شرانگیز قرار دیتے ہیں۔ عجب اودھم مچا ہوا ہے۔ یہی ذہنی طوائف الملوکی کانگرس میں موجود ہے۔ اس کے سوراج کی کوئی سکیم مرتب نہیں جس کا جو جی آئے ہانکتا ہے۔ ہاں ایک مذہبی سے گروہ کی وہاں حکمرانی ہے۔ ۹ کروڑ مسلمانوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کانگریس کا پونا ریزولیوشن ڈومی نین سٹیٹس سے بھی کم درجہ قبول کرنے پر آمادہ ہے۔ کیا ہندوستان کا معاملہ بچوں کا کھیل ہے؟ دنیا میں سب سے زیادہ دشوار مسئلہ ہندوستان کے امن و آزادی کا مسئلہ ہے۔ احرار ہی ایک ایسی انقلابی جماعت ہے۔ جو کسی یقین کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ ہمارا جماعتی نعرہ یہ ہے کہ "ملک آزاد ہو جس میں غریب آسودہ ہوں"۔ اقتصادی مساوات کے بغیر آزادی بے معنی چیز ہے۔ وہ چند سرمایہ داروں کی آزادی ہے۔ جہاں امیر قانون پر حکومت کرتا ہے اور جہاں قانون غریب کو چکی میں پیستا ہے۔ پس احرار ایسی آزادی کے تصور کے دشمن ہیں۔ اس سلسلے میں احرار قائدین کے خطبات کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں :

اقتباسِ خطبۂ استقبالیہ

مولانا مظہر علی اظہر

احرار کانفرنس ۱۹۳۱ء لاہور

"ہندوستان کے مدعیانِ قوم پرستی کو ابھی تک یہ سبق پڑھانے جانے کی ضرورت ہے کہ "دنیا امیروں کی جولان گاہ نہیں اس میں غریبوں کا بھی حصہ ہے"۔ بلکہ اگر حق رائے دہی اور نظام حکومت کی ضرورت ہے۔ تو غریبوں کو۔ امیر تو خود اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اپنے لیے حفظان صحت کا انتظام کر سکتے ہیں۔ جائداد کی حفاظت کے لیے پہرہ دار مقرر کر سکتے ہیں۔ اپنی اولاد کو تعلیم دے سکتے ہیں۔ لیکن غریب ہی ہیں جنھیں نہ آج تک تعلیم دی گئی۔ نہ اُن کے لیے حفظانِ صحت کا بندوبست کیا گیا۔ نہ ان کی روزمرہ زندگی ہی انسانوں کی زندگی کہلا سکتی ہے۔ بلکہ امیروں کے اکثر کتّے لاکھوں اور کروڑوں غریب انسانوں سے بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اگر ایسی نظامِ حکومت کو قائم رکھنا ہے جو سرمایہ داری کی تمنا اپنے اندر رکھتا ہے اور غریب کو کچل کچل کر امیر کو مالا مال کرنے میں منہمک ہے تو برطانوی کانگریس اور ہم کچھ عرصہ تک یقیناً ابھی غریبوں کو خاموش رکھ سکیں گے اور ہندو اور سکھ سرمایہ پرستی اسی اُمید پر ادھار کھائے بیٹھی ہے۔ مگر نوعِ انسانی کے غریب لیکن محنت کش افراد ہمیشہ کے لیے قعرِ مذلت میں نہیں رہ سکتے اگرچہ پنجاب میں غریب طبقہ میں مسلمانوں کی نمائندگی زیادہ ہے تو باقی صوبوں میں غریب ہندوؤں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے قوم کے بہترین افراد کو جو شب و روز محنت کرتے ہیں اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے بھی اکثر محروم رکھے جاتے ہیں جنہیں نہ گرمی میں شملہ، ڈلہوزی اور مری کی ٹھنڈی ہوائیں نصیب ہوتی ہیں۔ نہ سردی میں دہکتی ہوئی انگیٹھیوں کے آگے بیٹھنا مل سکتا ہے۔ نہ باد و باراں کے موسم میں ہی کہیں سر چھپا کر بیٹھنے ہی کی توفیق ہوتی ہے۔ انہیں ہمیشہ اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنا انہیں شرف انسانیت سے محروم رکھنا۔ احسن تقویم میں خلق کی ہوئی دنیا کو اسفلِ سافلین میں رہنے پر مجبور کرنا بالآخر آج کل کے سرمایہ دار لور فوقیت یافتہ

طبقہ کے لیے ہی نہ صرف خطرناک، بلکہ مہلک ثابت ہوگا۔ آج وقت ہے کہ قوم کے ہر طبقہ کو فراخ حوصلگی سے مواقع ترقی دیئے جائیں۔ غریبوں، کمزوروں، جاہلوں بلکہ گناہ گاروں کی خبر گیری کی جائے۔ تاکہ وہ آسانی سے خواصِ انسانی حاصل کر کے مادرِ وطن کے لیے زینت اور فخر کا باعث ہوں۔ لیکن اگر حکومت کی مشینری اس لیے چلائی جاتی ہے کہ غریب محنت کرے اور سرمایہ دار عیش اڑائے۔ مقروض کمائے اور قارض سب کچھ سود میں اڑا لے جائے۔ عوام الناس بیکار ہوں اور جرم وگناہ کی زندگی بسر کریں اور امراء و رؤسا انہیں سزا دینا ہی اپنا فرض سمجھیں۔ ان کی مشکلات کو حل کرنے کی دردسری اپنے ذمہ نہ لیں۔ تو جماعتی جنگ کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے گا۔

ہم اب بھی آزادئ وطن کے لیے تہِ دل سے کوشش کریں گے۔ لیکن ہماری کوششیں غریبوں، مفلسوں، محنت کشوں، مظلوموں اور ستم رسیدوں کی آزادی، خوشحالی اور فارغ البالی کے لیے ہونگی ہم نئی بادشاہتیں۔ نئے راج۔ نئی نوابیاں اور نئے ساہوکارے دیکھ کر خوش نہیں ہوسکتے۔ ہم خود دولت اور امیری کے دلدادہ نہیں۔ نہ ہم نہ امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنا ہمارا مقصد ہے۔ اس لیے جہاں ہم نے آج تک برطانوی مُلوکیّت اور سرمایہ داری کا ساتھ دینا ضعفِ ایمانی سمجھتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی سرمایہ داری کے ہاتھ میں کھیلنا بھی ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ اگر ہمارے سرمایہ دار بھائی ہمیں اپنے پھندے میں نہ پھنستا دیکھ کر جوشِ غضب میں آئیں تو ہم مردانہ وار مسکرا کر اپنی راہ چلتے جائیں گے"۔

اِقتباسِ خطبۂ صدارت

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

(رحمۃ اللہ علیہ)

"میرے نزدیک ہندوستان کی تمام مشکلات کا حل صرف ایک ہے کہ ہندوستان کے تمام سمجھ دار قوم پرست کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم کریں اور ہندوستان میں بجائے ایک سرمایہ دار حکومت کے غربا کی

حکومت قائم کریں۔ میں اگرچہ کانگریسی ہوں اور میں نے ہمیشہ کانگریس کے جھنڈے تلے کام کیا ہے۔ مگر مجھے اس کے کہنے میں پس وپیش نہیں ہے کہ کانگریس کی محنت اور قربانی کا نتیجہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان کی حکومت انگریزی سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے سرمایہ داروں کے ہاتھ دے دی جائے۔ بلکہ ڈومینین سٹیٹس کی شکل میں تو جو حکومت ہندوستان پر قائم ہوگی۔ اس میں ہندوستانی اور انگریز سرمایہ دار مل کر یہاں کے غربا کو کچلنے کی کوشش کریں گے"۔

اقتباسِ خطبۂ صدارت

صاحبزادہ فیض الحسن

"اسلام اور سوشلزم"

"لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ انسانی حرص وآز کی کارفرمائیوں نے اس تمدنی معاہدے اور اشتراکِ عمل کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تمدن کی خوشگوار فضا کو محشرستانِ فساد بنا دیا۔ پیداوار کی وہ تقسیم جو عام ہونی چاہیئے تھی۔ بعض افراد تک محدود ہوکر رہ گئی۔ سرمایہ محنت سے بازی لے گیا۔ قوت خرید کی غیر مساوی تقسیم مصیبت بن گئی۔ سوسائٹی عموماً دو طبقوں میں بٹ گئی۔ سرمایہ دار دائمی عزت اور تمام مسرت کا مالک بن گیا۔ اور مزدور اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی اور آلۂ کار بن کر رہ گیا۔ قومیں بھی اس مرض میں گرفتار ہوگئیں۔ جہاں افراد ایک دوسرے کے حقوق زندگی کو پامال کرنے لگے۔ وہاں قومیں بھی ایک دوسرے سے دست وگریباں ہونے لگیں۔

پیداوار کی غیر معتدل تقسیم ہی اس شر وفساد کا باعث ہے اور اس کا صحیح کنٹرول دنیائے انسانیت کی اس سب سے بڑی مصیبت کا علاج ہے۔ اس صحیح کنٹرول کو ہم دوسرے لفظوں میں مساوات کہہ سکتے ہیں۔ سوشلزم نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک نظریہ پیش کیا ہے جو میرے نزدیک کیپٹل ازم، فسطائیت وغیرہ رائج الوقت

نظریوں سے بہتر ہے لیکن ہنوز وہ سائنٹی فک حیثیت نہیں رکھتا کیوں کہ کتابوں اور پلیٹ فارموں پر تو اس کے محاسن بیان ہو چکے ہیں لیکن ہنوز عملی زندگی میں تجربہ کی کسوٹی پر اس کا پرکھنا باقی ہے۔"

اقتباس خطبۂ صدارت

شیخ حسام الدین بی۔اے

(رحمۃ اللہ علیہ)

"مسلمانوں کی اقتصادی پستی"

"حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ اقتصادیات میں آپ کا درجہ صفر کے قریب ہے۔ صرف پنجاب ہی میں مسلمان آبادی پر ڈیڑھ ارب کے قریب قرض ہے جس کا سود سولہ کروڑ سے زاید ہے۔ پس ایسی حالت میں جب کہ ایک قوم اتنے گراں بار قرض کے بوجھ سے دبی پڑی ہو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اقتصادی پہلو مستقبل قریب میں کوئی خوشگوار صورت اختیار کر سکتا ہے؟ کس طرح اس کے پنپنے کے وسائل پر کوئی لمحہ خرچ کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ خود اسی بوجھل زندگی کی بیڑیوں سے اس حد تک مانوس ہو چکی ہو۔ کہ بجائے اتار کے پھینک دینے کے وہ الٹی اس کو چھاتی سے لگائے ہوئے ہو؟ یاد رکھو اگر تمہارے یہی لیل و نہار ہیں اگر ذلت و گمنامی سے تمہیں اسی طرح انس و محبت رہے گی۔ اگر قرض کو اتارنے کی بجائے تمہارے روزانہ مشاغل اس کو بڑھانے والے رہیں گے تو پھر وہ دن دور نہیں کہ ہندوستان کی سونا اگلنے والی زمین تم پر اس حد تک تنگ ہو جائے کہ اپنی تمام دشمنوں کے باد... سر چھپانے کے لیے ایک چپہ بھر زمین بھی ایسی نہ رہے جسے تم اپنا کہہ سکو۔ شہروں کی آبادیاں جو کل تک مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں تھیں ایک ایک کر کے نکل رہی ہیں۔ جائیدادیں بک گئیں۔ زمینیں نیلام ہو گئیں۔ تجارت پر تمہارا قبضہ نہیں۔ کارخانوں میں مزدور کی حیثیت سے دوسروں کے محتاج۔ پس ایسے حالات میں سیاسی آزادی بھ...

من حیث الجماعت کوئی فائدے کی چیز ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا جس کو کہ ہم اس وقت بھی دیکھ رہے ہیں۔ کہ سرمایہ دار طاقتیں چند انسانوں کو خرید کر غریب و فاقہ پرست قوم پر من مانے طریق پر حکومت کریں گی جسے غریب نہایت سادہ لوحی سے نمائندہ حکومت کہے گا۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ جمہور جو قرض کے بوجھ سے دبا ہوا نہ ہو اس حد تک طاقتور ہوا کرتا ہے کہ اس کے نمائندے اس کو کبھی دھوکا دے کر مخالفین کے ہاتھوں میں فروخت نہیں کر سکتے۔ پس سیاسی آزادی قوموں کے لیے اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ اقتصادی آزادی سے قومیں مالا مال ہوں۔ میں حیران ہوں کہ میری قوم نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ اپنے گردوپیش کے حالات کی طرف توجہ نہیں دی[1]۔"

"پاکستان"

پاکستان کے متعلق ہر روز ہم سے ہماری پوزیشن پوچھی جاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایسے پاکستان کو ہم پلیدستان سمجھتے ہیں۔ جہاں خود غرضوں نے زر اندوزی کی قابلیت کو معیار قرار دے کر دوسروں کو ضروریات زندگی سے محروم کر دیا ہو۔ ایسے اکھنڈ ہندوستان کو پاکھنڈ ہندوستان سمجھتے ہیں جہاں سوسائٹی میں سیاسی اور اقتصادی نابرابری ہو اور غریب نان و نفقہ کے محتاج ہوں۔ اسلام سورۃ النحل کے مطابق کسب معاش کی مختلف قابلیتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن صحیح قابلیت کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھتا اور کسب معاش کی زیادہ استعداد رکھنے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ معذوروں اور کمزوروں کی طرف رزق لوٹا دیں۔ تاکہ سب برابر ہو جائیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسب معاش کی استعداد اور قابلیت کس میں تھی؟ مگر آپ کی اقتصادی زندگی کتاب کے اصول پر بسر ہوئی۔ یعنی کم از کم ضرورت کا سامان رکھ کر باقی سب قوم کی نذر ہوتا رہا۔ اگر مسلم لیگ کے پاکستان میں یہ دستور زندگی ہوگا ہر احرار اس کا حامی ہوگا۔ ورنہ پاکستان کا ہر سرمایہ دار مدعی سمجھ لے کہ اسلام کسی وطنی اور جغرافیائی تقسیم کا قائل نہیں۔ مسلمان کا وہی وطن ہے جہاں اس کا ضمیر آسودہ اور مطمئن ہو۔ نماز اور روزہ کی تو ہر کفرستان میں بھی اجازت ہے۔ باقی سیاسی اور اقتصادی پروگرام جو مذہب کا جزو لاینفک ہے کہاں ہے ایسا پاکستان جس میں مساواتِ اسلامی قائم ہو۔ مسلم اور غیر مسلم پر ظلم نہ ہو۔ بحیثیت انسان سب کو اقتصادی حقوق برابر

---

[1] یہاں تک خطبات کے اقتباسات ختم ہو گئے ہیں۔ ابوالمعاویہ ابوذر ۱۳

حاصل ہوں؟ جہاں مساوات نہیں وہاں پاکستان نہیں۔

پاکستان کا مدعی کہتا ہے کہ پاکستان میں مسلمان راج کرے گا۔ مگر بتاؤ وہ مسلمان کیسا ہو گا سود کو جائز سمجھنے والا؟ غریب کو بھوکا ننگا دیکھنے کے باوجود روپیہ کو بنک میں رکھنے والا؟ اپنی لڑکی کو خوشی سے غیروں کے حوالے کرنے والا؟ وکیلوں کی طرح جھوٹ تصنیف کر کے سرمایہ فراہم کرنے والا تو نہ ہو گا؟ اگر یوں ہو گا تو سوچو کس مسلمان کو ایسے راج سے دلچسپی ہو سکتی ہے؟ ہمیں اسلامی پروگرام کے باغی مگر نام نہاد مسلمانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اسلام کے باغی پاکستان سے ہم اس ہندو ہندوستان کو پسند کریں گے جہاں نماز روزہ کی اجازت کے ساتھ اسلام کے باقی عدل و انصاف کے پروگرام کے مطابق نظام حکومت ہو گا۔ یعنی ہر شخص کو صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی زندگی کی پیروی میں محض ضروریات زندگی مہیا کی جائیں گی اور کسی کو کسی دوسرے پر سیاسی یا اقتصادی فوقیت نہ ہو گی۔ جن لیگیوں اور کانگرسیوں کو سیاسی اور اقتصادی مساوات سے گھن آتی ہے۔ وہ سن لیں کہ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں نہ وطنی بھائی۔ وہ لٹیروں کا ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اور احرار کا ساتھ نہیں نبھ سکتا۔

سب کو علم ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کارل مارکس کی پیدائش سے ۵۸ سال پہلے فوت ہوئے۔ ان کے قول کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ امراء اور سلاطین کی لوٹ کھسوٹ سے عوام کو بچایا جائے۔ قیصر و کسریٰ کو اور ان کے سرمایہ دارانہ نظام اور امیرانہ رسم و رواج کو برباد کیا جائے اور لوگوں کو امتیازی زندگی بسر کرنے سے منع کیا جائے (حجۃ اللہ البالغہ ص۶۴)

گویا نظام اسلامی کو چلانا اور امراء اور سلاطین کی لوٹ کھسوٹ سے لوگوں کو بچانا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مشن تھا۔ پس اگر محمد علی جناح اسلام کے اقتصادی اور سیاسی نظام کے خلاف کسی سرمایہ داری کے نظام کو چلائے تو نفع کیا؟ اور اگر جواہر لعل اور گاندھی، خلفائے راشدین کی پیروی میں سوسائٹی میں نابرابری کے سارے نقوش کو مٹاتے چلے جائیں تو بطور مسلمان کے ہمیں نقصان کیا؟ پس پاکستانیوں سے احرار کہتے ہیں کہ تم اسلام کے سیاسی اور اقتصادی مساوات کے پروگرام کا یقین دلاؤ ہم تمہارے

ساتھ ہیں۔ جب کہ ۹۰ فیصدی ہندو اور سکھ تمہارے ساتھ ہوں گے۔ اسی طرح اکھنڈ ہندوستانیوں سے کہتے ہیں۔ پہلے تم بھی سیاسی اور اقتصادی برابری کا دعویٰ پیش کرو۔ ساٹھ فیصدی میں پچانوے فی صدی مسلمان ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ورنہ احرار کا صاف اعلان ہے کہ کانگرس اور لیگ کی موجودہ لڑائی کو ہم ملک کے لیے مبارک سمجھتے ہیں۔ تاکہ ان دو سرمایہ دارانہ نظاموں کی ٹکر میں غریبوں کا بھلا ہو۔

مجلس احرار کا ہر دستور عمل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرتب کیا جاتا ہے۔ اس لیے پاکستان کے مسئلے پر غور کرنے سے قبل ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ اسلام دنیا میں کسی قسم کی جغرافیائی تقسیم یا وطنوں کا تعین کرنے نہیں آیا۔ بلکہ اسلام ایک عالمگیر تحریک ہے جو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے۔ اسلام کی آمد کا مقصد ایک نظام حیات کی طرف دنیا کو دعوت دینا تھا اور اس طرح تمام دنیا کو ایک رشتۂ اخوت و مودت میں پرونا تھا۔ جب کبھی دنیا کے کسی حصے نے اسلام کے اس نظام کو اپنایا ہے اسلام نے اپنے دروازے اس پر وا کر دیئے ہیں اور جب کبھی کسی خطے میں اسلام کا بقا ناممکنات میں سے ہو گیا ہے اس خطے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے خواہ وہ مکّہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اسلام نے کبھی کسی علاقے کو مستقل طور پر نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ متروک علاقے کو اپنے قریب لانے کی اس علاقے سے باہر رہ کر پہلے سے زیادہ کوشش کی ہے۔ یعنی اسلام ملکوں کی کسی دائمی اور ناقابل تغیر تقسیم کا قائل نہیں۔ زمین کا جو ٹکڑا مشرف بہ اسلام ہوا وہ اسلامی عالمگیر برادری میں شامل ہو گیا۔ اور زمین کے باقی حصوں میں اسلام پھیلانے کی کوششیں کبھی ٹھنڈی نہیں پڑیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر اگر پاکستان کے مسئلے پر غور کیا جائے تو اس عقدہ کا جسے لاینحل سمجھا جا رہا ہے صحیح حل فوراً ذہن میں آ جاتا ہے۔

اسلام دنیا میں حکومت الٰہیہ اور خلافت ربانی قائم کرنا چاہتا ہے۔ جس کی بنیاد راستبازی، خوش اخلاقی اور عدل و انصاف پر ہو۔ اسلام کی آمد کا مقصد صرف یہی ایک ہے۔ اور اس کے سوا اسلام کا پیغام کچھ نہیں۔ جو شخص اسلام میں وطن کے جواز کے لیے جگہ ڈھونڈ رہا ہے وہ اپنی اس کوشش میں یقیناً ناکام رہے گا۔

مسلمانوں کے لیے حکومت الٰہیہ کا قیام اوّلین حیثیت رکھتا ہے اور رہنے سہنے کے لیے جگہ کی تلاش ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ حکومت الٰہیہ کا قیام مسلمان کی زندگی کا اولین مقصد ہے اور زمین کے کسی حصہ پر

رہنا اس مقصد کے لیے دنیا کے کسی حصّہ کو نہیں چھوڑ سکتے کہ وہاں ہمارے پڑھے لکھے آرام طلب نوجوانوں یا تعیّش پرست سرمایہ داروں کے لیے عزت کی جگہ نہیں۔ اگر ہم کسی خطہ کو چھوڑیں گے تو وہ بھی عارضی طور پر جیسا کہ مکہ کی ہجرت سے ظاہر ہے کہ حالات سازگار ہونے پر مسلمان واپس مکہ آ گئے تھے تو صرف اس لیے کہ وہاں حکومت الٰہیہ کا قیام ممکنات میں سے ہو گیا تھا۔

اسی اصول پر احرار کاربند ہیں۔ اور ہر مسلمان کو اسی پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ دنیا کے کسی حصّے میں حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے جب کبھی کوشش ہو گی۔ ہماری ہمدردیاں اور ہمارا دلی تعاون ان کوششوں کے ساتھ ہو گا اور ہم حتیٰ الامکان ان کوششوں میں شریک کار ہوں گے۔ خواہ یہ کوشش چین میں ہو یا پنجاب میں یا بنگال میں۔ یا کسی ایک شہر میں یا کسی ایک گاؤں میں۔ بلکہ کسی شہر کے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے محلے میں بھی اگر کسی وقت حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے کوشش کی گئی تو ہم یقیناً ان کوششوں کا ساتھ دیں گے۔ اور اگر ہماری کوششوں سے کسی چھوٹے سے قصبہ کی ایک چھوٹی سی گلی میں بھی حکومت الٰہیہ قائم ہو جائے تو ہم اسے اپنے لیے عاقبت میں سرخ روئی کا باعث سمجھیں گے۔

ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ پہلے یہ بتاؤ تم تقسیم ہند کے قائل ہو؟ ہم اس سوال کا جواب دینے سے قبل سائل سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا تم حکومت الٰہیہ کے قائل ہو؟ اگر وہ حکومت الٰہیہ کا قائل ہے اور اس کے لیے کوشش کرنے کو تیار ہے تو وہ جان لے کہ ہم ہندوستان تو ایک طرف رہا شہروں کی بھی تقسیم کے قائل ہیں تاکہ حکومت الٰہیہ کسی بھی جگہ قائم ہو سکے۔ اگر اس کے نزدیک تقسیم ہند اولین اور حکومت الٰہیہ کا قیام ثانوی حیثیت رکھتا ہے تو ہم اسے بتائے دیتے ہیں کہ ہمارا اور اس کا تعاون نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ وطن بنانا چاہتا ہے اور ہم وطنی تقسیم کے قائل نہیں۔ ہم تو صرف ایک ہی تقسیم کے قائل ہیں اور وہ ہے دولت کی منصفانہ تقسیم۔

مسٹر جان گنتھر اور احرار

دنیا کی تحریکات سے متعلق سب سے زیادہ معلومات رکھنے والا "اندرون ایشیا" کا شہرۂ آفاق مصنّف جان گنتھر احرار کے ذہن کے متعلق لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کی ایک اور شاخ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ احرار پنجاب میں بایاں بازو ہیں اور وہ کانگرس کے ساتھ ہیں۔ وہ عجب مجموعۂ اضداد ہیں۔ ایک طرف وہ مذہبی اعتبار سے فرقہ پسند فدائی ہیں لیکن ساتھ ہی سیاسی انتہا پسند ہیں۔ وہ مذہب کے ذریعے عوام میں اثر پیدا کرتے ہیں۔"

حالات کا جائزہ لینے والے کہتے ہیں کہ کم علم عوام تک پہنچنے کا یہی بہتر طریق ہے۔

تحریکات عالم کو سمجھنے والا اور سب سے ثقہ شخص مسٹر گنتھر احرار کو ایک عجیب و غریب مجموعہ قرار دیتا ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ مغرب نے مذہب پرست لوگوں کو سیاسی انقلابی نہیں پایا۔ اور نہ یورپ میں کبھی سیاسی انتہا پسند طبقہ مذہب کا علَم نہایت مضبوطی کے ساتھ تھامے رہا ہے۔ یہ شرف صرف اسلام ہی کو حاصل ہے اور مجلس احرار موجودہ دور میں صحیح روایاتِ اسلام کی بہترین جانشین ہے۔ ہمارا عمل، ہمارا نظامِ کار اور ہماری تاریخ اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ جہاں ہم مذہبی معاملات میں عوام کی رہنمائی کرتے ہیں، تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور جہاں ہمارے رہنماؤں اور رضا کاروں نے ختمِ نبوّت، مدحِ صحابہ اور تنظیمِ رسول راج پال کی تحاریک میں نمایاں اور اہم حصّہ لیا ہے۔ وہیں ہمارے رضا کار سیاسی میدان میں بھی ملک کی کسی ترقی پسند سیاسی جماعت سے پیچھے نہیں رہے۔ یہ چیز ایک مغربی آنکھ کے لیے یقیناً ایک عجوبہ ہو سکتی ہے۔ مگر ہمارے لیے شرف و مباہات کا باعث ہے۔ یہ سب کچھ اُس نبیِّ اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ اُس کے نام لیواؤں کی ایک جماعت ایسی آج بھی موجود ہے جسے دیکھ کر مغرب کے مفکّر انگشت بدنداں ہیں۔ کہ ایک طرف تو یہ لوگ مذہب کا دامن نہیں چھوڑتے اور دوسری اِقتصادی مُساوات، اور سیاسی آزادی کے علم بردار اور ان مقاصد کی خاطر قربانی کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ہیں۔ زمانہ آج اسی "عجیب و غریب مجموعہ" کا مُطالبہ کر رہا ہے۔ "صرف سیاست" یا "صرف مذہب" کی تحریکیں ناکام ہو چکی ہیں۔ یا ناکام ہو جائیں گی۔ لیکن "مذہب و سیاست" کا جو امتزاج آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قائم کیا گیا تھا، اس کی زندہ مثال آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اور خداوند عزّ و جلّ کا جتنا بھی ہم احرار شکر گذار ہوں کم ہے کہ اُس کی عنایاتِ بے غایات اور انعام و اکرام کے طفیل اس صدی میں اسلام کے صحیح لائحہ عمل یعنی "اجتماعِ مذہب و سیاست" پر کاربند ہونے کا شرف صرف ہم غریب احرار کو

حاصل ہوا ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نوٹ:

کتاب کے آخر میں ایک ریزولیوشن درج ہے۔ یہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ منشاء اس سے یہ ہے کہ تمام دوستوں کو اس مرتبہ ریزولیوشن پر غور و خوض کرنے کا موقعہ ملے اور وہ اپنے خیالات کی روشنی میں اس کی ترمیم و تنسیخ کریں۔

افضل حق

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

باب اوّل

(باب اوّل کے ضمن میں لکھی ہوئی عبارۃ کا ایک خاص حصہ بھی سنسر کی نذر ہوگیا اور بعد میں اس کا اصل مسودہ بھی نہ مل سکا۔ اس لیے نا تمام عبارۃ محذوف ہوگئی ہے)

ابو معاویہ ابو ذر

"تحریکِ خلافت" اور "مہاتما گاندھی"

عبرت نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا وا حسرتا یہ ہوا مسلمانوں کا انجام ؟ پھر اُس نے نظریں نیچی کر لیں اور کہا کیا کلمہ گویوں میں کوئی رجل رشید نہیں رہا جو بربادیٔ اسلام پر آنسو ہی بہائے اور خدا سے پریم کھیلنے کے لیے جان کا جوا لگا دے اور مسلمانوں کی بگڑی بنانے کے لیے ہندوستان میں اٹھے اور راندۂ گیتی ملت اسلامیہ کا سر اونچا کرے ؟ بہتوں نے دل کے کانوں سے اس آواز کو سُنا۔ تھوڑے حوصلے کر کے گھروں سے نکلے۔ امراء بدستور دادِ عیش دیتے رہے۔ صوفیاء رہبانیت کے گوشوں میں ڈرے سہمے بیٹھے رہے۔ درمیانے طبقے کے کچھ اور نچلے طبقے کے زیادہ تعداد پر مشتمل لوگوں نے —"خلافت کمیٹی"— کی بنیاد رکھی، اور چاہا کہ روٹھی ہوئی قسمت کو زاری اور زور سے منائیں۔ راستے کی مشکل اور منزل کی دُوری نے سب کو دل گرفتہ کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کی بہت سی تحریکیں نامرادی کی نیند سو چکی تھیں۔ اب بھی انگریزی سطوت کی علمبردار ہندوستانی پولیس ہر طرف مستعد نظر آتی تھی۔ جس فوج نے ہزاروں میل دور جا کر اسلامی ممالک کو تاراج کیا تھا انہیں یہاں کلمہ گویوں کا سر قلم کرنے میں دریغ کیا تھا۔ عوام کے ہاتھ میں محض کلرکی کا قلم رہ گیا تھا۔ جہاد کے ابتدائی سامان سے محروم قوم خم ٹھونک کر میدان میں کیا نکلتی ؟ احتیاج نے شیروں کو روباہ مزاج بنا دیا اور احتیاط کا تقاضا یہ ہوا کہ

ممیا کر بھیڑیے سے رحم کی درخواست کی جائے۔ روحِ جہاد کو ترک کرکے زیادہ سے زیادہ مسکین بننے کا مسلک اختیار کیا جائے جو مخالف کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ "مار اور مار گز" کر مارنے والے کو زچ کرتا ہے اور دیکھنے سننے والے کے رحم کو مدد کے لیے آمادہ کرتا ہے ——— مہاتما گاندھی اس اصول سیاست کا ماہر مانا جاتا تھا اس بنیے کو یہ بزرگی سونپ دی گئی کہ پہلے تم ہی اپنے مزاج کے مطابق مار کھا کر دوسرے کو مہربان کرنے کے دعوے کی دلیل پیدا کرو۔ گاندھی فطری طور پر آندھی ہے۔ شوکت علی اور محمد علی کا مسلمانوں میں اسے سہارا ملا تو اُس نے مُلک میں طوفان کھڑا کر دیا۔ طول و عرضِ ملک میں انگریزوں کے لیے فتنے بیدار ہو گئے ایک دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ تختِ سلطنت ہل گیا ہے۔ مُردہ دل ہندوستانیوں میں آثارِ زندگی پیدا ہو گئے۔ گویا خزاں دیدہ ہندوستان میں بہار آگئی۔ ناگاہ چورا چوری کے واقعہ ہائلہ نے گاندھی جی کے مزاج میں اعتدال پیدا کر دیا۔ سول نافرمانی کے سرپٹ گھوڑے کو یک دم روک دیا گیا۔ سب سیاسی کارکن محسوس کرنے لگے کہ وہ اونچی جگہ سے پتھریلی زمین پر گرے ہیں اور انہیں دن کو بھی چوٹ سے تارے نظر آنے لگے۔ قوموں کا بگڑ کر بننا اور تحریکوں کا رک کر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ میدان جنگ میں ایک چال چوک جانے سے بھاگڑ مچ جاتی ہے۔ کانگرس اور خلافت کی صفوں میں انتشار سا پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کے بے عمل اعلیٰ طبقے کو یہ موقعہ خدا دے۔ اُنہوں نے کہا بنیے بقّال کو قوم کا سردار بنانے والے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ گویا وہ خود تلوار ٹیک کر جہادِ زندگی کو نکلے ہیں۔ اور جو کام گاندھی، شوکت علی۔ محمد علی انجام نہ دے سکیں، یہ آرام طلب اُمرار آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا لیں گے۔ جب تک خلافت کی تحریک زوروں پہ تھی۔ بلوری گلاسوں میں گھونٹ گھونٹ شربت پینے والے نازپروردہ اونچے گھرانے والوں نے دم نہ مارا۔ اب ترکِ سول نافرمانی کے بعد یہ کھُل کھیلے کہا کہ خلافت لفنگوں کی جماعت ہے ——— یہ پبلک چندوں پر پرورش پانے والے لوگ قوم کی خدمت کیا کریں گے!

——— ناتربیت یافتہ عوام تو امرار کے ہاتھ میں موم کی ناک ہوتے ہیں۔ گلی بازاروں کانا پھوسی شروع ہوئی کہ اتنا چندہ کہاں گیا؟ ان سرگوشیوں کو اور زبان لگی پھر حساب فہمی کی عام صدا میں تبدیل ہو گئی۔ حکومت کو اس آواز میں زور پیدا کرنا مطلوب تھا۔ اس کی کون سی ترکیب اٹھا رکھی گئی۔ شہر شہر میں پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کی ——— نیم سرکاری جماعتیں کھولی گئی تھیں۔ انہوں نے اور ہوا دی۔ حکومت کانگرس سے زیادہ خلافت سے خائف تھی کہ مسلمان کا ذہبی ہندو سے زیادہ

انقلابی ہے۔ مسلمان کام کرتے وقت انجام نہیں سوچتے اور بات بگڑ جانے کے بعد زیادہ افسوس نہیں کرتے۔ اسی لیے مسلمانوں کی تحریکیں اکثر اندھے کا لٹھ ہوتی ہیں جس کا وار عموماً خالی جاتا ہے۔[1] (چھاپنے سے انکار)

رپورٹ حسابات

سرکار کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مجلس خلافت نے تقاضوں سے متاثر ہو کر تین پنجابی کارکنوں کی کمیٹی بنا دی، جس کا کام مرکزی خلافت کمیٹی کا حساب پڑتال کرنا تھا۔ بدقسمتی سے اس کمیٹی نے قلم کو حدِ اعتدال سے بڑھنے کی اجازت دے دی، واقعات کو ناول بنا کر پیش کر دیا۔ بہت معمولی واقعات کو ضرورت سے زیادہ اچھالا۔ قلم کی رنگین جنبش حکومت کے خوب کام آئی۔ اس رپورٹ کی ایک نقل مجلس میں پیش ہونے سے پہلے اڑا لی گئی اور طول و عرضِ ہند میں روپے کو پانی کی طرح بہا کر اس کو پہنچایا گیا۔ مولانا محمد علی و شوکت علی ابھی جیل سے نہ آئے تھے کہ ان کے دفتر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دوست و دشمن کے ہاتھ میں مبالغہ آمیز صورت میں پہنچی۔ مولانا محمد علی شوکت علی کے مخلص ساتھیوں اور ماحول کو اس رپورٹ سے بے حد صدمہ ہوا۔ یہ رپورٹ آئندہ غلط فہمیوں کا باعث ہوئی۔ ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک اسلامی ہند کی رائے عامہ کی باگ ڈور تین حریف شخصیتوں کے ہاتھ میں رہی۔ "محمد علی جناح"، "مولانا محمد علی" اور "مولانا آزاد"۔ ۱۹۱۸ء میں یک بیک انقلابی سا دور آگیا۔ آئین پسند جناح آئین شکنی کی راہوں پر چلنے سے معذور تھا۔ اس لیے یہ عارضی طور پر گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔ اب سیاسی میدان دو سیاسی حریفوں کے ہاتھ میں تھا۔ مولانا آزاد کو علمار کی تائید حاصل تھی۔ مولانا محمد علی انگریزی خوانوں کے محبوب رہنما تھے۔ محمد علی کے ساتھ شوکت علی نے مل کر گاندھی جی کو اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ اور سیاسیات ہند میں ایک بھونچال سا پیدا کر دیا۔ مولانا آزاد علم کے سرمایہ دار اور رہنما نہ مزاج تھے۔ عوام سے بے نیاز رہنا ان کی

---

[1] اس عبارت سے آگے کا کچھ مضمون ۱۹۳۹ء کے ہنگامی اور جنگی دور میں انگریزی حکومت کی طرف سے دیگر پابندیوں کے علاوہ نشر و اشاعت پر سنسر کی گرفت کی نذر ہو گیا تھا اور افسوس کہ بعد میں اُس کا اصل مسودہ بھی نہ مل سکا ورنہ اب طبع دوم میں شامل کتاب کر دیا جاتا۔ ابومعاویہ، ابوذر۔ ۱۲

فطرت ثانی۔ وہ بھی اپنے پُر جوش حریف محمد علی کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔ اور سیاسیات میں انہیں پچھلی نشست ہی پر بیٹھنے والوں کی حیثیت اختیار کرنا پڑی۔ اس رپورٹ میں علی برادران کے خلافتی نظم و نسق پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی۔ درحقیقت یہ رپورٹ غیر محسوس طریق پر اسی حریفانہ چشمک کا نتیجہ تھی۔ جو ان دو رہنماؤں یعنی آزاد اور جوہر کے درمیان چلی آتی تھی۔ مولانا محمد علی کی پارٹی نے یہ سمجھا کہ یہ رپورٹ مولانا آزاد کے دستِ راست مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کی توجہات کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ یہ بزرگ اس زمانے میں پنجاب خلافت کمیٹی کے صدر محترم تھے۔ لیڈر کو آبرو بنانے میں مدت لگتی ہے۔ مگر کوڑی کوڑی جمع کی ہوئی دولت چٹکی بجاتے میں اڑائی جا سکتی ہے۔ ایک جھوٹا مگر دل لگتا الزام برسوں کی تکلیف سے حاصل کی ہوئی شہرت کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ اس رپورٹ سے علی برادران پر بھی ناکردہ گناہ یونہی الزام سا لگ گیا۔ اب جوہر اور آزاد بمالہ کے تول ہو گئے۔

"سیٹھ چھوٹانی" اور "مجلسِ خلافت"

مصیبت جب آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی۔ قسمت کے زینے سے پاؤں پھسلے تو اکثر کئی پیڑیاں انسان یونہی پھسلتا چلا آتا ہے۔ اس رپورٹ کا منحوس سایہ ابھی اٹھا نہ تھا۔ کہ سیٹھ چھوٹانی کے واقعے نے "خلافت کمیٹی" کی بساط الٹ دی۔ سیٹھ موصوف خلافت کی تحریک سے پہلے لکڑی کی تجارت کے بادشاہ کہلاتے تھے۔ سرکاری دربار میں رسوخ تھا۔ انہوں نے کمال ایثار سے کام لے کر مجلس خلافت کی بطور صدر کے باگ ڈور سنبھالی ہوئی تھی، اب سوتن سہیلی کیا، حکومت نے اسے مخالف قرار دے کر تمام ٹھیکے منسوخ کر کے اس کی مالی ساکھ بگاڑ دی۔ خلافت کا سارا سرمایہ سیٹھ مرحوم کی فرم کے حساب میں جمع تھا۔ تجارتی نقصان اس روپے سے پورا ہوتا رہا۔ یہ خبر پر لگا کر ہر طرف پہنچی کہ قومی سرمایہ شخصی نقصان پورا کرنے کے کام آ رہا ہے۔ آخر سیٹھ چھوٹانی سالار مجلس خلافت کے سپرد ہوئی اور سیٹھ صاحب سب دنیاوی دولت سے دامن جھاڑ کر شہرت کی دنیا سے الگ ہو گئے۔ مجلس کو اس کی بدولت اور اس کو مجلس کی بدولت کئی لاکھ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس خلافت اور بدقسمت سیٹھ چھوٹانی ایک دوسرے کو لے ڈوبے۔ ساتھ ہی علی برادران کے اقبال کا آفتاب

غروب ہو گیا۔ خلافت کے نقصانِ مایہ کے علاوہ شماتتِ ہمسایہ علی برادران کے حصے میں آئی۔ سیاسیات میں رحم کون جانتا ہے؟ سیٹھ چھوٹانی درحقیقت خلافت کے باعث برباد ہوا مگر خائن کہلا کر نکلا۔ اب چھپے ہوئے سرمایہ دار دل نے کمین گاہوں سے سر نکالا۔ رائی کا پہاڑ بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے نا اب نو وجہ معقول اور نقصانِ گراں عالم آشکارا تھا جو جو انہوں نے کہا عوام نے سچ مانا۔ مجلس خلافت جمہور میں واقعی چوروں کی جماعت مانی جانے لگی۔

"خلافت پنجاب" باغی قرار پائی

علی برادران متوسط گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مزاج امیرانہ اور طبیعت میں انکسار تھا۔ ایسے لوگ درمیانے طبقے کے محبوب اور ادنیٰ درجے کے لوگوں میں ہر دل عزیز ہوتے ہیں۔ یہ اور ہندو مسلمان امرار کو نہ بھاتی تھی سیٹھ چھوٹانی کے واقعہ سے انہیں عوام کی نظروں میں بے توقیر کرنے کا عمدہ موقع میسر آیا۔ مولانا محمد علی انگریزی علم و ادب کا خزانہ تھے۔ مگر اس کے فخر کے بوجھ سے دبے ہوئے نہ تھے۔ بخلاف مولانا آزاد اپنے دوستوں سے بے حد بے تکلف تھے اور برابر کے بھائی تھے۔ مزاج میں ذرا ضد تھی، طبیعت میں قدرے تیزی۔ وہ مخالف سے بے دریغ لڑ جاتے تھے اور لڑائی میں انجام نہ سوچتے تھے۔ ان کو خیال ہو گیا کہ پنجاب کے کارکنوں کا سارا گروہ ان کے مخالفوں میں سے ہے حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ سوائے چند افراد کے باقی جماعت کو علی برادران سے عداوت نہ تھی۔ احرار پارٹی میں وہ لوگ شامل نہیں جنہوں نے بمبئی کے حسابات کی رپورٹ لکھی۔ نہ وہ ہیں جنہوں نے سیٹھ چھوٹانی کے واقعہ کو علی برادران کے دامن کا داغ بنانے کی سعی کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پنجاب خلافت کمیٹی کی سرداری اُن کے ہاتھ میں تھی جن کا دل مولانا محمد علی کی بجائے مولانا آزاد کے ساتھ تھا۔ تاہم خلافت مرکزیہ نے علی برادران کے اشارے پر پنجاب خلافت کمیٹی کو باغی قرار دیا۔ پنجاب خلافت کمیٹی کا الحاق ٹوٹ جانے کے بعد خلافت مرکزیہ مردہ ہو گئی۔ کیونکہ موجودہ احرار گروہ کی خدمت سے محروم ہو گئی۔ یہی گروہ ہندوستان کی مجلس خلافت کی جان تھا۔ حقیقت حال کی بنا پر عرض کرتا ہوں۔ مجلس احرار کے موجودہ کارکن جب خلافت کمیٹی میں شامل تھے۔ اگرچہ مولانا آزاد کے ہواخواہوں کے ساتھ تھے۔ مگر پارٹی بازی میں براہ راست شامل نہ تھے۔ انہیں خدمت اسلام کے سوا کچھ اور نہ سوجھتا تھا۔ مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کی چشمک کا کچھ ہلکا سا احساس اور تھوڑا سا شعور ضرور تھا۔

مگر پورے طور پر یہ امر واضح نہ تھا کہ ہم ایک فریق کے حق میں استعمال ہو رہے ہیں۔ کیوں کہ جو ہر دو آزادی کی لڑائی ابھی اُجاگر نہ ہوئی تھی۔

گروہِ احرار

پنجاب خلافت کمیٹی جو مجلس مرکزیہ کے جسم کے لیے روح کا حکم رکھتی تھی۔ غیر ارادی و غیر شعوری طور سے اس کے اپنے اندر دو گروہ موجود تھے۔ خلافت پنجاب کا طبقۂ اعلیٰ یعنی حاکم گروہ اَور تھا اور طبقۂ ادنیٰ یعنی حکم بردار گروہ اَور۔ حاکم گروہ رنڈی کے پوت اور سوداگر کے گھوڑے کی طرح کام چور اور آرام طلب تھا۔ طول و عرض ہند میں بھاگ دوڑ کا کام طبقۂ کا کام تھا۔ طبقۂ اعلیٰ کو اپنے گروہ کے موجود ہونے کا علم تھا۔ لیکن طبقۂ ادنیٰ کو الگ احساس خودی نہ تھا۔ اس کا ہر فرد اپنے آپ کو کل کا جزو سمجھ کر مطمئن کام سرانجام دے رہا تھا۔ تاہم حکم بردار گروہ سے حاکم گروہ اندر ہی اندر خائف سا تھا اور کچھ الگ الگ کھچا کھچا سا رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو امیر طبقے سے متعلق اور عقل کا سرمایہ دار سمجھتا تھا۔ اور گروہ ادنیٰ کو علم و سرمائے سے محروم قیاس کر کے چھوٹی موٹی خدمات سرانجام دینے کا اہل خیال کرتا تھا۔ جب مجلس خلافت پنجاب کا الحاق مرکز سے ٹوٹ گیا۔ تو اس اعلیٰ گروہ کے کام کرنے کی طاقتوں نے بالکل جواب دے دیا۔ وہ کلی طور پر کانگریس کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ ان کا قیاس تھا کہ مسلمان خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہے۔ طبقۂ اُولیٰ اپنی قوت عمل پر ساری قوم کا قیاس کر کے ہندوستانی مسلمان کو فوری انقلاب میں کامیاب نکلنے کا اہل سمجھتا تھا۔ لیکن یہ دونوں فریقوں کو بربنائے تجربہ احساس تھا۔ کہ ہندو اور مسلمان میں کوئی یگانگت موجود نہیں۔ ہندو کی چھوت چھات نے دو قوموں کے درمیان دیوار چین رکھی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں دونوں گروہ مل کر چھوت چھات کے خلاف آواز بلند کر چکے تھے اور جانتے تھے کہ ہندوؤں کی "مجھے نہ چھوؤ" کی پالیسی سے مسلمان ناقابلِ بیان حد تک بیزار ہے۔ کانگریس میں بعض پاکیزہ خیال اور نیک طبیعت لوگ تو ہیں۔ لیکن اکثر وہ ہیں جو پالٹکس میں بھی مجلسی تنگ نظری سے کام لے رہے ہیں اور اس لیے مجلس خلافت پنجاب کے اعلیٰ طبقے نے مسلم نیشنلسٹ پارٹی بنائی اور ادنیٰ طبقے نے مجلس احرار بنانے کا اعلان کیا۔ ان حالات میں بھی دونوں گروہوں کی تقسیم پوری واضح نہ ہوئی تھی۔ بظاہر کوئی

جھگڑا نہ تھا۔ غالب قیاس یہ تھا کہ نیشنلسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا ڈاکٹر محمد عالم ہیں۔ زیادہ دیر تک یہ گروہ قائم نہ رہے گا۔ چند دن میں یہ برائے نام جھگڑا مٹ جائے گا اور ایک نام کے ساتھ کام ہوتے لگے گا۔

مجلس احرار کا سب سے پہلا جلسہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ہوا۔ جس میں سید عطاء اللہ شاہ نے میری صدارت میں تقریر کی اور کہا کہ "میں جانتا ہوں کہ مسلمان نوجوان ہندوستان کی آزادی کا ہر اول ثابت ہوں آزادی کے حُصول کا فخر ہمارے حصّے میں آئے"۔

اس کے تھوڑے عرصے کے بعد سول نافرمانی کا آغاز ہوا اور کانگریس کے جھنڈے تلے سب نے مل کر قربانیاں پیش کیں۔

مولانا محمد علی اور لالہ لاجپت رائے ازل سے ایک طبیعت لے کر آئے تھے۔ دل دریا۔ مزاج پر جوش تھا۔ طبیعت کی طغیانی کے باعث امڈتے دریا کی طرح کہیں ڈھاتے کہیں بناتے رہتے تھے۔ مولانا نے کانگریس سے ناراض ہو کر "مُسلم کانفرنس" کی طرح ڈالی تھی۔ خلافت مرکزیہ کا فعّال طبقہ دو گروہوں میں تقسیم تھا۔ کانگریسی حصّہ کم پر جوش نہ تھا۔ اسی نے کانگریس کی تحریک میں مسلمانوں کے نمایاں نشان قربانیاں کیں۔ کانگریس کی اس سول نافرمانی میں احرار کے موجودہ کارکن روح و رواں تھے۔ وجوہات سمجھ میں نہیں آتیں۔ مگر خود مُسلمان کارکنوں نے بھی جیل سے واپس آ کر محسوس کیا۔ کہ ہندو "گاندھی اِرون" پیکٹ کو محض اپنے ایثار کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ذمہ دار مسلمان کانگریسیوں کے اشارے پر مسلمان محبوسین کی فہرستیں شائع کی گئیں۔ تاکہ یہ اثر دور ہو۔ مُحوّلہ پیکٹ کے بعد ہندو عوام پر ایک نشہ سا طاری تھا۔ مسلمان یونہی کچھ کھوئے کھوئے سے تھے۔ اگر پرانا خلافتی گروہ سارے کا سارا کانگریس کے شامل حال ہوتا۔ تو شاید مسلمان ہندوؤں کی طرح اس فتح کو اپنی فتح سمجھتے۔ مگر نہرو رپورٹ کے بعد مسلم عوام کی نظر میں ——— کانگریس ایک ہندو جماعت بن گئی تھی۔ کانگریس میں جو مسلمان تھے ان کی دیانت پر برملا شبہ ظاہر کیا جانے لگا تھا۔

نہرو رپورٹ

کانگریسی رہنما فریب افرنگ میں مبتلا ہو کر ان ہونی بات کرنے پر آمادہ ہو گئے یعنی غلامی میں آزادی کا ایسا

آئین تیار کرنے لگے۔ جو برطانیہ کے اس چیلنج کا جواب ہو کر حکومت ہندوستان کے مشترکہ فارمولا کی بنیاد پر نیا آئین
تیار کرنے کو آمادہ ہے۔ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند جانتے تھے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ لکھنؤ آل پارٹیز
کانفرنس میں صلح کے تار ہلائے گئے۔ اُمید کی رادھا ناچی۔ مگر آنگن ٹیڑھا نظر آیا۔ اتفاق کی بجائے اختلاف کی خلیج کا پاٹ
اور بڑھ گیا۔ شہرت اور عزت شریف انسان کے دل کی بدترین کمزوری ہے۔ جس جگہ ذرا سی ٹھیس لگی ہو وہ اسے ضرورت
سے زیادہ محسوس کرتا ہے۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی کے مقابلے میں گنوار کا لٹھ سمجھے جاتے تھے لیکن عوام میں
کام کرنے کا ڈھنگ وہ سب سے زیادہ جانتے تھے۔ مولانا محمد علی آل پارٹیز لکھنؤ کے ایام میں حج کو گئے ہوئے
تھے۔ شوکت علی وہاں موجود تھے مگر کٹے ہوئے پتنگ کی طرح کچھ الگ الگ اور مولانا آزاد وہاں بیاہ میں نائن کی
طرح کار فرما تھے۔ ہندوستان کی سیاسیات میں موتی لعل ایک ضدی طبیعت، زود رنج مگر صاف دل راہ نما تھے۔
وہ محمد علی اور شوکت علی سے زیادہ مولانا آزاد سے مانوس تھے۔ انہوں نے مولانا شوکت علی کو حتی الامکان آل پارٹیز کی
کارروائیوں میں نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ شوکت ایسی چوٹوں کو خاموشی سے سہنا نہ جانتے تھے۔ فوراً جوابی
کارروائیوں میں لگ گئے اور کانفرنس کو ناکام بنانے کے جوڑ توڑ کرنے لگے۔ عمل پر آمادہ شوکت علی بے پناہ
قوت تھے۔ اسی جگہ مسلمانوں کے ایک معتمد لیڈر کو نہرو خاندان سے بدظن کر دیا۔ حالاں کہ علی برادران کے لفٹنٹ
مسٹر قریشی[1] جو بعد میں مولانا محمد علی کے داماد بنے نہرو رپورٹ کے مجوز تھے۔ نہرو رپورٹ کی بنیاد دو موٹے اصولوں
پر رکھی گئی تھی۔ جنوبی افریقہ کی طرز کی وحدانی حکومت اور مخلوط انتخاب۔ مجلس احرار کے موجودہ کارکن وحدانی حکومت
کے قائل نہ تھے۔ اور وہ صوبوں کی آزادی کے ساتھ فیڈریشن کا قیام چاہتے تھے۔ بطور آخری چارہ کار ہر بالغ
کے ووٹ کی بنا پر مخلوط انتخاب کو قبول کرنے پر بھی تیار ہو گئے تھے کیونکہ مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر عالم اور پنجاب کے
کئی اور ساتھیوں کو مخلوط انتخاب پر اصرار تھا۔ میری اپنی طبیعت علیحدہ انتخاب کی طرف رجوع تھی۔ سب کا خیال
تھا کہ مخلوط انتخاب کو پنجاب پارٹی نہ مانے گی۔ سچ یہ ہے کہ احرار کا موجود گروہ آخری وقت تک علیحدہ انتخاب پر
مُصِر تھا۔ مولانا شوکت علی خوش تھے۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ نہرو رپورٹ سکھوں کی موت ہے۔ نہرو آئین
میں سکھوں کے لیے ایک سیٹ حاصل کرنے کا بھی کوئی موقع نہیں۔ سکھ ہر ضلع میں اقلیت میں ہیں لیکن سکھ مطمئن
تھے کہ پنجاب کے مسلمان مخلوط انتخاب کو ہرگز نہ مانیں گے۔ کانفرنس کے آخری دن سر تیج بہادر سپرو، موتی لعل،

[1] مسٹر شعیب قریشی مرحوم ۱۲

سر علی امام۔ لالہ لاجپت رائے۔ سروجنی نائیڈو۔ مولانا آزاد اور پنڈت مدن موہن مالوی پنجابی مسلمانوں کے سر ہو گئے۔
کہ بھلے لوگو! کام نہ بگاڑو۔ سکھوں کو کامل یقین تھا کہ پنجاب کے کارکن مسلمان مخلوط انتخاب کو قبول نہ کریں گے۔ ہم نے
ان لیڈروں کی وساطت سے دریافت کیا۔ کہ آیا سکھ پنجاب میں نہرو رپورٹ کے فارمولے کو مان لیں گے؟
سب کے سامنے انہوں نے اقرار کیا۔ کہ ہمیں منظور ہے۔ ہم نے بھی اعلان کر دیا کہ ہم پنجاب میں نہرو رپورٹ کو
قبول کر لیں گے۔ پھر کیا تھا خالصہ جی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ان کے اندھے لیڈر گیانی شیر سنگھ نے آنکھیں
پھیر کر کہا۔ کہ صاحبو! تمہاری پوزیشن بُری ہو گئی ہے۔ ہم نہرو رپورٹ منظور نہیں کر سکتے۔ خالصہ جی کی اس زود پشیمانی پر
ہم کو ہنسی آئی اور لیڈروں کو پریشانی ہوئی۔ ہمیں میاں سر فضل حسین کا مختلف قوموں کے خصائص کا نظریہ سچ نظر
آیا۔ میاں صاحب موصوف فرمایا کرتے تھے۔ "کہ انگریز کام کرنے سے برسوں پہلے سوچتا ہے۔ ہندو مہینوں پہلے
نقشہ تیار کرتا ہے۔ مسلمان عین وقت پر سوچنے لگ جاتا ہے اور خالصہ جی کی قوم کام کرنے کے بعد غور کرتی ہے۔"
واقعی سکھوں نے اس موقع پر ایسا ہی کیا۔ پھر ان پر زور دیا گیا تو انہوں نے دستخط کر دیئے۔ پھر نتیجہ سمجھ میں آیا تو
اعلان کیا کہ ہم نے (UNDER PROTEST) دستخط کیے ہیں۔ ایسی ہی نادانیوں کے باعث دانائے فرنگ
مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم انگلستان سے گول میز کانفرنس کے موقع پر "دلچسپ قوم" کا خطاب حاصل کیا
تھا۔ سردار سمپورن سنگھ نے بھی عدالت کے سامنے اسی دعوے کو زندہ رکھا اور ساری کانگریس کی سول نافرمانی کے
سر خاک ڈال دی۔

گاندھی اور مالویہ مخالفوں میں

دوستوں کی طرف سے میں نے کھلے اجلاس میں صوبوں کی آزادی اور فیڈریشن کی قائمی کے حصول کو منواتے
کی ناکام کوشش کی مجھے تعجب ہوا۔ کہ میری ترمیم کو مسلمان نہ سمجھ سکے اہل الرائے مجھ سے پوچھتے تھے اس سے کیا فائدہ
ہوگا؟ زمانے کے انقلاب ہیں۔ وہی لوگ اب پاکستانی بنے بیٹھے ہیں۔ جو نہرو رپورٹ کو اسلامی سیاسیات کے لیے
تریاق سمجھتے تھے۔ اور اس کو بلا شرط قبول کرنے پر زور دیتے تھے۔ اور چھوڑیے مسٹر جناح جو پاکستان کی خیالی
سلطنت کے شہنشاہ ہیں ہمیشہ مخلوط انتخاب کے لیے جان دیتے رہے۔ وہ فارمولا جو دہلی پروپوزل (PROPOSAL)

کے نام سے مشہور تھا۔ مخلوط انتخاب کے نام پر مرتب ہوا تھا جس کے مجوزین میں مولانا محمد علی، مسٹر جناح، ڈاکٹر انصاری وغیرہ ہر طبقے کے مسلمان شامل تھے۔ لیکن نہرو رپورٹ پر طوفان اٹھایا گیا اور بڑا کامیاب طوفان۔ اس لیے کہ اس پر دستخط کرنے والے نسبتہً غریب جماعت کے مسلمان تھے۔ ورنہ یہ نہیں۔ کہ کچھ اُصول سے اختلاف تھا۔ میاں سر "فضل حسین" نے تو تمام مسلمان ممبران کونسل کے سامنے میری تصریحات سُن کر صاف کہہ دیا تھا کہ "جو کچھ تم کرآئے ہو۔ وہ مسلمانوں کے لیے غیر مفید نہیں۔ لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ پنجاب کا ہندو اور سکھ نہرو رپورٹ کو قبول نہیں کرے گا۔ اس لیے عملی دنیا میں نہرو رپورٹ ایک بے معنی دستاویز ہے۔ میں اس کی حمایت کا اعلان نہیں کر سکتا۔"

سر سکندر حیات خان جو اُس وقت گمنامی کے گوشے میں پڑے تھے۔ نہرو رپورٹ کے حق میں زیادہ گرم جوش تھے۔ باوجود اس کے ایک دُنیا گواہ ہے کہ ہم پر خشت باری کی گئی۔ ہمیں برملا زخمی کیا گیا۔ مولانا محمد علی باوجود کانگرس سے رُوٹھ جانے کے زندگی کے آخری لمحوں تک مخلوط انتخاب کے علم بردار رہے۔ لیکن اونچے طبقے کے لوگوں نے عوام کو بھڑکا کر ہمارے خلاف غصّہ نکالا۔ اِدھر ہندو پریس کا یہ حال کہ وہ سکھوں کو بھڑکا کر نہرو رپورٹ کی مخالفت کو ہوا دیتے تھے۔ لکھنؤ سے واپس ہو کر سکھ دستخط کنندگان نے نہرو رپورٹ کی علانیہ مخالفت شروع کر دی۔ پنڈت مالویہ اور مہاتما گاندھی نے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور صاف صاف کہہ دیا۔ کہ نہرو رپورٹ کی تجویز میں سکھوں کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ پنڈت موتی لعل سیاسیات میں ایک مُنہ زور گھوڑے کی طرح تھے جن سے مُعاصرین ڈرتے تھے اور جن کو ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے کہ جو بوی دل پسند نہیں۔ اس کے کام میں اوجیکڑے پڑتے ہیں۔ نہرو رپورٹ بالآخر راوی کی لہروں میں اس لیے بہادی گئی۔ کہ یہ جواہر لال اور موتی لال کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ نوجوان نہرو روس کی اقتصادی تحریک سے متاثر تھا۔ سرمایہ دار طبقہ اس کے نام کا اچھلنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن تقدیر کی انمٹ تحریر کہو یا واقعات کی مجبوری کہ گاندھی، جواہر لال کو نظر انداز نہ کر سکا۔ اسے کانگریس کا صدر بنا کر اس کی رفتارِ ترقی کو روکا اور اس کے خیالات کو پابند کر دیا۔ اس طرح سرمایہ داروں کے مہاتما گاندھی کا کمیونسٹ جواہر چیلا بنا۔ انقلاب زندہ باد کا شیدائی، گاندھی کی جے پکارنے لگا۔ ہندوستانی عوام کی قسمت کا چراغ روشن ہو کر بجھ گیا۔ ہندوستان میں کوئی ایسی شخصیت نہ رہی۔ جو غریب عوام کو سرمایہ داروں کے جال سے نکالنے کا اعلان کرتی :

اِختلاف کی ابتداء

اس دَور کو سمجھنے کے لیے کچھ اور واقعات کے رُخ سے پردہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ خلافت کی تحریک بظاہر ایک فرقہ وارانہ تحریک تھی، لیکن گاندھی کی شخصیت نے اس کو عمومی رنگ دے کر انگلستان کے لیے ایک نئی مشکل پیدا کر دی اور سچ یہ ہے کہ خلافتی مسلمان عملی طور پر یہ سوچنے لگا کہ ہندو اور مسلمان کو بطور ایک قوم کے کام کرنے کے سوا چارہ کار نہیں، ہندوستان کی آزادی کے سوا جماعتی اور قومی مشکلات کے حل کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ اس لیے ہندو اور مسلمان سیاسیین ابتدائی تین چار سال تک تو شیر و شکر رہے۔ مگر پھر ایک دوسرے سے کچھ اُکتا سے گئے۔ موپلوں کی بغاوت میں ہندوؤں پر موپلوں کی طرف سے کچھ سختی ہوئی۔ شمالی ہند کے کچھ ہندو اخباروں نے واقعہ کو اُچھالا۔ ہندوؤں کے ایجی ٹیشن کے خوف سے جمعیتہ العلماء نے اپنے لاہور کے اجلاس میں مولانا آزاد کی سرکردگی میں موپلوں کی مذمت کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ میں اس اجلاس میں موجود تھا۔ میں نے مخالفت اس بنا پر کی کہ اس ریزولیوشن سے گورنمنٹ موپلوں کو لاوارث سمجھ کر تباہ کر دے گی۔ لیکن میری تقریر خلاف ضابطہ قرار دی گئی۔ کیونکہ میں سند یافتہ عالم نہ تھا۔ لیکن واقعات نے میری رائے کے مطابق صورت اختیار کی۔ حتیٰ کہ جنوبی ہند کا عام ہندو بھی موپلوں پر لرزہ خیز مظالم کی تاب نہ لاسکا۔ اور ان کی تباہی پر آنسو بہانے لگا۔ آنکھوں دیکھتے دیکھتے ۱۹۲۲ء موپلوں کی مکمل تباہی تحریک خلافت کا ایک افسوسناک پہلو ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے حلقے سے ان کے خلاف آواز نہ اٹھائی گئی۔ شمالی ہند کے آریہ اخبارات بدستور مسلمانوں کے خلاف آگ برساتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں سوامی شردھانند قبل از وقت رہا ہو کر میانوالی جیل سے باہر آئے اور شدھی کی تحریک کے علم بردار بنے۔ عوام میں اتنی برداشت کہاں کہ وہ سیاسی موافقت میں مذہبی مخالفت برداشت کر سکیں۔ چند ہزار ملکانوں کے نامسلمان ہو جانے کو ہندوؤں نے ویدک دھرم کی فتح سمجھا اور قیاس کیا کہ بس اسی ایک سلسلے میں سارے مسلمانوں کو اوم کے جھنڈے تلے کر کے چھوڑیں گے۔ مسلمانوں نے خیال کیا۔ خلافت کی بحالی تو دور کی کوڑی لانا ہے۔ آؤ ان ملیا آستین آریاؤں سے نپٹ لیں۔ ملکانوں کے علاقے میں دورہ کرنے سے مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا۔ کہ یہ مذہب کی برتری کا سوال نہیں۔ بلکہ چھوت کے باعث جو مسلمانوں میں مجلسی کمتری کی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے آریہ

لیڈر فائدہ اٹھا رہے ہیں یعنی ملکانوں سے کہہ رہے ہیں کہ دیکھو! مسلمان ہمارے اچھوت ہیں۔ کیا تم عزت والے لوگ ان اچھوتوں کا حصہ بن کر رہنا چاہتے ہو یا معزز لوگوں کی دعوت کو قبول کر کے اپنا درجہ بلند کرنا چاہتے ہو؟

ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی شخص مجلسی طور پر کم درجہ میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ ملکانوں نے صاف کہا کہ مسلمان اچھوت ہیں۔ ہم مسلمانوں کی طرح اچھوت بن کر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے۔ غرض ملکانوں پر مذہبی نہیں بلکہ مجلسی جادو چل گیا۔ اکثر قوموں نے مجلسی برتری حاصل کرنے کے لیے مذہب کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ اسلام میں یہی جادو تھا۔ کہ وہ گری ہوئی قوموں کا فوراً مجلسی درجہ بلند کر کے ادنیٰ کو اعلیٰ کے برابر بنا دیتا تھا۔ مگر اب مسلمان ہندوستان میں ہندو کا اچھوت رہنے پر مطمئن ہو گیا ہے۔ اسلام میں مساوات کی کشش باقی نہ رہی۔ آخر کس خوبی کے باعث تبدیلیٔ مذہب پر کوئی آمادہ ہو سکے؟ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر پھٹول کا بازار گرم ہوا۔ آزادیٔ وطن کی جگہ تبلیغ و تنظیم شدھی و سنگھٹن کا نعرہ بلند ہوا۔ لاہور۔ امرت سر۔ کوہاٹ اور ملتان میں بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے گئے۔ اس میں مسلمانوں نے زیادہ چابک دستی کا ثبوت دیا۔ اس طرح بطور ایک دنیاوی تنظیم کے اہم مقابلے میں کامیاب رہے۔ لیکن بطور خیر الامّت کے خدا کے حضور میں ہم ناکام ٹھہرے۔ کیوں کہ بہت سے بے گناہوں کا خون بہایا گیا۔ حالانکہ بطور سچّے مسلمان کے ہمارا حق یہ تھا کہ ہمسائے کی جان و مال کی حفاظت میں جانیں لڑا کر اخلاقِ اسلامی کا ثبوت دیتے کیوں کہ میری ساری دلچسپی مسلمانوں کے عمل سے ہے۔ اس لیے مجھے دکھ ہے تو یہ کہ ہم بلووں میں اسلامی معیار کے مطابق پورے نہیں اترتے۔ غیروں کی طرح بازاری اخلاق کے مرتکب ہوتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق احرار کے موجودہ گروہ کا اوّل روز سے یہ نظریہ رہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہمیں زیادہ سے زیادہ حفاظت خود اختیاری میں مرنے اور مارنے کا حق ہے۔ لیکن خود بلوہ کر کے ہندوؤں پر ٹوٹ پڑنے کا حق نہیں۔ بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں پر تو کسی حال میں بھی ہاتھ اٹھانا ٹھیک نہیں۔ سچا مذہب تو جماعتی ذہن کے تابع ہو گیا ہے۔ دوسری قوم کی عداوت کے مقابلے میں خود ناانصافی کر گزرنا جائز سمجھا جانے لگا ہے۔ حالانکہ حکمِ حق اور ہے:

راج پال کا فتنہ

۱۹۲۷ء

بظاہر ایک قابلِ اعتراض تحریک اپنے دورِ اوّل میں احرار نے بھی جاری کی۔ شدھی اور سنگھٹن کی مسموم فضا سے فائدہ اٹھا کر آریہ دیروں نے ایک بہت ناپاک حرکت شروع کی۔ یعنی غریب عوام کی آخری پناہ گاہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ناپاک حملے آغاز کر دیئے۔ شہروں میں ٹولیاں بنا کر اور جلوس نکال کر مجسّمہ نماز و دعا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر برملا اتہام لگانے اور اُن کے متعلق اخلاق سوز شعر پڑھنے لگے۔ "رنگیلا رسول" نامی کتاب لکھ کر مسلمانوں کے صبر کا امتحان لینا چاہا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق مسلمان عاشقانہ احساس رکھتا ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کے بدمعاشوں نے ایکا کر کے دنیا کے افضل ترین انسان پر کیچڑ اچھالنا اپنا پیشہ بنا رکھا ہے۔ اس لیے بدمعاشوں کا انجام بدنصیبی کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیئے چنانچہ وہ والہانہ جان پر کھیل کر خون کی ہولی کھیل جاتا ہے۔ ہماری جماعت کے افراد بلا استثنا علمبردارِ مساوات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مئے محبّت کے متوالے ہیں۔ اُنہوں نے مصلحت اندیش عقل کے خلاف اور عشق کے مطابق قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔ برملا کہہ دیا۔ کہ نورِ نبوّت کے کیرکٹر کے خلاف کہنے والی نہ زبان رہے نہ سُننے والے کان رہیں نتیجہ یہ ہوا کہ خنجر نے بدزبانوں کی زبان کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ۔ مولانا حبیب الرحمٰن۔ غازی عبدالرحمٰن۔ بشیر رفیقی اور دوسرے دوست اگرچہ سال سال کے لیے جیل چلے گئے۔ مگر سوامی شردھانند "رنگیلا رسول" کے ناشر راج پال اور کئی ایک بدگو، نیکوں کے پاک دامن پر بدنامی کا داغ لگانے کے باعث ذرا جلدی دوسرے جہان میں جواب دہی کے لیے پہنچا دیئے گئے۔ یہ قتل سب عشق کے قانون کے مطابق ہوئے۔ ہمیں ابھی مُلکِ شریعت کا قانون معلوم نہ تھا۔ نہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ہمارے عمل کی غلطی تھی کیونکہ عشق اور شریعت اکثر متصادم رہتے ہیں۔ عاشق اکثر محبت کی وارفتگی میں شریعت کی حدود کو روندتا نکل جاتا ہے اور سمجھتا یہی ہے کہ میں برسرِ حق ہوں۔

چھُوت

ہندو دھرم ایک عجیب نازنین مذہب ہے۔ یہ کسی اپنے کا ہاتھ لگنے سے میلا ہو جاتا ہے۔ اور بیگانے کا سایہ پڑنے سے ناپاک ہو جاتا ہے۔ کسی عاشقِ صادق کو بھی ایسے مشکل محبوب سے واسطہ نہ پڑا ہوگا۔ ہمیں ہندوؤں کی بعض ادائیں پسند ہیں۔ انہیں دل دے کر لینا نہیں جانتے۔ مگر وہ ہماری محبت کے روادار نہیں۔ مجلسی لحاظ سے عجب مُتشکِک و مُتَرَدِّد قوم ہے۔ کسی لاجونتی کو دیکھو، جو صبح جل بھرنے جمنا جا رہی ہو یا پوجا کا سامان سج کر مندر میں آرتی اتارنے چلی ہو۔ کسی مسلمان رہگذر کے سایہ سے بچنے کے لیے اس بیچاری کو کتنا تردد رکھنا ہوتا ہے۔ اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر کتنے زاویے کاٹ کر اُسے چلنا پڑتا ہے۔ جسم مسلمان کے جسم سے نہیں۔ بلکہ ٹپّو ٹپّو سے چھو جائے۔ تو بھی نہ بھوجن موہن کے قابل نہ جل چلو بھر پینے کے لائق کہو ایسی قوم سے کس بدھ ملنا ہو؟ کانگریسی مسلمان ہر صبح اُٹھ کر مسلمانوں کو گالیاں دینا پیشہ بنا لیتا ہے۔ کہ کم بخت ہندوؤں سے مل کر ہندوستان کو آزاد نہیں کرا لیتا۔ مگر وہ جوشِ لیڈری میں ہندو کی مجلسی زندگی کے سب سے نمایاں اور تکلیف دہ پہلو کو یکسر نظر انداز کر جاتا ہے۔ کہ ہندو چھوئی موئی قوم کا ایک فرد ہے۔ جو عام طور پر مسلمان کے سایہ سے بھی بدکتی ہے۔ بلکہ کسی ہندو محلہ میں کسی مسلمان دوست کا گزرنا آسان نہیں کر جائے اور جا کر کسی ہندو دوست کو بلا لائے۔ اوّل تو ہر ہندو محلّے پر آہنی سلاخوں کے دروازے لگے ہیں۔ پہرہ دار تمہاری مداخلت پر اعتراض کریں گے۔ جہاں آہنی دروازے نہیں وہاں بھی ہندو معززین مسلمان کو آوارہ دیویوں کا درشن ابھلاشی اور عشق کی چوٹ کھا کر محبت کا آوارہ مُتلاشی سمجھ کر اپنے محلوں میں آنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ اگر کسی کو تجربہ نہیں تو وہ کسی ہندو محلے کا رُخ کر کے دیکھ لے۔ غریب مسلمان ہوگا۔ تو وہ دولت کا چور سمجھا جائے گا۔ اچھے لباس میں ہوگا تو حُسن کا ڈاکو تصوّر کیا جائے گا۔ اگر ایسے شبہات عزت و عصمت تک محدود ہوں تو قابلِ اعتراض نہیں۔ آوارہ مزاج لوگوں سے عورتوں کی عصمت بچانا پرم دھرم ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ مالِ تجارت میں بھی "مجھے نہ چھُوؤ" کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ کیا کوئی مسلمان ہندو حلوائی کی دوکان کے قریب پھٹک سکتا ہے؟ یہ ستم ظریف مسلمان کے ہاتھ سے چھوا ہوا نقد بھی ہاتھ سے نہ لیں گے۔ بلکہ اس غرض کے لیے کاٹھ کی ڈوئی استعمال کی جاتی ہے۔ مسلمان کو پانی پلانے کے لیے

ایک بانس کی لمبی نالی برتی جاتی ہے۔ یا خدا ...... ہندوستان کے مسلمان کو کس ہمسایہ سے سابقہ پڑا ہے جو محبت کے تمام دروازوں کو ہم پر بند کیے بیٹھا ہے؟

اس نفرت زا چھوت کا اثر ہمارے ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہے۔ صدیوں سے عملاً ہمارا تجارتی بائیکاٹ جاری ہے۔ نہ صرف مجلسی طور پر ہم کمتری محسوس کر رہے ہیں۔ بلکہ مالی طور پر بھی مسلمان برباد ہے، کیونکہ وہ محض ایک گاہک کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان ہی ہندو کا خریدار ہے۔ ہندو مسلمان کی دکان کا گاہک نہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ خریدار آخر ایک دن پونجی ختم کر بیٹھتا ہے۔ ہماری دولت تو ہندو کے گھر جاتی ہے۔ ہندو کی پائی مسلمان کے گھر نہیں آتی۔ اس طرح قارون بھی لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اربابِ علم فطرتِ انسانی پر بدسلوکی کے اثر کو دیکھیں۔ مسلمان ہندو سے دست بگریباں ہو کر کیوں خوش ہے؟ وہ اس لیے کہ اس کی انسانیت اس سلوک کا انتقام چاہتی ہے۔ وہ ہندو کو مار کر ہی خوش نہیں۔ بلکہ کسی نہ کسی رنگ میں اس سے جھگڑا جاری رکھ کر اسے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ فطرت کے ان تقاضوں کو گاندھی کے مضامین اور مولانا آزاد کے وعظ پورا نہیں کر سکتے۔ جب تک ہندو و مسلمان میں یہ چھوت کی خلیج حائل ہے۔ ہندوستان کے مسائل کا اطمینان بخش حل مشکل ہے۔ ہندوستان کے سیاسی گروہ کو یہ ثمر حاصل نہیں کہ وہ کہہ سکے کہ اس نے سائنٹفک طریقے سے ہندو و مسلم سر پھٹول کے اصل اسباب معلوم کیے ہیں۔ ہم علم و عقل کو آزمائشوں میں ڈال کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمان کو ہندو کے سلوک سے برحق غصہ ہے۔ ممکن ہے کہ بعض دفعہ وہ خونِ ناحق کا باعث بھی ہوتا ہے۔ مگر قلوب میں آگ لگا کر امن کی امید رکھنا نادانی ہے۔ دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے ہندو انقلاب حال کی کوشش کرے۔ محض انقلاب زندہ باد کے نعرے آزادی کے دن قریب نہ لا سکیں گے۔

لیکن محض ہندو کی نیک دلی پر اعتماد کر کے بیٹھ جانا مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ ہندو قوم فرشتوں کی جماعت نہیں۔ جن مسلمانوں کے دل میں چھوت کے باعث ہوک اُٹھتی ہے اور اس میں اپنی تباہی کا خطرہ دیکھ رہے ہیں۔ اُن کا فرض ہے۔ وہ آتش بجاں مجاہدوں کی طرح حالات سے جنگ کرنے نکلیں۔ ہندو کو اصلاح میں صدیاں لگیں گی۔ عراق سے تریاق آنے سے پہلے مار گُزیدہ مر جائے گا۔ اس لیے چھوت کے باعث مسلمان کو اقتصادی اور سیاسی موت سے بچانے کا کوئی اور جتن کرنا چاہیئے۔ کیا اس کے سوا کوئی چارہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک الگ

اقتصادی نظام کی داغ بیل ڈالی جائے مگر اس طرح کہ ہندوؤں کی مجلسی تنگ دلی کی بھی اصلاح ہوتی جائے اور مسلمان ذلت اور پریشانی سے بھی بچ جائے۔ وقت اور ماحول کے تقاضے کے پیشِ نظر یہی تجویز سمجھ میں آتی ہے۔

مسلمان بطور قوم کے صرف اس ہندو کے ہاتھ کی چیز لے کر کھائیں۔ یا استعمال کریں۔ جو مسلمان کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی چیز کھا سکتا ہو۔ یا استعمال کرتا ہو۔ یہ کہنا کہ ہندو نجس ہے۔ اس لیے اس سے چھوت لازم ہے غلط ہے۔ کیوں کہ بروئے اسلام ہر انسان کا جوٹھا تک پاک ہے۔ یہ تجویز تو چھوت کا جواب ہے۔ مذہب نہیں۔ نہ ہم ملک میں جھگڑا پیدا کرنے کے حق میں ہیں۔ لیکن چھوت کے باعث یقینی چھوت سے بچنا چاہتے ہیں۔

ہم نے ۱۹۲۵ء میں چھوت کے خلاف آواز اٹھا کر گویا مسلمان کے دل کے تار کو مضراب سے چھیڑ دیا۔ یوں معلوم ہوا کہ ساز بے آواز کو زبان مل گئی۔ اور ساری قوم سرمست ہو کر جھوم گئی۔ کیونکہ یہ آواز اس کے اپنے دل کی صدا کی بازگشت تھی۔ اپنا گایا ہوا راگ کس کو میٹھا نہیں لگتا۔ اپنی بنسری کی دھن پر قوم خود ناچنے لگی۔ جگہ جگہ دوکانیں کھلنے لگیں۔ مگر ہندو پریس کا شور رنگ لایا۔ ہندو انگریز میں مالیات کے متعلق کچھ ذہنی اتحاد ہے۔ ستم ظریف حکومت نے اس مجلسی تحریک کو شر انگیز قرار دیا۔ افسرانِ ضلع کے نام احکام صادر کر دیئے کہ اس اقتصادی تحریک کو کچل دینا چاہیئے۔ افسرانِ ضلع کا مزاج مشرق کے روایتی معشوقوں کی طرح نازک ہوتا ہے۔ وہ کسی معقول بات کو سننا گوارا نہیں کرتے۔ ہم نے ہر چند کہا۔ کہ اس تحریک کو سیاسیات سے کوئی علاقہ نہیں۔ مگر ان میں تاب سخن کہاں۔ غریب لوگ افسران کے ہاتھ میں شاہین کے پنجہ میں شکار کی طرح عاجز اور بے بس ہوتے ہیں۔ نئے مسلم دوکانداروں پر آفت آ گئی۔ متعدد مقامات پر ان کی گرفتاریاں کر لی گئیں۔ اور مدتوں مقدمات چلتے رہے۔ حکومتِ وقت کے خلاف صف آرا ہونا اور باوجود افسران کی سختیوں کے تجارت کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ساری تحریک کو دھکا لگا۔ خاص کر کانگریسی حلقوں کی طرف سے ہم ملزم گردانے جانے لگے۔ کہ ہم نے مسلمانوں کو نئی مصیبت میں پھنسا دیا۔ اور ایک فرقہ وارانہ بھوت کھڑا کر دیا۔ ہم نے سر میلکم ہیلی گورنر پنجاب کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ اور بپھر گیا۔ مدتوں تک پریشانیوں میں کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن اتنی بات اور واضح ہو گئی۔ ہندو اور انگریز کا کم از کم اقتصادی تحریکات میں اتحاد ہے۔ انگریز اس خالص مجلسی تحریک کو کسان اور مزدور کی تحریک کی طرح سرمایہ داری کے خلاف ہی بغاوت سمجھتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ دنیا میں اوپر والے اوپر اور نیچے والے نیچے رہیں۔ اور کسی

گوشے سے انقلاب کی آواز نہ اُٹھے۔ مبادا نظامِ سرمایہ داری کی کوئی اینٹ کسی وجہ سے ہل کر ساری عمارت کے دھڑام سے گر جانے کا باعث نہ ہو۔

سُلطان ابنِ سعود

مکّے کا شریف حسین انگریزی تدبیروں کا کامیاب مہرہ تھا۔ جس کے ذریعے سارے عرب میں بغاوت کی آگ پھیلا دی۔ لیکن جنگ کے بعد اپنے سنہری خوابوں کو بالو ریت میں بدلا دیکھ کر انگریز کے خلاف بھی ہاتھ پاؤں ہلانا چاہتا تھا۔ انگریز کی بساطِ سیاست پر ایسے بیسیوں مہرے موجود رہتے ہیں جنہیں وہ ضرورت کے وقت کام میں لانے کے لیے زیر نظر رکھتا ہے۔ اس نے شریف حسین کو ابن سعود سے مات دلائی اور اسے بھی ترکوں کے آخری خلیفہ کا سا انجام دیکھنا پڑا۔ اور غریب الوطنی کی موت قبول کرنا پڑی۔ اب ابن سعود کا سارے عرب میں طوطی بولنے لگا۔ خشک قسم کا وہابی تھا۔ مکّے مدینے میں قدم رکھا۔ تو بھونچال لے آیا۔ قبّوں کو گرا کر ہموار کر دیا۔ اس کام سے شریعت کا اوّل اجرا ہوا۔ ہندوستان میں صاحبِ قبر سے زیادہ قبہ محترم ہے یہاں ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ حج کے موقع پر مولانا محمد علی، سید سلیمان ندوی کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا گیا۔ کہ حالات کی تحقیق کر کے مجلس مرکزیہ خلافت میں رپورٹ کرے۔ مولانا محمد علی مرد مجاہد تھے۔ رائے قائم کر کے دنیا سے برسرِ پیکار ہو کر سب سے منوانا چاہتے تھے۔ مکّے میں پہنچ کر ابن سعود کے گلے کا ہار ہو گئے۔ کہ مرکزِ اسلام میں جمہوریت کا اعلان کر دے۔ وہ دل سے چاہتے تھے۔ کہ کم از کم سرزمینِ پاک ہی میں حکومتِ الٰہیّہ کا نقشہ قائم ہو۔ جہاں شاہ و گدا کا وجود نہ ہو۔ اور اسلامی برادری میں پوری پوری برابری ہو۔ ابن سعود نے انہیں نگاہِ تیز سے دیکھا۔ دونوں طرف سینوں میں مخالفت کے تیر ترازو ہوئے۔ ان کی واپسی پر ہنگامہ اور بڑھا سنّی اور وہابی دست بگریباں ہوئے۔ احرار کے موجودہ گروہ نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ تاہم مجلسِ خلافتِ پنجاب کے طبقہ اولیٰ میں وہابی عنصر زیادہ تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کی چشمک میں وہ مولانا آزاد کا حامی تھا۔ ان کی سرگرمیوں نے سب کو لوٹ کر لیا۔ ہمارے گروہ میں کچھ دودلی سی پائی جاتی تھی۔ ہم شریف حسین کے دیس بدر ہونے پر خوش تھے کہ غدار اپنے انجام کو پہنچا۔ مگر قبّے گرانے کے متعلق متذبذب تھے۔ اس دودلی میں علم و اعتقاد کی جنگ تھی۔ علم کہتا تھا کہ اسلام کے بوریا نشین

بزرگوں نے تو اپنے دوران زندگی میں نہ اپنے مکان کو پختہ اینٹ لگائی۔ نہ کسی کے لگنے دی۔ علم عقل سے اپیل کرتا تھا۔ کہ دیکھو یہ سب قبے اور مقبرے سرمایہ داروں کی سنگ دلی کا نتیجہ ہیں۔ جنہوں نے غریبوں کا خون عمر بھر چوسا اور اپنی دولت کا قلیل حصہ اپنے اعتقاد کی نمائش کیلیے بزرگوں کی قبروں پر لگادیا۔ اور غریب بدستور پڑوس ہیں بھوکے بیٹھے رہے۔ جانتے ہو کہ ایسا کیوں ہوا اس لیے کہ مسلمان بادشاہوں اور شہنشاہوں نے جب غریب مسلمانوں کی ہڈیوں پر سلطنت کی عمارت کھڑی کی۔ اور اپنے آرام و عیش کے لیے محلات تعمیر کیے۔ تو ان پاک بزرگوں کی غریبانہ قبروں کو دیکھ کر شرمندہ ہوئے۔ اور ان قبروں کی سادگی سے اپنے محلات کی مینا کاری کا مقابلہ کرکے کچھ دل ہی دل اداس سے رہنے لگے۔ ان کے لیے آسودہ زندگی بسر کرنے کا اور کوئی سوائے اس کے ذریعہ نہ تھا۔ کہ بزرگوں کی قبریں بھی سرمایہ داری کی ہنستی بولتی تصویریں نظر آئیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عیش محل کا بچا ہوا سامان عمارت ان پاک ہستیوں کی قبروں پر استوار کیا۔ تاکہ دنیا جان لے۔ کہ ان بزرگوں کو غریب عوام سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اگر ان کا ناطہ تھا تو ان امراء اور رؤسا سے۔ دیکھو سرمایہ داروں نے بزرگوں کی قبروں پر نمائش کرکے بھی دین حنیف کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اسی لیے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کا کچا حجرہ گرا کر عالی شان عمارت بنانا چاہی تو دینے کے عوام بچوں کی طرح بلکتے گھروں سے باہر نکلے اور التجا کی کہ خدارا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچی آرام گاہ کو گرا کر پختہ محل کھڑا نہ کرو۔ اسے اسی حال میں رہنے دو۔ تاکہ آنے والی نسلیں اندازہ کر سکیں کہ پیغمبر نبوت نے کس طرح بسر اوقات کی۔ شاید امراء اور رؤسا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان غریبی کو دیکھ کر سامانِ سرمایہ داری سے نفرت کریں۔ لیکن امرا بنو امیہ کو تو محلات میں رہنے کا جواز چاہیے تھا۔ جس امت کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا ہو اور ایک ٹاٹ اور کھاٹ جس کے گھر کا سامانِ آسائش و آسائش ہو اس امت کے افراد سرمایہ دارانہ زندگی کیسے بسر کریں۔ عوام کی نظروں سے دین کے والی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سادہ قبر کو سجا کر ہی اپنے محلات کا جواز ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ انہوں نے لوگوں کی آنسو بھری اپیلوں کی کچھ پروا نہ کی۔ سیدہ عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے پاک حجرے کو گرایا اور اس پر پختہ عمارت تعمیر کردی۔ تاکہ سادگی پسند اور غریب کی اصل زندگی کی طرف مسلم عوام کا دھیان ہی نہ جائے۔ اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اصل حال میں ہوتی تو اس کی زیارت سے سرمایہ داروں کے خلاف مسلمانوں کی نفرت

قائم رہتی۔ اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کے چکنا چور ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ بنابر این نبی پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے فرماں بردار ساتھیوں کو ایک امیر کبیر اور سرمایہ داروں کے طور طریقے رکھنے والے ظاہر کرنا ان کے لیے بے حد مفید تھا۔ اب جبکہ مسلمان عوام کی دل و دماغ کی ساخت سرمایہ داری کی مشین پر تیرہ سو برس ڈھل کر بدل گئی۔ تو ابنِ سعود کا ظہور ہوا۔ عوام کی عقیدت اب نشانِ سرمایہ داری سے ہو گئی۔ اور سرمایہ داری کا جادو چل چکا تھا۔ اب قبے گرے تو مسلمان عوام نے سمجھا کہ دین کی بنیادیں ہل گئیں۔ خدا کا سادہ دین تو نگاہ سے اوجھل ہو چکا تھا۔ یہی کچھ اسلام تھا جو ان کی آنکھوں کو نظر آتا تھا۔ عالی شان عمارتوں کا گر جانا، دین کی عمارات کا گر جانا قرار پایا۔ مسلمان مسجدوں میں آہ و زاری کرنے لگے۔

بیچارہ ابن سعود بھی سرمایہ دارانہ ماحول کا پرورش یافتہ تھا۔ اُسے خود اسلام کا منشا معلوم نہ تھا۔ اس نے چند قبے گرائے مگر خود شاہانہ بسر اوقات کرنے لگا۔ اس بھلے آدمی سے کوئی پوچھے۔ کہ اگر تمہیں خود محلات میں رہنا ہے تو قبوں کو گرانے سے کیا مطلب ہے لیکن اصول کو سمجھ کر فروع کی پیروی کرنے والے دنیا میں خدا کے خاص بندے ہوتے ہیں۔ وہ شاہانہ لباس اور بادشاہی سطوت کو نگاہِ نفرت سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ جلوے اسلام کی ضد ہیں۔ غرض نہ قبے گرانے والوں نے نہ اس پر رونے والوں نے اپنے عمل کی حقیقت کو سمجھا۔ ورنہ اگر قبے گرانے تھے۔ تو پہلے اپنے محلات کو مسمار کرکے ہموار کرتا۔ اور شاہانہ تزک و احتشام چھوڑ کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا اسلوب اور اصول اختیار کرتا۔ حالات متذکرہ کے پیش نظر تو ہم خاموش رہے۔ مگر مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کے پیرو کار گروہوں میں خوب چلتی رہی۔ مولانا آزاد کی ہمدردیاں مسلمہ طور سے ابن سعود کے ساتھ تھیں۔ مولانا حسرت موہانی نے خوب سرگرمی دکھائی۔ اور ان کے مقابلے میں طبیعت کے تقاضوں سے مجبور مولانا ظفر علی خان بیچارے ابن سعود کے لیے کراچی میں ذلت اٹھاتے رہے۔ ان سب جھگڑوں اور اختلافات کا آخری نتیجہ پنجاب مجلس خلافت کی مرکز سے علیحدگی ہوا۔ کیونکہ مولانا عبدالقادر قصوری اس وقت جماعت کے لیڈر تھے۔ اور جماعت اہل حدیث میں بھی ان کا خاص درجہ تھا اور مولانا آزاد سے گہرا تعلق بھی۔

میری ذات کا جھگڑا

غرض ۱۹۳۰ء ختم ہو کر ۱۹۳۱ء کا آغاز ہوا۔ تو ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی ساری امیدوں پر پانی پھر چکا تھا۔ دوسری طرف مجلس خلافت جو مسلمانوں کی بڑھتی مرادوں اور اُٹھتی امنگوں کا مرکز تھی، جسد بے جان ہو کر رہ گئی۔ ہم کانگریس اور خلافت دونوں جماعتوں کے عہدیدار تھے۔ اب خلافت مرکزیہ سے علیحدگی کے باعث صرف کانگریس کے رکن رہ گئے جیسا ابتدا میں ذکر ہوا۔ مجلس احرار کے موجودہ گروہ نے باوجود مولانا محمد علی شوکت علی گروپ کی پوری علیحدگی اور مسلم کانفرنس بنانے کے مسلمانوں کی کانگریس کے لیے قربانیوں میں زیادہ فرق نہ آنے دیا۔ میری بدقسمتی کہ مولانا آزاد جب خود گرفتار ہوئے۔ تو اپنی جگہ پُر کرنے کے لیے بغیر میرے مشورے کے مجھے نامزد کر گئے۔ باوجود اس کے کہ خرابی صحت کی بنا پر میں جیل نہ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے خلاف قانون اجلاس منعقدہ دہلی میں شامل ہو کر ڈاکٹر انصاری پریذیڈنٹ، پٹیل، پنڈت مالویہ اور دوسرے دوستوں کے ساتھ گرفتار ہو کر سزایاب ہوا۔ اس کے بعد گاندھی اِروِن پیکٹ کی بنا پر سب اسیران سیاسی کی رہائی عمل میں آئی اور کراچی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ مہاتما گاندھی نے مولانا آزاد اور مولانا عبدالقادر قصوری کے مشورے سے ڈاکٹر عالم کو نئی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کر دیا۔ ان کا نام زبان سے نکلتے ہی سارا پنڈال مخالفانہ آوازوں سے گونج اٹھا۔ جو لوگ پنڈال میں موجود تھے۔ میں ان کی دیانت داری پر بات چھوڑتا ہوں۔ کہ وہ شہادت دیں۔ کہ آیا وہ مخالفت کیا کسی پہلے سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھی؟ میرا یقین ہے کہ ایسا نہ تھا۔ میں دیانت داری سے اعلان کرتا ہوں۔ کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کی نامزدگی کا گاندھی جی کے اعلان ہی سے پتہ لگا۔ البتہ مجھ سے یہ بھول ضرور ہو گئی۔ کہ میں مہاتما گاندھی سے وہیں سب کے سامنے یہ کہہ بیٹھا۔ کہ مولانا عبدالقادر ہی کو نامزد کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ یہ نہیں کہ میں ڈاکٹر صاحب کے پھلنے پھولنے سے خار کھاتا تھا۔ بلکہ دانا دوست کی طرح اس بلندی پر جانے سے ضرور روکنا چاہتا تھا۔ جہاں چڑھ کر گرنے سے اس کی شہرت اور ساتھیوں کی عزت میں فرق آتا۔ بہت سی خوبیوں کے ساتھ ان میں بعض ایسی کمزوریاں ہیں جو نزدیک رہنے والوں کو نظر آتی ہیں۔ ورنہ دُور کے ڈھول تو ہر شخص کو سہانے معلوم

ہوتے ہیں۔

بس میری اتنی سی کہی کی ڈاکٹر صاحب نے دل میں گرہ باندھ لی۔ مولانا عبدالقادر نے نہ میری سُنی نہ گاندھی جی کی مانی مجھے ملال ہوا کہ ایک دانا نادانی کر رہا ہے اور جان بوجھ کر مکھی نگلنا چاہتا ہے۔ بعض دفعہ تو بدظنی نے یہاں تک کہا۔ کہ مولانا کو ڈاکٹر صاحب سے "بیر" لینا مقصود ہے اور وہ چاہتے ہیں۔ کہ یہ بڑی بلندی سے ایسا گرے کہ گر کر اٹھنا محال ہو جائے۔ سچ پوچھو تو وہ ایسا گرا کہ سیاسیات میں بے ٹھکانے ہو گیا۔ باوجود فطرتی اور سیاسی اختلاف کے مجھے ان سے بے حد محبت ہے۔ نقائص سے کس کی ذات پاک ہے؟ میں جو قلم لے کر محاسبہ کر رہا ہوں کہاں کا فرشتہ ہوں؟ بس اللہ کی ذات پاک ہے۔ یا وہ جن کا دامن خدا خود بچائے۔

یہ چھوٹا سا واقعہ غلط طور سے احرار اور کانگریس کے سیاسی تعلقات میں اہمیت اختیار کر گیا۔ آنے والے واقعات نے اس رائی کو پہاڑ بنا دیا۔ اگرچہ نہرو رپورٹ دریائے راوی کی نذر کر دی گئی تھی۔ تاہم ڈاکٹر انصاری مرحوم برابر اس کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے غوطے لگا رہے تھے۔ وہ سکھوں کی کبھی نہ مطمئن ہونے والی قوم کو کچھ مزید حقوق دے کر مطمئن کرنا چاہتے تھے۔ احرار گروپ کے لیے مشکل یہ تھی وہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں میں مقبول بناتے وقت کافی زخم اٹھا چکا تھا۔ اب اس کی قوت برداشت کسی مزید بوجھ کی متحمل نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر مرحوم نے بطور کانگریس کے صدر اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر فرید پور میں ہنگامی تقریر کی اور سکھوں کو نہرو رپورٹ کی تجویزوں سے زیادہ حقوق دینے کا اعلان کر دیا۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ نیک دل ڈاکٹر نیک نیت لیڈر کی طرح کچھ گھر سے دے کر جھگڑا چکانے کی امید میں ہمیں از سر تو کانٹوں میں گھسیٹ کر پھر سانپوں سے کھیلنے کے لیے جا رہا ہے۔ میں نے بھی مدرسے کی مار سے ڈر کر جماعت سے بھاگ جانے والے لڑکے کی طرح استعفا کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کو لکھ دیا۔ کہ پنجاب کے سودے میں نورتی کی گنجائش نہیں آپ دھڑیاں تول رہے ہیں؟ جب قوم نے نہرو رپورٹ کو نہ مانا تو مزید حقوق دینے پر اس کو کیسے آمادہ کر سکیں گے؟ اس لیے میں پنجاب کی سیاسی گتھی سلجھانے میں اور گنجائش نہ پا کر مستعفی ہوتا ہوں۔

میری عام عقل تقاضا کرتی تھی۔ کہ جب نہرو رپورٹ ایک لاوارث کی موت مر چکی ہے۔ تو اب مخلوط انتخاب کی قبر پر مجاور بن کر بیٹھ رہنا کہاں کی دانائی ہے؟ ہم نے نہرو رپورٹ کے ذریعے سیاسیات میں پہلی دفعہ مخلوط انتخاب کے

تصور کو اپنایا۔ جب ہم ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ پر چلے تھے۔ تو اس سے چند دن قبل پنجاب خلافت کمیٹی نے علیحدہ انتخاب پر قائم رہنے کا ریزولیوشن خاص طور پر منظور کیا۔ مولانا مظہر علی خود لکھنؤ نہیں گئے۔ مگر ان کا فدق یہی معلوم ہوتا تھا کہ علیحدہ انتخاب کے علاوہ کوئی اور صورت قطعی منظور نہ کی جائے۔

مولانا ظفر علی خان۔ ڈاکٹر عالم۔ میاں سراج الدین پراچہ نے لکھنؤ پہنچ کر جان کی بازی بدھلی۔ کہ ہم مخلوط انتخاب کے بغیر دم نہ لیں گے۔ مولانا عبدالقادر۔ غازی عبدالرحمٰن۔ مولانا داؤد۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے اپنے دل کے دروازے کھلے رکھے۔ کہ رپورٹ پر مزید غور کر کے رائے قائم کی جائے۔

میرا اس رپورٹ کو پڑھ کر ذہن یہ ہوا۔ کہ پنجاب کے ہندو اور سکھ اس رپورٹ کی بنیادوں کو قبول نہ کر سکیں گے اور یہ وقت ہے۔ کہ ہم ہندو اور سکھ کی صداقت کا امتحان کریں۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے ہم مرکز میں فیڈریشن کی انتہائی صورت قبول کر کے صوبوں کو مکمل آزادی دی جانے کے حق میں تھے۔ اور بنا بر رائے وہند گئی بالفان مخلوط انتخاب کو منظور کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بظاہر اس میں مسلمانوں کا کوئی نقصان نظر نہ آتا تھا۔ مولانا مظہر علی اور سید عطاء اللہ شاہ صاحب کو بدقت تمام نہرو رپورٹ پر رضامند کر لیا گیا۔ مگر چار سال کے تجربے کے بعد معلوم ہوا۔ کہ پنجاب کے ہندو اور سکھ تو اس رپورٹ کو صبح۔ یمن کا منہ دیکھنے کے برابر اپنے لیے بدفال سمجھتے ہیں۔ ہم اس مُردے کو کہاں تک چھاتی سے بندریا کی طرح چمٹائے پھریں؟

میں نے ہندو پریس اور ہندو اور سکھ دوستوں کا عجب ذہن پایا۔ وہ نہرو رپورٹ کو قبول بھی نہ کرتے تھے۔ اور یہ بھی نہ چاہتے تھے۔ کہ مسلمان کانگریسی کارکن مخلوط انتخاب کے خلاف اعلان کریں۔ نہرو رپورٹ کے مُردے کو راوی گھاٹ جلانے اور راکھ کو اس کی لہروں میں بہانے کے بعد ہندوؤں کا توقع تھا۔ کہ وہ کسی شوشتی کی طرح نہرو رپورٹ کی چتا میں جل کر راکھ ہو جاتے۔ یا کسی لاجونتی کی طرح عمر بھر اس کی یاد میں رویا کرتے۔ مگر یہ کام انہوں نے مسلمانوں کے سپرد کرنا چاہا عدت کے دن پورے کرنے کے بعد بیوہ کو دو دن گھر بٹھانا اسلامی منشاء کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور بیوی کی موت کے دس دن بعد ایمان کو بذریعہ شادی قائم رکھنے کے لیے فکر مند ہوتے ہیں ہم نے بھی دوستی کا حق ادا کیا۔ نہرو رپورٹ کے گویا گزم کے بعد تک برابر ماتم کیا۔ اور "ہائے مخلوط انتخاب" "وائے مخلوط انتخاب" پکارتے رہے۔ آخر بالوں کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہونے لگی۔ پھر دھیان آیا صبر کرو۔ اور محبت کی خیالی دنیا

سے نکل کر عمل کی دنیا میں آؤ۔ عشق کی راہوں میں پڑ کر ناکارہ بیٹھ رہنے سے کیا فائدہ۔ پچھلے تجربے کی روشنی میں عمل کی نئی راہ تلاش کرو۔

"پھر علیحدہ انتخاب"

کانگریس کمیٹیوں کے نئے انتخاب شروع ہوئے۔ امرتسر میں غازی عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر کچلو ایک مملکت میں دو سرداروں کی طرح حریفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ایثار پیشہ اور زبان آور تھا لیکن اس کی سعی و عمل کا دائرہ زیادہ تر ہندو اور سکھ حلقہ تھا۔ وہ مسلمانوں سے نامانوس تھا۔ لیکن آزادی کا دلدادہ ہونے کے باعث مسلمانوں میں نامقبول بھی نہ تھا۔ غازی صاحب کا سارا کام اور نام مسلمانوں میں تھا۔ وہ زبان آور اور توڑ جوڑ کا آدمی تھا۔ کچلو کو سیاسیات میں تنگ تو کر سکتا تھا لیکن بے دخل کرنے کے ذرائع پر قادر نہ تھا۔ جس ایثار پیشہ شخص کی پشت پر سرمایہ ہو وہ مفلس مخلص کو ناک چنے چبوا سکتا ہے۔ امرتسر کی صدارت کے لیے ان دونوں میں رسہ کشی ہوئی۔ ادھر شہر کی سرمایہ دار ہندو آبادی ڈاکٹر کچلو کی پشتیبان تھی۔ اور غازی صاحب کے ساتھ محض مباحثے۔ گامے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ پولنگ افسر تھے۔ سرمائے نے زور دکھایا۔ بے زری بے بسی کے دانت نکالے کھڑی تماشہ دیکھتی رہی۔ ہندو ہجوم نے شاہ صاحب کو بھی دھر لیا۔ عجب ہنگامہ ہوا۔ شاہ صاحب تو پہلے ہی مخلوط انتخاب کے متعلق کچھ زیادہ پرجوش نہ تھے۔ انہیں اس واقعہ سے اور عبرت ہوئی۔ انہوں نے علیحدہ انتخاب کے لیے ایک ریزولیوشن مرتب کیا۔ غازی صاحب کی اس میں کھلی تائید شامل تھی۔ میں یہ ریزولیوشن امرتسر سے لے کر لاہور مولانا مظہر علی کے پاس آیا۔ ان کا حال شاہ صاحب کی طرح تھا۔ کہ وہ مخلوط انتخاب پر پہلے ہی زیادہ خوش نہ تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو گاندھی ارون پیکٹ کے ماتحت بھی گورنمنٹ نے ایک خطرناک شخصیت قرار دے کر رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کی آمد کا کچھ دن اور انتظار کیا گیا۔ نہرو رپورٹ کے کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد ہمارے مخلوط انتخاب کو چمٹے رہنے کو نامناسب سمجھ کر علیحدہ انتخاب سے وابستگی کا احرار کانفرنس میں اعلان کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن کی صدارت میں "حبیبیہ ہال" لاہور میں "احرار کانفرنس" کی گئی اور کامیاب رہی جن کے لیے صلح کے قدم بڑھائے تھے۔ انہوں ہی نے صلح کا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور نہرو رپورٹ

پر دستخط کر کے مکرے تو لوٹ کر اپنے گھر واپس آنا ہی دانائی تھا۔ مگر ہندو پریس نے بڑا واویلا مچایا کہ احرار کانگرس کے غدار ہوگئے۔ ہم حیران کہ کس غلط الزام ہیں دھرے جارہے ہیں؟ نہ کوئی سکھوں کو مطعون کرنے والا تھا۔ نہ ہندوؤں سے بازپرس کرنے والا۔ جنہوں نے نہرو رپورٹ سے خود بغاوت کی تھی۔ وہی علیحدہ انتخاب پر ہمیں ملامت کرتے تھے۔ عجیب بے انصاف دنیا ہے۔ کہ جو عمل خود کھلے بندوں کرتی ہے اسی کا طعنہ اوروں کو دیتی ہے۔ خود نہرو رپورٹ کو قبول نہ کیا اور ملک میں فتنہ پیدا کیا۔ ہمارے اعلان پر جو نہرو رپورٹ کو غرق آب کرنے کا قدرتی نتیجہ تھا۔ آسمان سر پر اٹھا لیا۔ یہ کیا انصاف ہے کہ تم مخلوط انتخاب کے کسی فارمولا کو تسلیم نہ کرو۔ اور ہمیں علیحدہ انتخاب پر دھر رگڑو۔ لیکن طاقت کے غرور میں انصاف کی کون پروا کرتا ہے۔ ہندوؤں کا پریس مضبوط تھا۔ کانگرس اپنے عروج پر تھی۔ احرار بیچارے چکی کے دو مضبوط پاٹوں میں بری طرح پسے جارہے تھے۔

"جواہرلال اور احرار"

حالانکہ اس ریزولیوشن کی ترتیب میں میرا کچھ حصہ نہ تھا۔ مگر ڈاکٹر عالم اور کچھ دوسرے آدمیوں کو ناجائز شبہ گزرا۔ کہ اس ریزولیوشن کا مجوز میں ہوں۔ اور کانگریسی حلقوں میں پروپیگنڈا کیا گیا۔ کہ احرار پارٹی کا بانی افضل حق ہے۔ اور کانگریس سے بگڑ کر بہ اس لیے بنائی ہے۔ تاکہ ورکنگ کمیٹی کا ممبر نہ لیے جانے کا انتقام لے سکے۔ حالانکہ سب دوست جانتے ہیں۔ کہ میں اپنے حال میں خوش رہنے والا شخص ہوں۔ ۱۲ برس سے احرار میں ہوں۔ مگر معمولی حیثیت سے کام کرنے پر مطمئن ہوں۔ کبھی عہدے کی آرزو نہیں کی۔ اگر ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہونا فخر ہے۔ تو یہ فخر تو نمایاں طور سے مجھے حاصل ہو چکا تھا اور اس تاریخی ورکنگ کمیٹی کا ممبر رہ چکا ہوں جو خلافِ قانون قرار پاکر سزایاب ہوئی تھی اور جس میں کانگریس کے قابلِ عزت افراد شامل تھے۔ اگر یہی میری آرزو تھی۔ تو اس کی تکمیل بوجہ احسن ہوگئی تھی اب اور کیا چاہیے تھا؟ مگر شبہات پیدا کرنے والی سرگوشیاں فرشتہ لوگوں کو بھی بدظنی پر مائل کر دیتی ہیں۔ چنانچہ کانگرس کے فرقہ وار لیڈروں نے ہماری جماعت کے مقتدر لیڈروں کو بلا کر انہی سرگوشیوں کے زیر اثر کہا۔ کہ ہوشیار افضل حق بہت بڑی رقم کے عوض سر فضل حسین کے ہاتھ بک گیا ہے۔ خدا خوش رکھے میرے ساتھیوں کو۔ انہوں نے ناراض ہو کر جواب دیا کہ گفتگو یہیں ختم کر دی جائے۔ اس کی سیرت میں ہم ایسی خامی نہیں پاتے۔ مگر بُری

خبر اور بدظنی پر پرواز پیدا کر کے ہر جگہ پہنچتی ہے۔ پنڈت جواہرلال نے سنی تو "میری کہانی" میں نام لیے بغیر مجلس احرار کے معرض وجود میں آنے کا سبب ورکنگ کمیٹی کی ممبری کو قرار دیا۔ بعض دانا بھی کیسی نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر کون سا قلم للؤں جو جواہرلال جیسے سرمایہ دار سوشلسٹ لیڈر اور مصنف کے نقشِ باطل کے ساتھ حرفِ غلط کا سا سلوک کر سکے۔ میاں سر فضل حسین ایک ہوشیار سیاست دان تھا۔ گو ہم آٹھ برس اکٹھے کونسل میں رہے تھے تاہم سیاسی پتّی کتّے کا بیر رہا۔ ایک دوسرے کی عزت کرنے کے باوجود سیاسیات میں ہمیشہ بطور مخالف کے کام کیا۔ سر ظفر اللہ کی تقرری کے بعد تو دلوں میں تلخی پیدا ہوگئی۔ غرض میری اور ان کی زندگی میں باہم تعاون کا کبھی موقع نہیں آیا۔ یہ جواب تو ان کانگرسی لیڈروں کے لیے ہے جنہوں نے میرے عزیز دوستوں کو بلا کر مجھ سے بدظن کرنے کی سعی ناکام کی۔ مگر جواہرلال کے ملفوظات کا سوائے صبر و شکر کے کیا جواب دوں۔ ہاں ہمارے متعلق ان کی رائے دوست و دشمن دونوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔ جو درج ذیل ہے اور خاص اہمیت کی چیز ہے:

"کراچی کانگریس کی آخری کارروائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی۔ کہ اس نے آئندہ سال کے لیے نئی ورکنگ کمیٹی منتخب کی۔ اس کمیٹی کا انتخاب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کرتی ہے۔ مگر کچھ عرصے سے یہ طریقہ رائج ہوگیا ہے۔ کہ جو شخص کانگریس کا صدر ہوتا ہے۔ وہ گاندھی جی اور کبھی کبھی بعض اور رفیقوں کے مشورے سے ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے نام تجویز کرتا ہے۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں جو ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا۔ اس سے ایک ناخوش گوار نتیجہ پیدا ہوا۔ جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بعض ممبروں کو اس انتخاب پر خصوصاً ایک مسلمان کے نام پر اعتراض تھا۔ شاید انہیں یہ شکایت بھی تھی۔ کہ ان کے حلقے میں سے کوئی بھی نہیں لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ پندرہ (۱۵) آدمیوں کی آل انڈیا کمیٹی میں ہر گروہ کی نمائندگی ناممکن تھی۔ اور اصل نزاع جس کا ہمیں کچھ علم نہیں تھا محض ذاتی اور مقامی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اعتراض کرنے والا گروہ رفتہ رفتہ کانگریس سے علیحدہ ہوگیا۔ اور اس نے مجلس "احرار" کے نام سے اپنی ایک انجمن بنالی۔ پنجاب کے بعض نہایت سرگرم اور ہر دل عزیز مسلمان کانگریسی کارکن اس انجمن میں شریک ہوگئے۔

اور انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ لوگ زیادہ تر نچلے اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کا عام مسلمانوں پر بڑا اثر تھا۔ یہ ایک زبردست انجمن بن گئی۔ جو اونچے طبقے کے فرقہ پرست مسلمانوں کی فرسودہ جماعت سے کہیں زیادہ قوت رکھتی تھی۔ اس لیے کہ اس جماعت کی کارروائیاں محض ہوائی تھیں یا یوں کہنا چاہیے کہ محض دیوان خانوں اور کمیٹی کے کمروں تک محدود تھیں۔ لازمی طور پر احرار کی انجمن رفتہ رفتہ فرقہ پرستی کی طرف مائل ہو گئی۔ مگر چونکہ ان کا تعلق عام مسلمانوں سے تھا۔ اس لیے وہ ایک زندہ جماعت تھی۔ اور بعض مبہم معاشی خیالات بھی رکھتی تھی۔ آگے چل کر دیسی ریاستوں خصوصاً کشمیر کے مسلمانوں کی شورشوں میں جہاں بدقسمتی سے معاشی شکایتیں فرقہ پرستی میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ احرار نے بہت اہم حصہ لیا۔ احرار پارٹی کے بعض لیڈروں کے کانگریس سے الگ ہو جانے سے پنجاب کی کانگریس کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر کراچی میں ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے الگ ہو جانے کی وجہ صرف وہ ناراضی ہی نہیں تھی جو ورکنگ کمیٹی کے انتخاب سے پیدا ہوئی۔ یہ تو محض علامت تھی جس سے صورت حال کا اظہار ہو گیا۔ اصل اسباب کچھ اور تھے۔"

جہاں تک ورکنگ کمیٹی کی ممبری کا احرار کے معرض وجود میں آنے سے تعلق ہے۔ یہ تحریر ایک گرہ کشائی ہے جس میں پنڈت جواہر لعل باوجود سب کچھ کہہ کر نہ کہنے کے دعویدار ہیں۔ الزام دے کر خود دامن بچا جانے والے لوگوں کی برپا کردہ مصیبتوں سے خدا سب کو بچائے۔ میری ذات سے الگ احرار کی صفات کے متعلق پنڈت کا بیان ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تہ کو پہنچنے کے لیے اچھے دل و دماغ کی ضرورت تھی۔ شاید احرار کے بہترین ہمدردوں نے احرار ذہن و مزاج کو اس طرح صاف نہ سمجھا ہو۔ احرار کی ساخت اور ذہنی افتاد کا پورا تجزیہ کرنے سے پہلے ضرورت ہے۔ کہ میں شخصی بحث کو یہ کہہ کر ختم کر دوں۔ کہ اگر میرے اشارے کو سمجھ کر محترمی ڈاکٹر صاحب کے علاوہ کسی کو ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنا دیا جاتا تو خود کانگریس اور ڈاکٹر صاحب کے لیے بہتر ہوتا۔ لیکن "نچلے طبقے کے لوگوں" یعنی بقول پنڈت جواہر لعل احرار کے نیک مشورے کو پائے حقارت سے ٹھکرا دینا ارباب اقتدار

کے بس میں تھا۔ مگر اپنے غلط عمل کے نتائج سے بچ نکلنا مشکل ہو گیا۔ باوجود ڈاکٹر عالم صاحب کی بہت سی خوبیوں کے کانگریس اور ان میں نباہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں کانگریس اور گاندھی جی کے لیے تلخ تجربوں کا بہت بڑا سرمایہ فراہم کر دیا۔ ہم میں سے کوئی نہ ان کی ترقی کو درجات پر خار کھانے والا تھا اور نہ عہدوں کے لیے بے تاب تھا۔ ہم نے بھولے سے گاندھی جی کو ایک نیک مشورہ دیا۔ اس کو قبول نہ کر کے خود ہی کانگریس نے تھوڑے عرصے کے بعد اس کی صحت کی تصدیق کر دی۔ مجلس احرار تو اس واقعہ سے تین[۳] سال پہلے بن چکی تھی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کسی آزادانہ اقدام کا اسے موقع نہ ملا تھا۔

البتہ نہرو رپورٹ کے غرق آب ہونے کے نتیجے کے طور پر جب ہم علیحدہ انتخاب پر واپس چلے گئے۔ تو ہندو پریس نے جو شور قیامت اٹھایا۔ اس نے ہماری پوزیشن کو علیحدہ جماعت کے طور پر نمایاں کر دیا۔ اس شور و شر سے خیر کی صورت پیدا ہوئی۔ ہمیں خود اپنے الگ وجود کا احساس ہو گیا۔ اور ہم اپنے نفع نقصان کو خود سوچنے لگے۔ اپنی منزل معین کر کے ناتواں قافلے کے قافلہ سالار بن گئے ؛؛

باب ۲ دوم

الگ آغازِ سفر

جولائی ۱۹۳۱ء

تم نے آخر پنڈت جواہر لعل کی زبانی "میری کہانی" میں احرار کے متعلق سچ سُن لیا کہ یہ لوگ زیادہ تر نچلے اور اوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ فی زمانہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنا کتنی ذلّت کی بات ہے؟ لیکن ہم کسی حال میں احرار کی ذات کو اس ذلّت سے نہیں بچا سکتے۔ پھول کے ساتھ کانٹا ضرور ہو گا۔ احرار کا یہ گروہ زمانے اور حالات سے بغاوت کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر ہماری بغاوت کامیاب ہوگئی۔ تو جن کی آنکھوں میں آج خار کی طرح کھٹکتے ہیں۔ پھول کی طرح ان کی دستار کی زینت بنیں گے۔ لیکن ہم انتظار اور آرزو میں آہیں بھر کر زندگی کے دن پُورے کرنے نہیں آئے۔ ہم میں سے سب سے بااثر دوستوں نے برملا سٹیج پہ کہا کہ احرار غریبوں کی جماعت ہے۔" ایک تو اس لیے کہ مجلس احرار کی حقیقت یہی ہے۔ دوسرے یہ آوازہ غریبوں کی طرف سے سرمایہ داری کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ میں ڈرتا تھا۔ کہ برملا ایسا کہنا مصیبتوں کو دعوت دینا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جوشِ خطابت میں ہم اپنی کہی بات کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھیں۔ اور جب اس کا دردناک نتیجہ بھگتنے کا وقت

آئے تو گھبرا جائیں۔ غریب ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کو اکثر دنیا میں امن نہیں ملا۔ لیکن میری ہزار احتیاطوں کے باوجود شیروں نے روباہ مزاجی اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ اور برابر غریب جماعت کے ادنیٰ فرد ہونے کا اعلان کرتے رہے۔

آسمان نے کہا۔ کہ تم سچ مچ اس دعوے پر قائم ہو؟ تو آؤ میدان امتحان میں اترو۔ کشمیر کے مسلمانوں کی دردناک پکار کیا تم نے سُنی۔ اور کیا اُن کی آشفتہ حالی کا جائزہ لیا؟ مصر کے فراعنہ کی تاریخ موجودہ ریاستی مزاج میں دہرائی جا رہی ہے۔ خطۂ جنت نشان میں مسلمان بنی اسرائیل کی سی ذلت اور مصیبت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ بے شک کچھ دھیمی سی آوازیں سنی گئیں۔ مدد کے لیے۔ کچھ آہستہ سی پکار کانوں تک پہنچی۔ احرار کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ مگر اس کام کا بیڑا کون اٹھائے؟ اب تک تو ہم سپاہی تھے۔ اچانک فوج کی کمان سنبھالنے کے لیے جو حوصلہ درکار ہوتا ہے، شاید اس کی کمی کے باعث کمر ہمت باندھ کر چل دینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ابھی جیلوں سے نکل کر آئے تھے۔ طبیعت میں تھکن تھی۔ گھروں کا حال میر مرحوم کے دوائتی گھر کا سا تھا۔ ایسے وقت میں کون انسان ہے جو پریشان نہ ہو۔ ورکنگ کمیٹی کیا تھی۔ ہر ممبر تذبذب کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ ہم میں خواجہ غلام محمد کم عمر من چلا ممبر تھا۔ وہ ہر وقت سانپوں سے کھیلنے اور آگ میں کودنے پر آمادہ رہتا تھا۔ کہا گھنگھور گھٹا کا پہلا قطرہ بننے پر میں آمادہ ہوں۔ جی نہ چاہا کہ ایک عزیز از جان نوجوان کے کندھے پر بوجھ ڈال کر خود سبکدوش ہونے کی سعی کی جائے۔ مناسب سمجھا کہ چند سے اور تیل دیکھیں تیل کی دھار دیکھیں۔ پھر مل کر حالات کا جائزہ لیں۔ شاید کوئی صورت سمجھ میں آ جائے۔

پامال روشوں پر انسان بے کھٹکے چل نکلتا ہے۔ جانے بوجھے ہوئے راستوں پر چلنا سب کے لیے آسان ہے مگر جو راہ کبھی دیکھی نہ ہو اس سے سب کو جھجک آتی ہے۔ کہ کیا جانے پہلے ہی قدم پر کیا قیامت چھپی ہو؟ ہر گھاس میں ناگ اور جھاڑی کے پیچھے شیر کا گمان گزرتا ہے۔ انگریزی حکومت کے خلاف صف آرا ہو تا آزمائے میدان میں اترتا تھا۔ ریاستی دنیا ایک پوشیدہ جہان تھا اندھیرے میں چھلانگ لگاتا جان پر کھیل جانا ہے کیا جانے کہاں قدم پڑے۔ کس گڑھے میں گرے۔ اہلِ خطہ کی دھیمی آوازیں خاموش ہو گئیں اور پھر ہم سب کی آنکھیں آزادی وطن کے مسئلے کی طرف منعطف ہو گئیں۔ ہم مہاتما جی اور کانگرس کی لندن کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے

خلاف تھے۔ اور چاہتے تھے۔ کہ کانگرس کا جنگی ذہن اور انقلابی شعور جوں کا توں قائم رہے۔ اور کہیں یہ جماعت بھی پھسل کر تعاون کی دلدل میں نہ پھنس جائے۔ کیوں کہ انگریزی حکومت سے ٹکرانے کا ایک ذوق سا طبیعت میں پیدا ہو چکا تھا اس لیے گاندھی جی کو اپنے تعاون کا یقین دلانے کے لیے سید عطاء اللہ شاہ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بمبئی گئے۔ لیکن مہاتما جی کی روح لندن کے متعارف کوچوں کی دوبارہ سیر کے لیے بے تاب تھی۔ چھوٹا بھائی بڑے بھیا کو کھل کر مشورہ نہیں دے سکتا۔ گورو کو کون کہے کہ بوڑھے بابا کرم کرو۔ انگریزی عنکبوت کے تاروں میں مکھی بن کر نہ پھنسو۔ مہاتما جی نے ہماری کراچی میں نہ سنی وہ بمبئی میں کیا سنتے؟ بڑوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ مہاتما جی کی مصلحتیں یا وہ جانیں یا اُن کے گھر کے یار سمجھیں۔ ہم تم کون ہیں جو آفتاب کو چراغ دکھائیں؟

کشمیر میں شورِ قیامت

اس دوران میں کشمیر پھر دیوارِ گریہ بن گیا۔ سری نگر نے خونِ شہدا کے باعث کربلا کی سی صورت پیش کی۔ مولانا مظہر علی[1] کچھ تاریخ کربلا کی رعایت سے بے تاب ہونے اور اقدام کی سوچنے لگے۔ ابھی ہماری سست فکری کسی منزل پر نہ پہنچی تھی کہ کچھ عافیت کوش مسلمان شملے کی بلندیوں سے بادل کی طرح گرجے اور حکومت کشمیر پر بجلی بن کر گرنے کی دھمکیاں دینا شروع کیں۔ اور ایک درخواست بھیج کر تحقیقاتی کمیشن کی اجازت چاہی۔ ریاستی حکومت جانتی تھی۔ کہ یہ گرجنے والے برسیں گے نہیں۔ اس لیے درخواست پر نامنظور لکھ بھیجا۔ بہت اچھلے بہت کودے۔ مگر کچھ دیر بعد تھک کر بیٹھ گئے۔ ان خانہ برباد رؤسا اور امرا نے غضب یہ ڈھایا۔ کہ مرزا بشیر محمود قادیانی کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ "جمعیت العلماء" نے ستم یہ کیا۔ کہ اس بشیر کمیٹی سے تعاون کا اعلان کر دیا۔ اس شخص نے اہل خطہ کی یہ خدمت کی۔ کہ مرزائی مبلغ بھیج کر سرکاری نبوت کی اشاعت شروع کر دی۔ اور دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹا۔ کہ پورے اسلامی ہند نے اسے لیڈر مان کر اس کے باپ کی نبوت کی تصدیق کر دی ہے۔ کشمیر کا سادہ دل اور مصیبت زدہ مسلمان ہر کس و ناکس کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ اس لیے بے خبر اہل مذہب کو مرزائی مبلغوں کے ہاتھوں مسلمانانِ کشمیر کے ارتداد کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ میں ان دنوں اپنے گاؤں گڑھ شنکر میں بیٹھا ان واقعات اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس پیدا شدہ

[1] موصوف کے شیعہ مسلک کی طرف لطیف اشارہ ہے۔

صورتِ حال سے گھبرا گیا اور لاہور پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا داؤد غزنوی ٹانگے پر سوار پریشانی سے جا رہے ہیں۔ پوچھا۔ کدھر کا عزم ہے؟ کہا کہ "مرزائی قیادت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہو گی۔ میں شہر کے علماء سے مل کر ان کی قیادت کے خلاف اعلان کرانا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا کہ بھائی "محض کاغذی بم قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کو کافی نہیں۔ اب تو بڑی قربانی ہی مشکلات کا حل ہے۔ سواری چھوڑ دو۔ تاکہ دفتر میں بیٹھ کر تدبر کے گھوڑے دوڑائیں اور ہمت مردانہ سے قسمت پر کمند پھینکیں۔ اور تدبیر سے تقدیر کو بدلیں"۔ اسی دن یا اگلے دن علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں محمڈن ہال میں عمائدین شہر کا جلسہ تھا۔ جس میں کشمیر کی اوس پڑی قسمت زیرِ غور تھی۔ مولانا مظہر علی غالباً مولانا داؤد غزنوی بھی اور میں بھی محمڈن ہال گئے۔ خیال یہ تھا۔ کہ کوئی تدبیر لڑا کر مرزا بشیر کی کشمیر کمیٹی کے مقابلے میں احرار کے حق میں ان لوگوں کی تائید حاصل کی جائے۔ باقی حاضرین طبقہ اُولیٰ سے متعلق تھے۔ وہ احرار کے نام پر حقارت سے منہ بسورتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب احرار کو آگے بڑھانے پر بضد تھے۔ بہر حال ہم بزور بازی ان کا اعلان اپنے حق میں کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ بس تھوڑی سی کھڑے ہونے کو جگہ ملی تھی۔ بیٹھے اور پاؤں پسار کر ساری جگہ پر قبضہ کرنے کے لیے ہمت درکار تھی۔ لیکن اب طبیعتوں میں زیادہ تذبذب نہ تھا۔ احرار سپاہی تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر نئے اقدام کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ احرار لیڈروں کو جیل کی سڑک بہشت کی روشوں کی طرح گل ریز اور عنبر بیز معلوم ہوتی ہے۔ کانگرس حکومت سے ٹکر نہ لینا چاہتی تھی۔ اب ہم سب کشمیر کے معاملے کو ہمت اور حوصلے سے سلجھانے پر آمادہ تھے۔

ملک کا ماحول یہ تھا۔ کہ سیاسی جماعتیں باوجود غریبوں کا دم بھرنے کے رئیسوں کی منظورِ نظر رہنا چاہتی تھیں۔ آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۲۸ء میں رؤسا کی حیثیت برقرار رکھنے کی ایک دفعہ کا خاص اضافہ کیا گیا۔ گاندھی اور مالوی تو ریاستوں کے مسلّمہ راج گورو ہیں۔ اوروں میں مخالفانہ زبان ہلانے کی جرأت کہاں؟ رؤسا کے متعلق ہمارا تصور پیٹ پوجاریوں اور حُسن کے بے پناہ ڈاکوؤں سے زیادہ نہ تھا۔ خونِ غریباں جن کی رنگ و بو کا سامان ہے۔ ہم پورے سکونِ قلب کے ساتھ رئیسی کا سکون دل برباد کرنے پر آمادہ تھے۔ غریب ہندو ہو یا مسلمان ہماری توجہ اور مدد کا مستحق ہے۔ مگر کشمیر کے مسلمان کی کیفیت سمجھنے کے قابل ہے۔ وہاں کا ہر ہندو عام اس سے کہ غریب ہو یا امیر مسلمان کو "رمضانی مار کھانے کی نشانی" سمجھ کر راہ چلتے اس کے حصۂ اسفل پر ایک

ٹھوکر رسید کرنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ کیوں کہ وہ حاکم وقت کے ہم مذہب ہونے کے باعث اپنے آپ کو خاص امتیازات کا حامل خیال کرتا تھا۔ ایسی دوگونہ غلامی کشمیر کے مسلمان کی اس وقت کی قسمت تھی۔ رؤسا اور احرار کی آویزش طبعی اور طبقاتی آویزش کے علاوہ مذہبی بھی ہے۔ فطرت انسانی اور قلب سلیم نے عدم مساوات کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ احرار غریب طبقے سے منسلک ہونے کے باعث طبقۂ اولیٰ کو نیچا دکھانے میں خاص خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اسلام طبعی مذہب ہونے کے باعث ہر قسم کی سرمایہ داری کا کھلا دشمن ہے۔ اس لیے جماعت کا ہر فرد انتہائی قربانی پر آمادہ تھا۔ لیکن ایسی آمادگی باوجود دعزم و احتیاط شرط دانائی اور کامیابی ہے۔

"کشمیر تحریک کی رہنمائی"

ہماری جماعت میں مولانا حبیب الرحمٰن۔ مولانا مظہر علی۔ شیخ حسام الدین اور اب عزیز شورش کے اضافے سے چار آدمی ایسے ہیں جو پانی کے بہاؤ میں شبیر کی طرح بیدھڑ تیر سکتے ہیں اور اندھیرے میں بے خطر کود جاتے ہیں۔ اور طارق کی طرح جب آگے بڑھنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ تو واپس لوٹنے کے سارے سامان سپرد آتش کر کے بڑھتے ہیں تاکہ فتح اور موت کے خلاف کوئی راہ گریز نہ رہے۔ اسی دل اور دماغ کا ایک اور نوجوان ہم کھو بیٹھے جس کا ہمیں بڑا افسوس ہے۔ خواجہ غلام محمد ان ساری خوبیوں کے علاوہ البتہ نک نوجوان تھا اور کام اس کے سپرد کر کے ہمیں ہمیشہ مطمئن ہو جانا تھا۔ کہ وہ کامیاب لوٹے گا۔ مگر خامی یہ تھی۔ کہ دریا دل اور شاہ خرچ تھا اس حال میں بیوی اس سے بھی بڑھی ہوئی ملی۔ یہ اس بارے میں چالیس تھے تو وہ پینتالیس تھی۔ مہمان آجائے تو جان لڑا دیتی تھی یہ جو لکھے ہیں چرخہ چلاتی اور زیور بیچ کر پکوان بناتی پھر بھی خیال گزرتا۔ کہ مہمان کی خاطر داری میں کوتاہی ہوئی ہے۔ یہ کتابی کیرکٹر عمل کی دنیا میں ناکام رہتے ہیں۔ آمدن سے خرچ بڑھانے والا ہمیشہ ادھار بیچنے والے کی طرح پریشان حال رہتا ہے۔ یہی پریشانیاں اسے احرار کے مقصدِ عظیم میں شامل رہتے ہیں مانع ہوئیں اور بالآخر اسے ملازمت اختیار کر کے کنارہ کرنا پڑا۔

"ابتدائی مراحل"

قصہ مختصر میرے وجدان نے ہمیشہ جماعتی فیصلوں کے بعد نتیجوں کو ان ہی کے سپرد کرنے کو کہا ہے۔

جب مولانا مظہر علی نے اقدام کی ذمہ داری اٹھائی میں مطمئن ہو گیا۔ اور مولانا حبیب الرحمٰن اور حضرت شاہ صاحب بمبئی سے اپنے مشن میں ناکام لوٹے یعنی ارباب کانگرس کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شمولیت سے باز نہ رکھ سکے۔ اس عرصے میں کشمیر میں گولی چلائی گئی۔ ایک بے گناہ شہید اور کئی ایک مجروح ہوئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سارے خطے کو آگ لگ گئی ہے اور پوری ریاست اس کی لپیٹ میں آگئی ہے۔ ریاستی مظالم سے تنگ آئی اور بھوکوں ماری مخلوق کی شمع زندگی بجھنے سے پہلے ایک آخری تڑپ دکھانے پر آمادہ تھی خبروں پر سنسر اور آمد و رفت پر پابندی کے باعث خیالات میں بھیانک بھوت ناچنے لگے۔ سچی خبروں پر پابندی جھوٹی افواہوں کے دروازوں کو چوپٹ کھول دیتی ہے۔ تخیلات کی دنیا میں گڑبڑ سی مچ جاتی ہے۔ اور دماغوں میں عام پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ پورے شمالی ہند کے مسلمان کشمیر کی افواہوں سے بن پانی کے مچھلی بنے ہوئے تھے قرار یہ پایا۔ کہ مولانا فوراً ریاست کو تحقیقاتی وفد کے لیے لکھ دیں۔ اجازت نہ بھی ملے تو بھی اپنے مذہبی رجحانات کے مطابق "علی! علی!!" کہہ کر جائیں دیکھا جائے گا بس یہی بے سر و سامانوں کا سامان ہے۔ احرار کے پاس توکل کے سوا کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ مگر بڑے اقدامات کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ اب جو ریاست کے پاس ہمارا عریضہ پہنچا۔ تو انہوں نے سرکار انگریزی سے پوچھا کہ یہ احرار کیا بلا ہیں؟ ادھر انگریزی سرکار بھی بے خبر نہ تھی۔ وہ ہمارے مزاج اور ذہن سے واقف تھی۔ کہ ان بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں میں طوفان پوشیدہ اور بجلیاں لرز رہی ہیں۔ انہوں نے بھی دریافت شروع کی۔ کہ تمہارے کیا ارادے ہیں؟ لاہور کے مقامی افسروں کی معرفت حکام بالا تک یہ خبر پہنچا دی گئی۔ کہ اگر اجازت نہ دی گئی۔ تو ہم بن بلائے مہمان کی طرح ریاست میں چلے جائیں گے۔ جواب ملا۔ کہ اگر انہوں نے جیل کا مہمان بنایا۔ تو جواب الجواب میں کہا گیا۔ کہ ہم بھی آفتِ جان بن جائیں گے۔ یہ سن کر برٹش سرکار نے ریاستی دربار کو لکھا کہ یہ بے ڈھب کے لوگ ہیں۔ کہیں مرزا بشیر کی کشمیر کمیٹی نہ سمجھ لینا۔ یہ امرا نہیں عوام کے نمائندے ہیں مطلب یہ کہ اپنی پگڑی پہلے ہی بغل میں دابے پھرتے ہیں۔ اور دوسروں کی اچھل جائے تو افسوس نہیں کرتے اس سرکاری تحقیقات میں بھی کچھ عرصہ گزر گیا۔ تاہم خاموش ہم بھی نہیں رہے۔ برابر "یوم کشمیر" منانے

اور عوام کو اپنا ہمدرد بنانے میں مصروف رہے۔ آخر ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور حسب الحکم ورکنگ کمیٹی بلا رخت سفر باندھے سری نگر کی نیت کر کے چل پڑے سٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ لاہور سے گوجرانوالہ تک وفد کے چار ممبروں کا پورا کرایہ نہیں اتنے عزم اور یہ وسائل اپنی بے بسی پر ہنسی تو آئی۔ مگر عاشقوں کی منزلیں یوں ہی طے ہوا کرتی ہیں۔ رہروانِ منزلِ محبّت پتے باندھ کر کب چلے ہیں کہ ہم چلتے۔ ع

خدا خود میر سامان است اربابِ توکّل را

مالی پریشانیوں میں منزل کھوٹی کر دینا مسلمانوں کا کام نہیں چنانچہ میں اور مولانا مظہر علی تو گوجرانوالہ روانہ ہوگئے۔ خواجہ غلام محمد اور ایک اور عزیز ممبرِ وفد تو نہ تھے۔ مگر دفتری ضرورتوں کے لیے ہمراہ تھے۔ لاہور میں رہے۔ چوہدری الٰہ بخش گتائی کو جو لاہور کے مخلص دوستوں میں سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مالی مجبوریاں مانع سفر ہیں تو بیوی کا زیور رہن رکھ ساڑھے تین صد روپیہ (۳۵۰) دفتر کو دیا۔ کہ خدا کا کام اتنے میں نہ رُکے مجھے مولا چاہیئے مال نہ چاہیئے گوجرانوالہ کے دوستوں نے سنا تو یہ روپیہ واپس کر دیا۔ کہ زادِ راہ کے ہم کفیل ہیں۔ رات کو گوجرانوالہ میں جلسہ عام ہوا سیّد عطاء اللہ شاہ کی تقریر اور کشمیر کا مسئلہ چھن چھن کے دماغ سے اترے۔ موتیوں کی مالا بن کر منہ سے جھڑے سننے والوں میں آگ لگا دی اور سامانِ سکون چھین لیا۔ صبح شہر کا رنگ اور تھا۔ گھر گھر کشمیر کے مظالم کی داستانیں بیان ہو رہی تھیں۔ اور بازاروں میں بچے ٹولیوں میں "احرار زندہ باد" کے نعرے بلند کر رہے تھے اس حوصلہ افزائی سے ہمارے دل دگنے ہوگئے۔ اور نیک دعائیں دیتے ہوئے اس شہر سے چلے اور سیالکوٹ پہنچے یہ مقام زندہ دل اور پُرجوش لوگوں کی بستی ہے۔ احرار کا یہ "مدینہ" نیکی کی تخت گاہ اور بُردوں کے ہاتھوں بھاگے ہوئے لوگوں کی آخری جائے پناہ۔ جب ہم سٹیشن پر پہنچے۔ تو بڑا اژدہام تھا۔ لوگوں کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ ہمیں ایک نظارہ طائرہ سے معلوم ہوگیا۔ کہ اہل شہر کے قلب کی کیفیت کیا ہے۔ اگلے روز مختلف شہروں کے احرار والنٹیروں کا اجتماع تھا۔ شہر کے مرد و زن تماشائی تھے۔ بڑی چہل پہل تھی۔ جموں کا گورنر خود حالات کا جائزہ لینے سیالکوٹ میں موجود تھا۔ اس نے غریبوں کے یہ ٹھاٹھ دیکھے تو بڑا متاثر ہوا۔ اور وزیر اعظم کشمیر کو بذریعہ تار کہا۔ کہ احرار وفد کو داخلے سے روکنا ریاست کی فوری پریشانی کا باعث ہوگا۔ یوں گورنر نے ہمارے داخلے کی اجازت حاصل کرلی۔

مرزا بشیر الدین محمود بھی شہر پر اپنا رنگ جمانے آیا۔ مگر مجمع کو مخالف پاکر چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ کچھ بولا تو سہی۔ مگر عوام کے نقار خانے میں سرکاری طوطی کی کون سنتا ہے۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تھے۔ کسی کی کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی بہت زور مارا مگر شور نہ تھما۔ جب سعی بے سود سے گلا بیٹھ گیا۔ تو ناچار مرزا صاحب بھی بیٹھ گئے۔ اور ایسے بیٹھے کہ کسی شہر میں جاکر احرار کے خلاف اور کشمیر کمیٹی کے حق میں کھڑے ہوکر کچھ کہنے کی پھر جرأت نہ ہوئی ورنہ ان دنوں انھیں بھی مرزائیوں کا سیّد عطاء اللہ بننے کا شوق چرایا ہوا تھا۔ زعم باطل یہ تھا کہ میں سیّد موصوف کی طرح بے قابو مجمع کو جادو بیانی سے مسحور کر سکتا ہوں۔

کشمیر میں داخلہ

اکتوبر ۱۹۳۱ء

دروازے کے نقش و نگار سے گھر کی خیر و خوبی کا قیاس کر لیا جاتا ہے۔ بعض اربابِ بصیرت کو تو کھنڈرات سے عمارت کی عظمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جموّں اگرچہ کشمیر جنت نظیر کا کوچہ غیر آباد ہے۔ مگر اس کی شگفتگی اس وادی گل خیز و گل ریز کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ جموں اسٹیشن کے پہنچنے سے پہلے گھنے درختوں کا گہرا سایہ اور متوالی ہوائیں ذوقِ نظر و فرحتِ قلب کا سامان بن گئے گاڑی سے اترے تو ریاست کا عملہ موجود تھا سی۔ آئی۔ ڈی تو یوں بھی سرگرم اور مدکتی رہتی ہے۔ ایسے موقعوں پر تو ان کا سیاہ بھن ناگن کی طرح نمایاں نظر آنا ضروری سا ہوگیا۔ حالانکہ حق یہ ہے۔ کہ خفیہ عملہ کبھی ظاہر نہ ہو۔ مگر یہ ہندوستان ہے۔ یہاں طاقت کے اظہار اور شان و شوکت کی بنا پر حکومت کی جاتی ہے۔ خدمت کی بجائے رعب و داب ہی سلطنت و ریاست کا اصلِ اصول سمجھا گیا ہے۔ محبت کی بجائے مرعوب کر کے کام نکالنے کو عمدہ حکمتِ عملی تصور کیا جاتا ہے۔ پھر اس ملک کی سی۔ آئی۔ ڈی کو کیا پڑی کہ کراماً کاتبین کی طرح خاموش اور نظر سے اوجھل رہ کر کام کرے کیوں وہ انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اَنَا الْمَوْجُوْدُ لَا غَیْرِیْ کے دعووں میں کسی سے پیچھے رہے۔ غرض گاڑی سے اترے۔ ریسٹ ہاؤس

میں پہنچے، غیر سرکاری دوستوں کا دن بھر تانتا بندھا رہا۔ مجھے سیالکوٹ ہی میں کچھ حرارت سی ہوگئی تھی۔ اب حرارت نے بخار کی صورت اختیار کی۔ مولانا مظہر علی ہی ملاقاتیوں سے باتیں کرتے رہے میں لیٹا لیٹا بخار کا لطف اٹھاتا رہا۔ ہلکا بخار بھی گرم حمام میں غسل کی طرح طبیعت کو آسودہ کرتا ہے۔ البتہ بڑھ جائے تو بلا بن جاتا ہے۔ بخار کے مزے لیتے لیتے دوسرے دن نمازِ جمعہ پڑھنے جو گیا۔ تو واپس آنا قیامت ہوگیا۔ طبیعت کا عنوان دیکھ کر اندازہ کیا کہ معمولی بخار نہیں۔ احتیاط کے تقاضے کو مدِنظر رکھ کر چاہا کہ لوٹ جاؤں۔ مگر دوستوں نے اصرار کیا اور ضمیر نے طعنہ دیا کہ عشق کی اوّل منزل میں قدم رکھتے ہی گھر یاد آیا۔ راستے میں مرگئے تو کیا جلال الدین اکبر کو وارثِ تاج و تخت نہ ملے گا؟

بہرحال میں نے سفر میں ساتھیوں کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہ بخار بعد میں تپِ محرقہ ثابت ہوا۔ مجھے کوئی تکلیف نہ تھی، ایک ہلکا سا نشہ بس تھوڑا سا سرور تھا جس سے لطفِ سیر و سفر دوبالا ہوگیا۔ جموں سے کچھ میل دور خشک پہاڑ ملتے ہیں۔ یہ حوصلہ شکن تیور والے مسافر کو آگے بڑھنے سے ڈراتے ہیں۔ گویا حریمِ حُسن کے یہ سخت مزاج چوکیدار زبانِ حال سے ہر آنے والے کو پکارتے ہیں۔ کہ ادھر نہ آؤ لوٹ جاؤ۔ تاکہ خطۂ کشمیر کے بے نقاب حُسن پر نامحرم گستاخ نگاہ نہ ڈال سکے۔ لیکن بے باکی کے اس انقلاب انگیز دور میں حُسن خود بے نقاب رہنے پر مصر ہے اور ریاست نے دیدارِ عام کی اجازت دے رکھی ہے۔ اب یہ خشک پہاڑ اور چٹیل میدان شوقِ دیدار کو ذرا اور تیز کرنے کے کام آتے ہیں اور بس۔

کشمیر کے نظر افروز نظاروں کے حُسنِ تصور میں سفر کا یہ خشک حصہ بھی رنگین وادی کی طرح ہی کٹا۔ ہر لحظہ گمان گزرتا تھا۔ لو وہ ارضی جنت کا دروازہ آیا۔ فی الواقع جب ہم ورجناں پر پہنچے۔ تو دوزخیوں کو اس کا پہرے دار پایا۔ نظر اٹھا کر غور سے دور دور دیکھا ہر طرف مصیبت کی ماری فاقے سے بے حال مخلوق جنت میں دوزخ کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ اونچی جگہ سے دریا کے دھارے کو دیکھو تو چمک میں چاندی کا پگھلا دریا دکھائی دیتا ہے چھوٹی چھوٹی خاموش ندیاں زلفِ یار کی طرح پُرپیچ اور سانپ کی طرح لہر کھا کر گزر جاتی ہیں۔ سبزہ و گل نے ساری وادی کو سہاگ کا جوڑا پہنایا ہوا ہے نظارہ ہر جگہ دامنِ دل تھام کر کہتا ہے کہ:

"جا ایں جا است"

بلوری چشمے طنبورہ بجاتے ہیں۔ رنگا رنگ پرندے خوشی سے گاتے ہیں۔ یہ سرزمین پاک سولہ[16] سنگار کیے حسن و نور سے بھرپور تناظر کی طرح اچھوتی موسیقی اور قدرتی فضا کی سحر انگیز دھن پر مصروفِ رقص نظر آتی ہے وہاں کے وجد آفریں سمے کو دیکھ کر کون جھوم نہیں جاتا؟ مگر ان مدبھری ہواؤں اور سرور انگیز فضاؤں میں اس جنت ارضی کا اصل باشندہ برگِ سرما دیدہ کی طرح آزردہ اور بدحال ہے۔ عورتیں حسین جسم کو چیتھڑوں میں چھپائے پھرتی ہیں۔ بچے بھوک سے بوڑھے نظر آتے ہیں۔ مایوسی سب کے ماتھے پر نمایاں طور پر لکھی ہے۔ انسان نے انسان کا کیا حال کر دیا ہے؟

"مُخالفت کا آغاز"

بس خدا کو منظور تھا۔ کہ احرار اسی دکھی دنیا کے سب سے زیادہ دُکھ بھرے حصّے کے لوگوں کی امداد کو پہنچے۔ ایسا فخر کبھی کسی جماعت کے حصّے میں نہ آیا ہوگا۔ ہمیں اپنی ان قربانیوں پر فخر ہے۔ مگر حق اور انصاف کے مخالف ہمارے کشمیر کے داخلے سے پہلے ہی ہمارے حق میں بس ہو کر مطمئن واپس آگئے تھے۔ ہم سری نگر پہنچے۔ تو فضا قدرے مکدّر تھی۔ لوگ غریب جماعت کے غریب افراد کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تنگ حال لوگ دوسروں کی تنگ حالی میں کیا مدد کریں گے۔ یہ بس آئے ہیں ریاستی خزانے سے جیبیں بھر کر لوٹ جائیں گے۔ ہمارے ریاست میں آنے کا مقصد ہمارے بعض کانگرسی احباب نے لوگوں کو یہی سمجھایا۔ اور لوگوں نے یہی سمجھا۔ امرا اور رؤسا نے غریب پر غریب کا اعتماد جمنے ہی نہیں دیا۔ یہاں کی بے بس آبادی کیسے سمجھتی۔ کہ غریب ہی خدا کے نام پر سب کچھ لٹاتے ہیں۔ اور پھر دنیا میں بے ایمان اور بد دیانت کہلاتے ہیں۔ غرض ایسے ماحول میں ہم سری نگر پہنچے۔ حکومت کو ابتدا سے اصرار تھا کہ ہم ریاستی مہمان بنیں۔ مقصد یہ تھا کہ ہم ہاؤس بوٹ میں نظر بند رہیں گے۔ اور ملنے والوں پر پوری نگرانی بھی ہوگی ہمارے لیے مناسب نہ تھا۔ کہ ہم آتے ہی ریاست سے اعلانِ جنگ کر دیتے۔ اور دریافتِ حال کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ڈیپوٹیشن کا مقصد حالات کا جائزہ لینا تھا۔ الٹی میٹم دینا نہ تھا۔ دوسرے اگر سرکاری خزانہ اخراجات کی ذمہ داری اٹھائے تو ہمارے سر سے سب سے بڑا بوجھ اتر جاتا تھا۔ احرار کی راہ میں مالیات ہی سدِ سکندری ہے۔ ورنہ ہماری ہمت کو مشکل کیا ہے؟

پس ان دو مصالح کے پیشِ نظر سرکاری دعوت کو قبول کرنا ضروری تھا۔ اس ضروری مجبوری نے غلط فہمیوں کے طوفان کو اور تیز کر دیا۔ مجھے ڈاکٹری مشورے کے مطابق بستر سے ہلنا نہ تھا۔ مولانا مظہر علی جمعہ کے دن مسجد میں گئے اور تقریر کا موقعہ تلاش کیا۔ مولانا مظہر علی یوں بھی غریب طبیعت اور مسکین حال ہیں۔ کھدر کا لباس رہی سہی کسر پوری کر دیتا ہے۔ کھڑے ہوئے تو لوگوں کو نہ جچے۔ غریب کی پامال خودداری اور برباد خودی امیرانہ ٹھاٹھ کو ہی مستحق توجہ سمجھتی ہے چھوٹے قد اور کم قیمت لباس والے پر کس کو گمان ہوتا کہ وہ علم کا دریا، عقل کا سمندر اور ہمت کا پہاڑ ہے؟ مگر جب کھڑے ہو کر علم کے موتی برسائے اور فصاحت کے دریا بہائے تو لوگ گدڑی کے لعل کی قدر کرنے لگے۔ پھر احساس ہوا کہ یہ ہیرا دنیا کی قیمت پر نہ بکے گا۔ پھر تو ہمارا ہاؤس بوٹ زیارت گاہ ہو گیا۔ مگر حکومت کو یہ انداز نہ بھائے۔ مولانا نے سری نگر کے باہر حالات کا جائزہ لینے جانا چاہا۔ مگر حکام نے روڑے اٹکائے لیکن ہمارے آرام کا ہماری ضرورت سے زیادہ خیال رکھا۔ خورد و نوش کا سامان ریاست کی شان کے مطابق کیا۔ مگر یہ بات کھٹکی۔ غریب جماعت کے کارکن اپنے حال میں رہیں تو عزت محفوظ ہے۔ ورنہ ہاتھ بھر لمبی زبانیں ہر وقت شہرت کی گتر بیونت پر آمادہ رہتی ہیں۔ چنانچہ میں نے خورد و نوش کا خرچ کم کرنے کے لیے کہلا بھیجا۔ اور مناسب حال اخراجات کے مدِ نظر کھانے کا آرڈر دینے لگا۔ اس پر لوگوں نے اور اطمینان کا سانس لیا۔

"میکلیگن کالج سٹرائک"

۶ ستمبر ۱۹۳۱ء

سری نگر میں ابھی ہم روشناس ہونے لگے تھے۔ کہ لاہور سے ایک اور ہنگامے کی خبر آئی۔ "میکلیگن انجینئرنگ کالج" کے پرنسپل نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بابت ہرزہ سرائی کی۔ لڑکے سٹرائک کر کے موچی دروازے کے باہر ڈیرے ڈال کر پڑ گئے۔ پرنسپل تھا انگریز، ہندو ہوتا تو ہنگامہ زیادہ ہوتا۔ مگر بات کچھ دبی دبی رہی اور اندر اندر آگ سلگا کی۔ کچھ بھڑکی نہیں۔ لیکن انگریزی اخبار "مسلم آؤٹ لک" نے ہر روز اخبار کے ذریعے آگن گولے برسانے شروع کیے۔ لڑکوں کی ہمت بندھ گئی۔ کچھ درمیانہ طبقہ تھوڑا بہت متاثر ہوا۔ لیکن امراء حسبِ معمول چکنے گھڑے بنے رہے بلکہ پرنسپل انگریز ہونے کے باعث حکومت کی ناراضگی سے خائف ہو کر اس آگ پر پانی ڈالتے رہے۔ مولانا محمد داؤد بڑے بہادر جماعت میں قابل اور خدا ترس آدمی ہیں۔ انہوں نے حالات سے حسبِ معمول متاثر ہو کر اس ایجی ٹیشن میں حصہ لینا شروع کر دیا وہ احرار کے جنرل سیکرٹری تھے۔ ان کے حصہ لینے سے ایجی ٹیشن کا رنگ ڈھنگ بدل گیا۔ علامہ سر اقبال ایجی ٹیشن میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے یہ ایجی ٹیشن بھی احرار کے حوالے کر دی۔ مولانا داؤد کی رہنمائی میں کالج کا پکٹنگ کیا گیا۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ لاٹھی چارج ہوا۔ ایجی ٹیشن شہر کے اسلامی حصے میں سر نکالنے پھرنے لگا۔ لوگوں کی آنکھوں سے خون ٹپکتا تھا۔ ماتھے کے تیوروں میں ہنگامے چھپے تھے۔

لاہور کے لوگ عجیب ہنگامہ پرور ہیں۔ اگر گدھا زور سے ہینگے۔ تو وہ کانوں اور گھروں سے پگڑیاں نیل ہیں دبا کر بھاگتے ہیں، اور راستے میں پوچھتے ہیں۔ کہ میاں! جھے کیا ہوا؟ بھیّا گامے یہ کیا شور تھا؟ کہیں لاٹھی چلی ہے کیا؟ مگر کسی کے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ غرض عجب "تماشائی شہر" ہے۔ لیکن ایک خوبی ہے کہ بلاٹکٹ تماشا نہیں دیکھتا۔ ہر ایجی ٹیشن میں مالی قربانی ضرور کرتا ہے۔ ہو سکے تو سرکاری ہنگامے کی گرما گرمی میں لاٹھی بھی بے پروائی سے برداشت کرتا ہے۔ گولی چل جائے تو اس کی بھی چنداں پرواہ نہیں کرتا۔ لیکن طبیعت تماشائی ہے۔ اس لیے کسی تحریک میں دل نہیں لگتا۔

ہر تحریک سے چند دن میں جی اُکتا جاتا ہے۔ پھر کوئی نیا کھیل دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ لاہور کے لوگوں کی طبیعت میں کچھ مذہبی جوش بھی ہے۔ وہ خدا کے نام کی شمع پر پروانے کی طرح گرتے ہیں میکلیگن کالج کے معرکے میں انہوں نے جان کی بازی لگا دی۔

"مولانا مظہر علی کی واپسی"

لیکن میں بیماری میں بے قرار تھا۔ مجھے اپنی قوم کی قوتِ عمل اور قوتِ برداشت کا حال معلوم تھا۔ اندیشہ تھا کہ ہم دو تحریکوں کو چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مالی استحکام کی کمی اور حقّے کی عادت نے قوم کو لمبی

جدوجہد کے قابل نہیں چھوڑا۔ مالی استحکام کے معنی امراء کی جماعت پیدا کرنے کے نہیں۔ بلکہ قومی فنڈ یا بیت المال کی مضبوطی یا عوام کی خوشحالی کے ہیں۔ امراء ہر قوم کا بیکار حصّہ ہوتے ہیں۔ بہادری کے معرکے کبھی ان لوگوں نے سر نہیں کیے۔ اس لیے میری پختہ رائے تھی کہ کشمیر کی تحریک کو آگے بڑھانا زیادہ بہتر ہے۔ اور کالج ایجی ٹیشن ہیں باعزت سمجھوتہ ضروری ہے۔ مولانا مظہر علی میرے ہم خیال تھے۔ طلبہ کا معاملہ تھا۔ بات زبانی تھی۔ پرنسپل واقعہ کی صحت سے انکار کرتا تھا۔ اس لیے اس کے جرم کو اجاگر کر کے واقعہ کو اچھالنا تقاضائے شرافت نہ تھا۔ مولانا مظہر علی کشمیر سے لوٹ کر لاہور پہنچے۔ مولانا داؤد، مولانا احمد علی وغیرہ گرفتار ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کا ایک مقتدر وفد پنجاب گورنمنٹ کے افسروں سے ملنے شملے جا رہا تھا۔ سب نے مولانا کو شملے لے جانا مناسب سمجھا۔ ان دنوں یورپین حکّام اپنے آپ کو بجا طور پر حاکم مطلق سمجھتے تھے۔ آئین کے رو سے وہ مختارِ کل تھے۔ رائے عامہ بے حد کمزور تھی۔ اس لیے کسی ایجی ٹیشن اور وہ بھی مسلمانوں کے ایجی ٹیشن کو خاطر میں لانا بے حقیقت قوم کو وقیع بنانا تھا۔ مجلس احرار کو ابھی اپنا وجود ثابت کرنے کی ضرورت تھی۔ حکّام احرار کے چند افراد کو ضرور جانتے تھے۔ مگر اتنا ہی کہ یہ چند شوریدہ سر اور بے لگام لوگ ہیں۔ یہ قیاس بھی نہ تھا کہ کبھی ان کے پاس ہزار دو ہزار والنٹیر ہو جائیں گے۔ یورپین حکّام ہم دونوں کو کونسل کے بے غرض اور ان تھک کام کرنے والے سمجھ کر عزت ضرور کرتے تھے۔ یا چند اور کو شعلہ بار مقرر جان کر کسی قدر فسادی قوتوں کا مالک جانتے تھے۔ بنا بریں اوّل اوّل تو انہوں نے یورپین پرنسپل کی حمایت میں اپنا رویہ سخت کر لیا۔ اور رباؤ کے گھوڑے پر سوار رہے۔ لیکن جب وفد اپنا سا منہ لے کر واپس لوٹ آیا تو کسی قدر ہوش آئی۔ حکومت کے لیے حقیر سے حقیر فرقے کے رہنما کے خلاف ناپاک حملے کی حمایت مفت کی بدنامی اور دردسری تھی۔ پھر اندیشہ یہ ہوا۔ کہ احرار سے کچھ اور ہو سکا یا نہ لیکن انگریزی اخلاق کی پردہ دری کرنے کے علاوہ تھوڑی بہت نفرت ضرور پھیلائیں گے۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے لاہور کے حکّام کو ہدایت کی۔ کہ مولانا مظہر علی سے سلسلۂ گفت و شنید جاری کر کے معاملہ خوش اسلوبی سے ختم کر دیں۔ مبادا یہ واقعہ جماعتی نفرت کے لحاظ سے گہرا رنگ اختیار نہ کرے چنانچہ سٹی مجسٹریٹ مولانا کو سٹیشن لاہور پر آ کر ملا۔ کہ گفتگو ختم نہ سمجھی جائے۔ ممکن ہے افسران ضلع مل کر کوئی بہترین حل نکال سکیں۔ حکومتیں اور جماعتیں مکالا نہیں کرتیں بلکہ سوچا سمجھا ہوا حل پیش کیا کرتی ہیں۔ تا کہ سمجھوتے میں ان کا اپنا زاویۂ نگاہ قائم رہے اور عوام میں حکومت کی شکست کا تصور نہ پیدا ہو۔ یہی حال مضبوط جماعتوں کا ہے۔ احرار اور وفد نے جس میں میاں عبدالعزیز

مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر شامل تھے۔ حکومت کی درمیانی راہ کو پسند کیا۔ یعنی پرنسپل نے اعلان کیا۔ کہ میں نے وہ الفاظ جو میری طرف منسوب کیے گئے ہیں نہیں کہے۔ میں پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کرتا ہوں۔ اور اگر میرے کسی عمل سے مسلمانوں کے دل کو صدمہ پہنچا ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

جھگڑے کو جتنا بڑھایا جائے بڑھتا ہے جھگڑا صرف اسی صورت میں مفید ہے جس صورت میں قوم و افراد کے سیاسی اور اقتصادی مفاد، مجلسی زندگی یا اخلاقی حالت پر اثر پڑتا ہو۔ ہتک، قومی یا شخصی کا بہترین حل معافی ہے تاکہ اس کا دوبارہ اعادہ نہ ہو۔ ملکوں اور قوموں میں اخلاقی حدود قائم رہیں۔ اچھا ہوا۔ جو اس طرح معاملہ خوش اسلوبی سے ختم ہوا۔ قیدی رہا کر دیئے گئے۔ طالب علم کالج کو واپس چلے گئے۔

"تبلیغی رُوح کہاں ہے؟"

حالاتِ زمانہ کو تعجّب سے دیکھتا ہوں۔ دنیا کے لٹریچر کو افسوس سے مطالعہ کرتا ہوں۔ فضاؤں میں اسلام کے لیے برچھیاں تیرتی ہیں۔ لٹریچر میں نشتر چھپے ہیں۔ دنیا کے پاک ترین انسان کو بدترین مخلوق کا رنگ دیا گیا ہے۔ دنیا کے بہترین مذہب کو تاریک خیالات کا حامل بنایا گیا ہے۔ مگر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ غلامی جس قوم کا سیاسی اثاثہ اور ساری قوم کا چند امراء کے ہاتھوں کٹ پتلی ہو کر رہنا جس کی خصوصیت۔ ایسے اثاثہ ذات کی حامل ملّت کے روحانی سرداری کی کیا کوئی قدر کرے؟ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت پاک سے دنیا کی بے خبری کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ہم پر جنہوں نے دنیا کو دین پر مقدم کر کے دین اور دنیا دونوں برباد کر دیے ہیں۔ اے اسلام کے بے روح نوجوانو! کچھ سوچو کہ آج دین رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر الزام کیوں دھرے جاتے ہیں؟ اس لیے کہ دنیا ہم کو دیکھتی ہے۔ اور ہماری صورت و سیرت سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت و صورت کا اندازہ لگاتی ہے۔ درخت کی خوبی اس کے شیریں پھل میں ہے۔ کسی مذہب کی تعلیم کا اندازہ افراد پر اس کے اثر سے ہی تو لگایا جا سکتا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ہر مسلمان آتش بجان مجاہد اور عالی حوصلہ مبلّغ ہوتا۔ مگر نہیں دنیا عبرت کی نظر سے ہماری طرف دیکھتی ہے جن لوگوں کی طرف نگاہیں عزت و احترام سے اُٹھنی چاہیئے تھیں آج نفرت اور حقارت کی نظریں ان پر پڑتی ہیں۔

مسلمان جوانوں کا تصور جب خود مجھے آتا ہے۔ تو میں اُسے کھیت کے کنارے حقہ پی کر بیکار وقت ضائع کرتے پاتا ہوں۔ یا شہر کی گلیوں میں سگرٹ سلگائے آوارہ پھرتے دیکھتا ہوں کیسے شرم کی بات ہے؟ جنہیں چیونٹی سے زیادہ محنتی ہونا چاہیئے تھا۔ وہ نکھٹو مکھی کی طرح ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دوسروں کے آسرے زندہ ہیں۔ ایسے لوگوں میں روحِ جہاد اور روحِ تبلیغ ڈھونڈنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔ ہر مسلمان اپنے طرزِ عمل پر غور کرے کہ اس نے اسلام کی ترقی کے لیے کبھی کام کیا؟ یا آئندہ اولاد میں کوئی ایسا جذبہ پیدا کر رہے ہیں۔ کہ اپنی زندگی خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دیں؟ جب ہم میں کوئی خوبی نہیں رہ گئی تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم خود ہی رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر آئے دن حملوں کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر کھیت پر بیل ٹھیک نہ چلے تو بیچنے والے کو گالی دی جاتی ہے؟ بچہ بد اخلاق ہو تو ماں باپ الزام دھرا جاتا ہے۔ اسی طرح بد اطوار مسلمان اپنے روحانی بزرگوں کی بدنامی کا باعث ہیں۔

آخر یہ ہم کو ہو کیا گیا ہے؟ میں نے تو علمائے دین تک کو دیکھا ہے جن کی روحِ تبلیغ کا شہرہ ہے۔ کہ عمر بھر سے خاکروب گھر پر آتا ہے۔ مگر ان کو یہ توفیق نہیں ہوئی۔ کہ آؤ زندگی میں ایک دن اسے کلمے کی تبلیغ کر دیں۔ ساری عمر غیر مسلم ہمسایہ پہلو میں بستا ہے۔ لیکن ایک لمحہ یہ خیال نہیں آتا۔ کہ چلو چل کر اسلام کی خوبی اس کے ذہن نشین کریں۔ دوسروں پر اثر ڈالنے تو وہ اٹھے جس نے خود مذہب کا اثر قبول کیا ہو۔ اس کاروبار سے فرصت ہو تو دین کی حقیقی ضرورتوں کی طرف دھیان جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ مذہب تبلیغی اور جہادی روح سے محروم ہو گیا۔ ایسی سوسائٹی تالاب کا پانی ہے جس کا کہیں نکاس نہ ہو۔ اور گندہ ہو کر گندی مچھلیاں اور زہریلے مچھروں کی پرورش گاہ بن جائے۔ پس ہم اپنی بدعملی کے لحاظ سے اسلام کی جبین پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ اور پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سب و شتم کا حقیقی باعث جب تک ہماری کثیر تعداد اپنے حال کی اصلاح نہ کرے گی۔ تب تک میکلیگن کالج کے ایسے ہزاروں پرنسپل پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس برائی کے سدباب کی صورت یہی ہے کہ ہم بھلے بن جائیں۔ دنیا ہمارے عمل کو دیکھ کر نیک اثر قبول کرے۔ ہم میں کا ہر شخص مجاہد یا مبلغ ہو جس کا سینہ ان دونوں سے سرد ہو تو دوزخ کی آنچ اس کے لیے بے بس ہے۔

احرار نامِ خدا زندگی میں ایک نیا عزم لے کر اٹھے ہیں۔ ان میں بھی بعض نوجوانوں کو بیکار وقت ضائع کرتے والا دیکھتا ہوں۔ گو انہوں نے زندگی خدا کے لیے وقف کر رکھی ہے لیکن کئی کئی دن خدا کے کام سے غافل

رہتے ہیں۔ حالانکہ احرار کا فرض ہے۔ کہ کسبِ معاش کے بعد اپنا ہر لمحہ اپنی صحت بنانے اور مخلوقِ خدا کی خدمت کر کے اسلام کا نام روشن کرنے میں صرف کرے۔ احرار اور مرد بے کار یہ بہت بڑا دھبہ ہے۔ اس سے بچنا چاہیئے جسم میں بے تاب روح اور ان تھک ارادہ پیدا کر کے ملت میں ہمت کی مثال قائم کرنی چاہیئے۔ قوم کا کوئی حصہ تو سوچے کہ بے ہمتی نے ہمارا کیا حال کر دیا ہے؟ کیوں دنیا میں ہر کس و ناکس ہمیں چھوڑ کر پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر حملہ کرتا ہے؟ باہمت قوموں کے بزرگوں کی تعریف کی جاتی ہے بے ہمت لوگوں اور بدعمل افراد کے پچھلے پرانے باپ دادوں کی قبروں پر لعنت برسائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن کی مثال پیش نظر ہے۔ وہ بہت کم بیکار بیٹھتے ہیں۔ تبلیغ اور جہاد دونوں میں پورے ہیں۔ احرار کے بعض دوست جیل کو بہادری سے کاٹ کر تبلیغی اور جماعتی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ ہماری مصیبتوں کا بڑا باعث ہیں جیل سے کامیاب واپس آ کر جماعتی کاموں اور تبلیغ کی ضرورتوں سے کارکنوں کو بے نیاز سا پا کر باقی ہمدرد بھی وہی رنگ اختیار کرتے ہیں۔ اور ہمارے دفتر بے کار سے لوگوں کے اڈے نظر آنے لگتے ہیں۔

پس نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کو بچانا اور اسلام کو بلند کرنا چاہتے ہو۔ تو زندگی کا پروگرام بناؤ۔ روز نئے عزم کے ساتھ دنیا میں کام کرنے اٹھو۔ ورنہ ایک بدزبان کی بد زبانی روکنے کے لیے ساری قوم کو آتش زیرِ پا رکھنا دلیل دانائی نہیں۔

"پھر پنجاب کو"

مولانا کے لاہور آنے کے بعد وزیر اعظم کشمیر سر ہری کشن کول کا پرسنل اسسٹنٹ میری تیمارداری کے لیے ہوس بوٹ میں آیا۔ مزاج پرسی کے بعد یوں ہی اس نے سیاسیات کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسے اپنی قوتِ تمیز پر بڑا ناز تھا۔ بے شک وہ اچھی سوجھ بوجھ کا آدمی تھا۔ لیکن عوام کے ذہن کی بنیادی محرکات کو سمجھنے اور اُن سے نتائج اخذ کرنے کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس کو یقین تھا۔ کہ وہ انگریزی فوج کی مدد کے بغیر ریاستی فوج اور پولیس کی قوت سے حالات پر قابو پا لیں گے۔ یہی تحریک کشمیر کو عوام کے گہرے اقتصادی اور سیاسی زخموں کا نہ مندمل

ہونے والا گھاؤ سمجھتا تھا۔ میرا قیاس یہی کہتا تھا۔ کہ اگر مجلس احرار جان و دل سے مدد کو اٹھی تو حالات ریاست کے قابو میں نہ رہیں گے۔ یک بیک میں نے دیکھا کہ اس کی طبیعت پر میرے دلائل کا جادو چل گیا ہے۔ پھر وہ مبہوت سا ہو کر میرے وجوہات و بحث کو سننے لگا۔ اور میری امید سے کہیں زیادہ اثر لے کر اٹھا۔ وہ دوسرے دن پھر وزیر اعظم کی طرف سے مجھے ملنے آیا۔ پہلے کی نسبت اب اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ اب وہ زیادہ مؤدب تھا میری ہر بات پر توجہ دیتا تھا۔ اس نے وزیر اعظم کی طرف سے خواہش ظاہر کی کہ میں کشمیر کی سیاسیات کے متعلق اپنی کل والی رائے کو اپنی اولین فرصت میں قلم بند کر دوں۔ چنانچہ میں نے باوجود بیماری کے مکمل رائے اردو میں لکھ کر بھیج دی۔

اب مولانا مظہر علی واپس آ گئے تھے۔ تعجب ہے کہ حالات نے اس میری رائے کے مطابق بدلنا شروع کیا شیخ محمد عبداللہ کشمیر کے لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔ ہم پر پابندیاں زیادہ ہو گئیں۔ لیکن واقعات نے نازک صورت اختیار کر لی۔ توانا ؤں کا ناتوانوں کی رائے کو رد کر دینا کتنا آسان ہوتا ہے۔ وہ اکثر اوقات خطرے کو برداشت کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر کمزوروں کی رائے کا احترام کرنا اپنی عزت نفس کے خلاف سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہم کشمیر سے ناکام لوٹ آئے۔ مولانا کی ملاقات مہاراجہ صاحب سے بھی ہوئی۔ میں نے واپسی پر وزیر اعظم سے ملنا ضروری سمجھا۔ میں اپنی سیاسی زندگی کے ابتدا ہی سے سر ہری کشن سے واقف تھا۔ وہ جالندھر ڈویژن کے کمشنر تھے۔ جب میں ملازمت سے مستعفی ہو کر آیا۔ ضلع کی خلافت کمیٹی کا صدر اور کانگرس کا سیکرٹری ہونے کے باعث ان کی تشویش کا باعث ہوا۔ وہ مجھے میرے وطن گڑھ شنکر ملنے آئے۔ مگر میں نے وقت کے تقاضے اور خلافت اور کانگرس کی پیدا کردہ سپرٹ کے ماتحت ملنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ حکام سے عدم تعاون لازمی قرار پا گیا تھا۔ اب صورت مہمان عزیز کی تھی۔ سیاسی دستور یہی تھا۔ اس دستور کی یہ باعزت استثناء تھی۔

واپس آ کر پر امن جنگ کو ہم نے ضروری سمجھ لیا تھا۔ دلائل بغیر قوت کے بیکار ہیں۔ کمزور کی دلیل بے دھار کا کھانڈا ہے نہ اپنے ہاتھ کی زینت نہ دوسروں کے گلے کی کاٹ۔ ہم نے قوت کی فراہمی پر پہلے سے زیادہ زور دیا۔ اب ریاست کو پہلے سے قوی تر خطرہ ہو گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کو رہا کر دیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور ریاستی حکومت نے ہمارے ساتھ معاملہ کرنے کی لائن تیار کی۔ ہمیں کشمیر آنے کی دوبارہ دعوت دی گئی۔ ہم

پھر وہاں گئے۔ ہم ریاست میں ذمہ دار حکومت کے طالب تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کے ذہن میں یہ ڈالا گیا تھا۔ کہ اول تو احرار حکومت انگریزی کی مخالف جماعت ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں ان کا اثر معکوس ہے۔ دوسرے ان کا یہ مطالبہ انقلابی نوعیت رکھتا ہے۔ مناسب ہے کہ تم ریاستی لیڈر کی حیثیت سے اقل ترین مطالبہ کرو۔ اور احرار سے بے نیاز رہو۔ بدنصیبی سے احرار کے خلاف یہ ہتھیار بڑا مؤثر ثابت ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ کو ہم اپنا ہم خیال نہ بنا سکے۔ ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ہم بھی ریاست میں سے ذمہ دار حکومت کا کوئی طالب بنائیں۔

گورنمنٹ آف انڈیا اور ہم دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم آئندہ بیس ۲۰ برس کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور لڑائی اسی بات کی ہے کہ عوام کو کس قدر اختیارات دیئے جائیں۔ اگر شیخ محمد عبداللہ جیسا وسیع النظر با اثر ریاستی لیڈر دل سے ہمارا ہمنوا ہوتا۔ تو ہم نہ صرف ریاست کشمیر بلکہ دوسری ریاست کے باشندوں کا بہت کچھ راستہ صاف کر دیتے۔ فوج میں بہادری کے ہزار جوہر ہوں گر کمان کرنے والے جرنیل ہم خیال نہ ہوں تو قوت کمزور ہو جاتی ہے۔ ہم شیخ محمد عبداللہ کی پارٹی کو بددیانت یا بزدل نہیں کہتے۔ مگر معاملہ سمجھنے میں انہوں نے بڑی ٹھوکر کھائی۔ رائے کا یہ اختلاف حوصلہ شکن ہو سکتا تھا۔ لیکن ہم نے ہمت نہ ہاری۔ سیالکوٹ پہنچ کر فوراً والنٹیروں کو ریاستی حدود میں داخل ہونے کا حکم دے دیا۔ خود مولانا مظہر علی نوجوانوں کا ایک دستہ لے کر ریاست کے حدود کی طرف بڑھے۔ ریاست نے آسان کھیل سمجھ کر ان پر ہاتھ ڈالا۔ لیکن ان کی گرفتاریوں سے گویا جنگل میں آگ لگ گئی۔

زور آزمائی

گورنمنٹ آف انڈیا کی اطلاع پر ریاست نے پانچ ۵ ہزار قیدیوں کی رہائش کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ ہماری قوت کا انتہائی اندازہ تھا۔ اس اندازے سے ہم بھی غیر مطمئن نہ تھے۔ وقت کی بات ہوتی ہے۔ ہم چھوٹے بڑے سب جان لڑانے کے لیے آمادہ تھے۔ جب ارادہ ہو تو کام کی راہیں نکل آتی ہیں۔ دنیا نے تعجب سے دیکھا کہ مردہ قوم زندگی کی کروٹیں لینے لگی۔ سیالکوٹ سے اکیس ۲۱ اکیس ۲۱ نوجوانوں کے جتھے رات کی تاریکی میں دشوار گزار راستوں

سے گزر کر نور کے تڑکے جموّں میں داخل ہوئے۔ جب گلی کوچوں سے تکبیر کے نعرے بلند ہوئے تو ہندوؤں نے سمجھا کہ محمود سومنات پر چڑھ دوڑا۔ دیویوں نے بچّے چھاتیوں سے لگا لیے۔ اور الیشور جپ جاپ کرنے لگیں کہ ھرے بھگوان ان ملیچھوں کا ناش کر دو۔ یہ مُوئے مُنڈی کاٹے کہاں سے آ گئے؟ پولیس بے خبری میں خرّاٹے لے رہی تھی وہ ڈراؤنے سپنے کی طرح اللہ اکبر کے نعروں سے دھڑ دھڑا کر اٹھی۔ افسروں نے گھبرا گھبرا کر فالن فالن (FALL IN) کہنا شروع کیا۔ مشہور ہے کہ بد حواسی اور جلدی میں کوٹ کو برجس سمجھ کر بعض سپاہیوں نے اس کے بازوؤں کو ٹانگوں پر چڑھا لیا۔ خیر یہ تو مبالغہ آمیز اور مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر ریاست کی پولیس کو اچانک ان حالات سے دوچار ہونا پڑا جس کے لیے وہ تیار نہ تھی۔ ہر طرف آ گئے آ گئے ہوتا تھا مگر کسی کو یہ نہ سوجھتی تھی کہ یہ آ گئے ہیں تو ان کا کریں کیا؟ سیال کوٹ کی ماؤں نے قرونِ اُولیٰ کی عورتوں کا نقشہ پیش کر دیا۔ ہر گھر میں نوجوانوں کو احرار کا ساتھ دینے کا تقاضا تھا۔ بہنوں نے بھائیوں کو پیار سے جُدا کیا۔ بیویوں نے خاوندوں کو ڈبڈبائی آنکھوں سے الوداع کہی۔ جوش و خروش کے ایسے نظارے چشمِ فلک نے کہاں دیکھے ہوں گے؟ نورِ ایمان لوگوں کی آنکھوں سے ٹپکنے اور چہروں سے چھلکنے لگا۔ کفر دروازے بند کر کے دروازوں سے سہم سہم کر دیکھنے لگا کہ اسلام

خون کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے؟

ماں کی گود ہی اقوام و ملل کی پرورش گاہ ہے۔ یہاں کا عزم بیٹے کی سربلندیٔ عمل کا باعث ہوتا ہے۔ سیال کوٹ کے نوجوانوں میں روحِ جہاد کی ذمہ دار سیال کوٹ کی مائیں بہنیں اور بیبیاں ہیں۔ اپنے عزیزوں کو الوداع سے شیر طبیعت مجاہد بنا دیا۔ میں نے کسی اسلامی شہر میں عورتوں میں سیاسی جلسوں میں شمولیت کا ایسا شوق نہیں دیکھا۔ پس پہلے عورتوں نے ضرورتِ زمانہ کو سمجھا پھر بچّوں کو سرفروشی کے لیے آمادہ کیا۔ جس ملک و قوم کی مائیں دنیا کے حالات اور ضرورت سے بے خبر ہیں۔ اس ملک کے نوجوان روحِ جہاد کو ضائع کر کے حرم سراؤں کے خواجہ بن جاتے ہیں۔ پس قوموں کی درست تربیت عورتوں کی درست تعلیم پر ہے۔ سیال کوٹ کے بہادر فرزندوں نے ہندوستان کی سول نافرمانی کے سارے ریکارڈ کومات کر دیا۔ باوجود اس امر کے کہ متعدد مقامات پر وہ سنگینوں پر دھر لیے گئے۔ لیکن انھوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر سرد راتوں میں یلغار کر کے جموں کے قریب تند و تیز

ندی کو ہمت سے عُبور کیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ۲۱ نوجوانوں کا دستہ شہر سے روانہ ہو کر رات کی تاریکی میں گم ہو جاتا تھا۔ سات دن کے اندر دس ہزار شیر دل مجاہدوں نے سرحد کو عبور کر کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ بے مثال قربانی کی یہ مثال دیکھ کر ریاستی حکّام کے دماغ پریشان ہو گئے۔ اور ساری سلطنت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ صرف جموں ہی ایک محاذ نہیں بنایا گیا۔ بلکہ جہلم کے راستے میرپور ایک اور پُرامن جنگ کا محاذ تجویز ہوا۔ جہاں شہید الٰہی بخش کا ریاست کے ایک ذمہ دار افسر نے نوک سنگین سے سینہ چھید کر مُسلمانوں کے سینوں میں ناسُور ڈالا اور وہ ماہیٔ بے آب کی طرح خاک اور خون میں تڑپا۔ موت کی بے کلی میں بھی کلمہ پڑھتے شہید ہوا۔ خونِ ناحق کا بہنا تھا۔ کہ پنجاب کے غریب نوجوانوں کا خون کھولنے لگا۔ ہر طرف سے پیدل جتھے کشمیر کی سرحدات کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے پیدل مارچ نے عوام میں جوشِ جہاد کو اور زیادہ کر دیا۔ خواجہ غلام محمد تیس سرفروشوں سے قرآن پر حلف لے کر لاہور سے راولپنڈی اور پھر کوہالہ پہنچا۔ حلف یہ تھا کہ "جان دے کر بھی کوہالے کے پل کو بند کر دیں گے۔" دریا جہلم وہاں کتنا پُرجوش تیز و تند ہے کئی نوجوان دریا میں گرے۔ کچھ سپاہیوں کی سنگینوں پر پڑے۔ تیسرے دن خبر آئی کہ احرار نے پل پر قبضہ کر کے آمد و رفت کا دروازہ بند کر دیا ہے کشمیر کی تجارت کی یہی شاہراہ ہے۔ دو دن میں ہزاروں لاریاں دونوں طرف رک گئیں۔ ریاست کو گولی میں تذبذب تھا۔ کیوں کہ علاقہ پہاڑی اور ہر شخص مسلّح تھا۔ گولی چلنے سے ایسی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا جس کا فرو کرنا ریاست کے بس کی بات نہ تھی۔

"ریاست کا انتظام"

ریاست کے جیلوں کا سارا انتظام تارِ عنکبوت ہو گیا۔ احرار قیدیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی۔ کہ خاردار جیل خانے سیر گاہ بن گئے۔ بدانتظامی کے باعث جو جب چاہے گھر کو آ جائے جو چاہے بغیر گرفتاری کے جیل میں داخل ہو جائے۔ اتنی بھاری قیدیوں کی تعداد کے لیے جیل کا سٹاف پورا نہ تھا۔ یہاں جیل سچ مچ کھیل بن گئے۔ ابھی نئے احرار دستوں کی آمد آمد تھی۔ حالات سے گھبرا کر آخر ریاست نے انتظام وائسرائے کے حوالے کر دیا۔ جس نے غیر معمولی گزٹ کے ذریعہ ریاستی انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے کر احرار کی قوت کا علانیہ اعتراف کیا۔ گزٹ کی

انشاعت کے ساتھ ہی مسلمان امراء کی طرف سے اعلان شائع ہونے شروع ہوئے۔ "احرار کو سول نافرمانی اب بند کرنا چاہیے۔ اب سول نافرمانی کا جاری رکھنا انگریز کی ہمدردی کو بے سبب ضائع کرنا ہے۔" گویا انگریز ریاستوں میں ترقی پسند آئین چاہتا تھا۔ اونچے طبقے کی کیا بات ہے۔ انہیں اندیشہ یہ ہوا مبادا حکومت ساری مسلم قوم کے سر سوار ہو جائے۔ کہ تم سب باغی ہو۔ اور غریب احرار کے ساتھ گھن کی طرح نہ پس جائیں۔ دفتر میں گروہ در گروہ آئے۔ کہ بھیا بہت ہولی۔ اب بس بھی کرو۔ ایسا نہ ہو۔ کہیں سرکار ناراض ہو جائے۔ میں نے کہا۔ بزرگو! نبرد آزمائی تو احرار اور سرکار میں ہو رہی ہے تمہاری سانس کیوں پھول رہی ہے؟ اطمینان سے تماشا دیکھتے جاؤ۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ کرے مونچھوں والا اور پکڑا جائے داڑھی والا۔ انہوں نے کہا سنا نہیں۔ کہ اونٹوں کو بیگار میں پکڑتے تھے۔ تو احتیاط کے تقاضوں کے مطابق لومڑی بھی ڈر کے مارے بھاگ نکلی۔ کسی نے کہا بی لومڑی تم کیوں بھاگی جا رہی ہو؟ بولی بھیا اونٹوں کو بیگار میں پکڑا جا رہا ہے۔ کسی کا کیا بگڑے جو کوئی یہ کہہ دے کہ یہ بھی اونٹ کا بچہ ہے۔ اور میں بھی اونٹوں کے ساتھ دھر لی جاؤں۔

غرض میری خواہش تھی۔ کہ امراء کی طرف سے سول نافرمانی کے خلاف اعلان نہ ہو۔ مگر انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ جن کے اغراض حکومت کے ساتھ وابستہ ہوں وہ غریب جماعت کا ساتھ کب تک دے سکتے ہیں؟ حکومت ہند کو ضرورت تھی۔ کہ ثابت کرے۔ کہ نام نہاد سنجیدہ طبقہ احرار کے بجائے سرکار کے ساتھ ہے۔ کمزور طبیعت غریبوں پر اس اعلان کا اثر ضرور ہوا۔ مگر جلدی ہی احرار نے سنبھالا لیا۔ گورداسپور اور گجرات کی سرحدات کی طرف سے والنٹیروں نے نئی یلغار شروع کر دی۔ لکھنؤ کے مشہور احرار میاں منّے خاں گورداسپور کے قافلہ کے سالار تھے۔ علاقہ ہندوؤں کا تھا۔ وہاں ہندو آبادی نے ان کو گھیر لیا۔ اور ڈوگروں نے سب کو جوتوں سے پیٹنا شروع کیا۔ جب والنٹیر بے ہوش ہو گئے تو ان کو انگریزی علاقے میں پھینک کر چلے گئے۔ منّے خاں پھر اٹھ کر ریاست میں داخل ہوئے۔ ساتھی ان کے ساتھ تھے اس دفعہ زیادہ زخم آئے۔ مرکزی دفتر نے اس سمت کی یلغار روک دی۔ دوسرے محاذوں پر گرفتاریاں دن دگنی رات چوگنی ہوتی گئیں۔

"انگریزی انتظام"

انگریزی حسن انتظام کی ایک دنیا قائل ہے۔ اور سچ بھی یہ ہے کہ انگریز قوم اس زمانے میں بھی جرمنی سے دوسرے درجے پر خوش سلیقہ ہے۔ مگر احرار کی یلغار نے اسے بھی حواس باختہ کر دیا۔ پنجاب کے جیلوں کی گنتی چار گنا ہو گئی۔ کمبل کپڑے نہ ہونے سے قید خانے محتاج خانے نظر آنے لگے۔ احرار قیدیوں کی حالت ملنگ کے فقیروں کی سی ہو گئی۔ جن کے جسم کے کپڑے غلیظ اور تار تار تھے۔ یہ تو جیلوں کے اندر کی صورت تھی۔ باہر برابر جوش ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ حکام جیل یہاں تک مجبور ہو گئے کہ نو وارد قیدیوں کے گلے میں تختیاں لٹکا کر احرار کے دفتروں میں چھوڑ جاتے تھے۔ کہ انہیں صبح لے جائیں گے۔ ریل گاڑی سے بعض قیدی اترتے جاتے تھے۔ تعداد پوری کرنے کے لیے الوداع کہنے آئے اور والنٹیروں کو پولیس منت سماجت کر کے قیدی بنا کے لے جاتی تھی۔ کئی ایک کو دھکے دے کر جیلوں سے باہر نکال دیا گیا۔ کہ اندر کا انتظام تباہ نہ ہو۔ میری اس تحریر اور انتظامی افراتفری کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو گا۔ کہ سینکڑوں رضا کار موت کے منہ سے بچے۔ تاہم اکیس [۲۱] نوجوان نمونیہ سے جیلوں میں وفات پا گئے۔ کیونکہ سردی سے بچنے کا مناسب انتظام نہ تھا۔ قلم قوم مسلم کے جوش کا کما حقہ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ صرف پنجاب سے ہمارے اندازے کے مطابق ۲۵ ہزار نوجوان گرفتار ہوئے۔ ۵ ہزار باہر کے صوبوں سے بھی شریک حال ہو کر جیل گئے۔

"مہاتما گاندھی کا اعلان"

مہاتما گاندھی بڑے دھڑلے کا آدمی ہے۔ جس کے برخلاف ہو جائے اس کو خاک میں ملا کر چھوڑتا ہے۔ آہنسا کا قائل ہونے کے باوجود سیاسیات میں وہ رحم اور درگزر نہیں جانتا۔ وہ ڈھیل اسی وقت تک دیتا ہے۔ جب اس کی اپنی تیاری مکمل نہ ہوئی ہو۔ باتیں میٹھی میٹھی اور دھیرے دھیرے کرتا جاتا ہے۔ اور سہج سہج آنکھ بچا کر اپنا ہتھیار سنبھالتا جاتا ہے۔ اور بغیر للکارے اس زور اور قوت سے حملہ آور ہوتا ہے۔ کہ مخالف بے خبری میں مارا جاتا ہے۔ ہندوستان کی یہ عظیم شخصیت برمحل وار کرنا جانتی ہے۔ جب ہم نے

علیحدہ انتخاب کی قرارداد منظور کی تو مہاتما خاموش رہے۔ لندن میں آپ نے سنا کہ احرار کشمیر پر چڑھ دوڑے
رئیس ہندو اور احرار مسلمان تھے۔ ہماری تحریک کو آسانی سے فرقہ وارانہ رنگ دیا جا سکتا تھا۔ مگر اس مردِ دانا
نے اس بات سے پہلو بچایا۔ لیکن اعلان کیا کہ یہ تحریک انگریز کی تقویت کے لیے شروع کی گئی ہے۔ اس
زمانے میں اس داؤں سے کوئی بچتا تھا؟ اس داؤں کا گھاؤ گہرا ہوا۔ سب ہندو، مسلمان، کانگریسی ہمیں شبہ کی
نظر سے دیکھنے لگے۔ جو تھوڑے بہت کانگرسی ہم میں شامل تھے۔ وہ اداس ہو کر اُباسیاں لینے لگے۔ گجرات کے ایک
عزیز نے تو اعلان کر دیا۔ کہ میں نے تحریک کشمیر میں شریک ہو کر ہمالیہ پہاڑ کے برابر غلطی کی ہے! اس کا تعلق گہرے
رنگ کے کانگریسیوں سے تھا۔ اس کا یہ اعلان رنگ لایا۔ گجرات کے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے حوصلے
پست ہو گئے۔ بعض کانگرسی بزرگوں نے علانیہ اپنے زیر اثر لوگوں کو ورغلایا کہ وہ معافی مانگ کر جیلوں سے
باہر آجائیں۔ غرض کچھ دنوں عجب انتشار رہا۔ سیالکوٹ کا کانگرسی طبقہ الگ جان کا عذاب اور دماغ کی پریشانی
کا باعث بنا۔ باوجود اس کے تحریک شہر سے نکل کر گاؤں میں پھیلتی گئی۔

کانگرسی مسلمان کا ذہن بے حد متشکک اور متشدد ہے۔ ۱۹۳۵ء سے پہلے تو لوگوں کو سی۔ آئی۔ ڈی اور
انگریز کے ایجنٹ کا الزام لگانا عام تھا۔ کانگرسی مسلمان اپنے دعوے اور عمل میں مخلص ہوتے ہیں۔ مگر وہ دوسروں
کو ہمیشہ بدعقل اور دوسروں کا آلہ کار سمجھتے ہیں۔ باوجود اس امر کے کہ گاندھی جی اور مالوی جی نے نہرو رپورٹ
کے خلاف سکھوں کو حوصلہ دلایا۔ رپورٹ کو غرقِ راوی کیا۔ سارے ہندو پریس نے سکھوں کے رویہ کی
تعریف کی۔ مگر مسلمان کانگرسی بھائیوں کا غصہ احرار پر ہے۔ کہ انہوں نے کیوں علیحدہ انتخاب کا ریزولیوشن
منظور کیا؟ گویا ہندوستان کی ہر قوم نہرو رپورٹ کے حق میں تھی۔ صرف احرار نے نہ مان کر آزادئ ہند کے
حصول میں رکاوٹ ڈالی! پھر ان کانگرسی احباب نے اور غضب ڈھایا۔ اس دروغِ بے فروغ کو دنیا میں اچھالا
کہ احرار نے گلگت انگریزوں کو دلایا۔ کئی سادہ مزاج اس سفید جھوٹ کو سچ سمجھ کر پیٹ پکڑے آئے۔ کہ بھیا احرار
والو کہیں یہ غضب نہ کرنا کہ گلگت انگریزوں کو دلوا دو۔ میں نے کہا۔ کہ حضرت یہ گلگت ہے کہاں؟ بولے
کہ کشمیر ہی میں ہوگا۔ تو پھر میں نے کہا۔ بتایئے کہ کشمیر آزاد حکومت ہے؟ بولے نہیں انگریزوں کے ماتحت
ہے۔ تو میں نے کہا جب ساری ریاست ہی انگریزوں کے ماتحت ہے۔ تو اس کا حصہ بھی انگریزوں کے

ماتحت ہے۔ اس کے لیتے دینے کا سوال کیا ہے؟ جھوٹی خبروں کے اصرار اور تکرار کو بھی پروپیگنڈے کے فن کا اہم
جزو قیاس کیا جاتا ہے۔ انسان کچھ وقت کے لیے دروغِ بے فروغ کو بھی سچائی کی جان سمجھنے لگ جاتا ہے بعض
دفعہ تو دوسروں کے کہے بے وقوف بن کر اپنی پگڑی میں ہاتھی ٹٹولنے لگ جاتا ہے۔ کیونکہ معتبر راوی کہہ دیتا ہے
کہ بھلے مانس تیری پگڑی میں ہاتھی ہے۔ کانگریسی مسلمانوں نے بھی بعض کے کان میں یہی پھونک دیا۔ کہ بھیا مسلمانو! احرار
انگریز کے ایجنٹ ہیں۔ یہ ریاست سے گلگت دلا رہے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد گویا اُن کی آنکھیں کھل گئیں
اور وہ ہوش میں آ گئے۔

ہمارے خلاف پروپیگنڈہ اُس گروہ کا بھی کام تھا جو خلافت اور کانگرس میں ہمارا سردار اور طبقۂ اولیٰ تھا۔
جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ احرار کا یوں یک بیک فروغ انہیں ایک آنکھ نہ بھایا۔ یہی گروہ شہید گنج میں
کُھل کھیلا۔ انہیں بار بار غصہ آتا تھا۔ کہ یہ غریبوں کا حقیر گروہ کیا سے کیا بنتا جا رہا ہے؟

حضرت مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید

علماء کا ایک حصہ امراء کے زیر اثر سرمایہ دارانہ نظام کا ایجنٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ کچھ بزرگ باقی ہیں۔ جو
روحِ اسلام سے سرشار ہیں۔ ان میں سے حضرت مفتی صاحب اور مولانا احمد سعید کو احرار نے ہمیشہ عزت اور
محبت کی نظر سے دیکھا ہے۔ جس کے لیے دل میں محبت ہو۔ انسان چاہتا ہے کہ دنیا کی سب عزتیں اسی
کو ملیں۔ کئی اونچے طبقے کے احباب اس موقعہ پر حکومت اور احرار کے درمیان صلح کا سلسلہ جاری کرنا چاہتے تھے۔
ریاستی حکام اور انگریزی حکومت بہت بیتاب تھی۔ کہ یہ طوفان ذرا تھم جائے۔ حکومت کا منشاء معلوم کر کے دہلی
اور لاہور کے چند خان بہادروں نے درمیان داری شروع کر دی۔ طرفین ایک دوسرے کے دم خم کا اندازہ
لگانے لگے۔ ریاست تو دم توڑ چکی تھی۔ کون بے وقوف ہے جو احرار کو انگریزی حکومت کا مدِمقابل سمجھ لے؟
مگر جو عاشق کسی کے سنگِ آستاں پر سر پھوڑنے کا ارادہ کر لے۔ اس کا کوئی کیا بگاڑے؟ حکومت کا مقابلہ گو ہمارے
بس کی بات نہ ہو مگر ع

"چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ"

کے مصداق پُرامن جنگ کو جاری رکھنا احرار کا مرغوب کھیل ہے۔ حکومتیں ہمیشہ "کنواری مریم" کی طرح اپنے دامن پر بدنامی کے دھبّے سے ڈرا کرتی ہیں۔ ہماری قربانیاں مسلمان کے لیے سرخ روئی کا سامان تھیں لیکن گورنمنٹ کے لیے بدنامی کا داغ۔ اس لیے انگریزی حکومت ریاست سے زیادہ پریشان تھی۔ اس اُصولِ سیاست کے علاوہ کانگرس کی سول نافرمانی کے مقابلے میں احرار کی تحریک زیادہ انقلابی تھی۔ اور زیادہ خطرناک صورت اختیار کر گئی تھی۔ کانگرس کی "سو سنار کی" کے مقابلے میں احرار کی سول نافرمانی "ایک لوہار کی" معلوم ہوئی۔

انگریزی حکّام کو اس آغاز کا انجام سمجھ نہ آتا تھا۔ اگر کسی نے احرار کی اس تحریک کو نہیں دیکھا تو ۴۵ ہزار انسانوں کا ایک صوبے میں زنداں نشین ہونے کا تصوّر کر کے قیاس کر لے کہ مسلمانوں کے جوش اور عوام کی طبیعت کا کیا حال ہوگا؟ کانگرس کی کسی سول نافرمانی میں ۸۰ ہزار سے زیادہ ہندو اور مسلمان اور دوسری اقوام مل کر ایک سال تک قید نہیں ہوئے۔ پنجاب میں تین ماہ کے اندر احرار نے ۵۰ ہزار نفوس کو جیل بھجوا دیا۔ غرض حکومت انگریزی بے تاب تھی۔ کہ احرار سے کسی طرح مخلصی کرائے۔ ہم نے اس عزّت اور محبّت کی بنا پر جو ہمارے دل میں مفتی صاحب اور مولانا کی تھی۔ اپنی طرف سے درمیان داری پسند کیا۔ ہماری نظر میں ان کی درمیان داری اس لیے پسندیدہ تھی۔ کہ وہ اقتصادی لحاظ سے احرار کے درجے میں تھے۔ طبقہ اُولیٰ اور حکّام نے اُن کی درمیان داری کو پسند تو نہ کیا۔ مگر جو چیز احرار کو پسند تھی وہ اس کو ردّ کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ حالات کی مجبوری کی بنا پر حکومت اور ریاست نے ان ہی دو اصحاب کے ذریعے بات چیت کرنا منظور کر لیا۔ چنانچہ مفتی صاحب اور مولانا صاحب لاہور آ گئے۔ خط و کتابت شروع ہو گئی۔ زمانہ انگریزی کا۔ علماء اس زبان سے ناواقف۔ عجیب پیچ پڑا۔ مفتی صاحب اردو میں لکھتے تھے۔ ریاست پنجاب گورنمنٹ کی وساطت سے انگریزی میں جواب دیتی تھی۔

غرض صلح کی مبادیات طے کرنے میں ایک مہینہ گزر گیا۔ اتنے میں کانگرس کی ستیہ گرہ شروع ہو گئی۔ صحیح الفاظ میں گورنمنٹ نے کانگرس کو ستیہ گرہ پر مجبور کر دیا۔ لارڈ "اِرون" جا چکا تھا۔ ہندوستان کا انگریز عُنصر گاندھی اِرون صلح کو سلطنت کے وقار کے خلاف سمجھتا تھا۔ نیا وائسرائے اُن کے ڈھب پر آ گیا۔ حکومت نے نہ صرف سختی کا آغاز کیا۔ بلکہ کانگرس کو ذلیل کرنا شروع کیا۔ آخر مرتا کیا نہ کرتا کانگرس بڑی بددلی سے ۲ سال

کے بعد سول نافرمانی پر مجبور ہوئی۔ "جمعیت العلماء" کانگرس کے ساتھ پورے طور پر وابستہ تھی۔ مفتی صاحب اور مولانا صاحب جمعیت العلماء کے صدر اور سیکرٹری تھے۔ صلح کا مشن ابھی ادھورا ہی تھا۔ کہ انہوں نے لاہور کے ایک جلسے میں کانگرس کی جنگ میں پوری شمولیت کا اعلان کر دیا۔ حکومت پنجاب اور حکومت ہند کی نظر برابر تحریک احرار اور ان بزرگان کی طرف لگی ہوئی تھی۔ امرار کو یہ موقعہ مل گیا۔ وہ پاؤں جلی بلّی کی طرح لاہور اور دہلی بھاگے بھاگے پھرے۔ حکومت کو ڈرایا کہ احرار سے صلح اور وہ بھی جمعیت العلماء کی معرفت، سانپوں کی دودھ سے پرورش کرنا ہے۔ اس سے تو کانگرس مضبوط ہو گی۔ جب صلح کے سلسلے کے دوران میں مولانا اور مفتی صاحب نے نعرۂ جنگ بلند کر دیا ہے۔ تو حکومت کو چاہیئے کہ وہ اپنے نظریّے پر نظر ثانی کرے۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے بجائے احرار کا سر کچل دے۔ یہ غریب لوگ سر پر چڑھے تو آپ کا ہمارا کہیں ٹھکانا نہیں۔ میں نے دیکھا۔ کہ ان دنوں مرزا البشیر محمود قادیانی بے حد سرگرم ہو گیا۔ ایسا موقعہ مخالف کو مل جائے۔ تو وار کرنے سے کب چوکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ پنجاب گورنمنٹ کا رویہ سخت ہو گیا ہے۔ سیاسیات میں معمولی سا واقعہ کتنی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دوران میں براہ راست مولانا مظہر علی سے حکومت کے بعض حامیوں نے سلسلہ جُنبانی کی لیکن مولانا کا رویہ سخت تھا۔ اور وہ ان دنوں جموں جیل میں تھے۔ مجھے دوست دشمن، کا فوری مزاج کا بے ضرر شخص سمجھتے ہیں۔ صلح کی گفتگو میں بعض اوقات ایسے لوگوں کے ذریعے مفید نتائج پیدا ہو جاتے ہیں۔ قرائن سے صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ حکومت مفتی صاحب اور مولانا صاحب کا کام چلتے دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ احرار ورکنگ کمیٹی میں سے ایک میں اکیلا باہر تھا۔ میں دونوں بزرگوں کو نظرانداز کرنا چاہتا تھا۔ جب باتوں باتوں میں حکومت نے میری درمیان داری کی حوصلہ افزائی کرنا چاہی۔ تو میں نے کہا۔ کہ مجھے سلسلۂ صلح آغاز کرنے کا پارٹی نے کوئی حق نہیں دیا۔ کہا گیا۔ کہ تم جیسے چاہو جا کر پارٹی کے سرداروں سے مل سکتے ہو۔ میں نے بیماری کا عذر کر کے مختلف جیلوں میں جانے سے انکار کیا۔ جواب ملا کہ ورکنگ کمیٹی کے سارے ممبروں کو لاہور میں جمع کر دیا جائے گا۔ مگر ان دو بزرگوں کے بغیر میں نے کسی سے ملنے کی حامی نہ بھری۔

سیاسی گفتگوؤں میں اشارات سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ آنکھوں کی گردش اور چہرے کے شکن دل کی کیفیتوں کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ جن کا بغور مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ الفاظ کی بجائے لفظوں کی روح

سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومت نے کھل کر مفتی صاحب اور مولانا صاحب کے خلاف کبھی کچھ نہ کہا۔ لیکن اشاراتی گفتگو صاف گوئی سے زیادہ بلیغ تھی۔

سر سکندر حیات خاں اُن دنوں حکومت پنجاب کے ممبر تھے۔ وہ اور سر جافرے "گورنر پنجاب گورنمنٹ ہند کے نمائندے تھے۔ وہ اس سلسلۂ صلح کے نگران تھے۔ سر سکندر حیات کا رویّہ صلح کے بارے میں قدرتی طور پر ہمدردانہ تھا۔ اگرچہ وہ بھی مفتی صاحب اور مولانا صاحب کی کانگرسی ہمدردیوں کے اعلان پر خوش نہ تھے۔ مگر میری مشکلات کو سمجھتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہوگئی تھی کہ اب اچانک ریاست کے حالات بہت بگڑ گئے۔ احرار کے نمائندانہ اقدام نے ریاستی مسلمانوں کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ ریاست کے اندر ایک عام اشتعال پایا جاتا تھا۔ صلح کا جلد ہو جانا ضروری تھا۔ ورنہ اندیشہ تھا۔ کہ کہیں بغاوت کی آگ اچانک نہ بھڑک اٹھے۔ اس لیے حضرت مفتی صاحب اور مولانا صاحب کو شاملِ صلح رہنے پر بھی اب زیادہ اعتراض نہ تھا۔ امراء کے لیے غریب کی قیادت اور اس کا عزیزِ جہاں ہونا بے حد سوہانِ روح ہوتے ہیں۔ جو ملا اس نے یہی سمجھایا۔ مولانا ان لوگوں کو زیادہ بڑھانا ٹھیک نہیں۔ ممکن ہے کہ انگریزی خواں طبقے کو عربی کے علماء کی رہنمائی پر اعتراض ہو۔ جو علی گڑھ اور دیوبند کی تحریکات کا قدرتی نتیجہ ہے۔ مگر میں نے ساتھ ساتھ ان کے اعتراض کے پردے میں طبقاتی نفرت کو بھی محسوس کیا۔ چونکہ میں خود امراء میں سے نہ تھا۔ اس لیے کسی نے بات کھل کر نہ کہی۔ کہ موری کی اینٹ چوبارے پر نہ لگاؤ۔ اور غریب کا درجہ اتنا نہ بڑھاؤ۔ کہ وہ باوجود غریب ہونے کے امورِ ریاست و حکومت میں جگہ پا لے۔ جو امراء کے خیال میں ان حضرات میں کمزوری تھی۔ وہی ہمارے نزدیک ان کی محبوبیت تھی سچ تو یہ ہے کہ ہم ان کو آگے بڑھانا اسی لیے چاہتے تھے کہ وہ احرار جیسے غریب تھے۔ بڑے لوگ موٹر میں بیٹھے ہوا سے باتیں کرتے بھی جا رہے ہوں تو غریب دور کھڑا اسلام کے لیے جھک جاتا ہے۔ غریب کی عزّت اور اس کی حوصلہ افزائی پیغمبری کا جزو ہے۔ اسی لیے پیغمبر پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سوار کے لیے پیدل کو سلام کرنا ضروری قرار دیا ہے لیکن عوام کے مذہب کا ٹاٹ الٹ کر سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی وفات ہونے کے تئیس برس بعد سرمایہ داری اور قیصریت کو رواج دیا گیا۔ اب غریب کا امیر کو، پیدل کا سوار کو سلام کرنا ضروری قرار پا گیا۔ غریب نواز! اسلام کی کیا پوچھ ہے، جو کسی طرح چاندی سونے کے سکّے جمع کر لے اس کا سکّہ چلتا ہے۔ اسے فی زمانہ بنی نوع انسانی

سے ہمدردی کے بجائے حکومت کا خلل جاتا ہے۔

"میرپور میں بغاوت"

گورنمنٹ پنجاب نے ورکنگ کمیٹی کے ممبران کو لاہور میں جمع کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ مگر علاقہ میرپور کے ریاستی علاقے میں "پُرجوش" پہاڑی لوگوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ موت کھُل کھیلی تھانے چوکیاں جلا دی گئیں۔ ہندو اخبارات کا قول ہے کہ ہندوؤں کے مکانات لوٹے گئے۔ اور اس کے بعد شعلوں کی نذر ہوئے۔ یہ خبریں مبالغہ آمیز تھیں۔ ریاست کے ہندو حکّام کا مسلمانوں پر تشدّد کا یہ ردِّ عمل تھا۔ مگر ریاست کو اصرار تھا کہ یہ آگ احرار کی لگائی ہوئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے جتھے اس علاقے میں ضرور جاتے تھے مگر سول نافرمانی کے لیے۔ نہ کہ تشدّد کو ہوا دینے کے لیے۔ مگر ریاست کا الزام کوئی یونہی کیسے ٹالے۔ ورکنگ کمیٹی میں سے صرف میں ہی ایک شخص جیل سے باہر تھا۔ حکّام کو بتایا گیا کہ میں ہی بیٹھا تار ہلا رہا ہوں۔ تجویز یہ ہوئی کہ مجھے اور آخری جتھے کے آدمیوں کو بغاوت کی آگ بھڑکانے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔ سر جافرے گورنر پنجاب ایک شریف انگریز تھا۔ اس نے کہا کہ گرفتاریوں سے قبل واقعہ کی تحقیق کی جائے کہ یہ کام احرار کا ہے بھی یا نہیں؟ خدا کی نظرِ عنایت ہو تو دشمن، دوست بن جاتے ہیں، مخالف، موافق ہو کر دوش بدوش لڑنے لگتے ہیں۔ یہ صحیح خبر مجھے ایسے ذمہ دار شخص نے دی جس سے یہ توقع نہ تھی۔ اس نے مجھے رات کے ڈیڑھ بجے جگایا۔ اطلاع کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیا کہ اُردو روزنامہ "احرار" کے ساتھ انگریزی صفحہ زیادہ کر لیا جائے۔ تاکہ انگریزی افسران کو پارٹی کے پُرامن مقاصد کا علم ہو۔ ورنہ یہ تحقیقات آپ کی ذات تک محدود نہ رہے گی۔

ہندوستان کی تمام ریاستوں کا انگریزوں پر دباؤ پڑ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان عظیم قوتوں کو خوش کرنے میں احرار بدامن اور تشدّد گروہ قرار پا جائے۔ اور احرار کا ہر ممبر باغی قرار دیا جائے۔ جس جماعت کے خلاف ہندو رائے عامہ ہو۔ ریاستیں دشمن ہوں، مسلمان کا اونچا طبقہ مخالف ہو، مرزائی جماعت جان کی لاگو ہو اسے شدید ابتلا سے بچانے کے لیے اپنے پروپیگنڈے کو کمزور نہ رکھنا چاہیئے۔

چنانچہ مجھے دوسرے ہی دن صرفِ کثیر سے روزنامہ احرار کے ساتھ انگریزی ضمیمے کا اضافہ کرنا پڑا۔ حالات

سے بے خبر دوستوں نے کہا کہ یہ امیری کرلی؟ حالانکہ یہ غریبوں کا بچاؤ تھا۔ ہر چند ہم تشدد کے حامی نہ تھے۔ کوئی ہمیں ایسا قرار دے لیتا تو کیا ہوتا؟ گاندھی نے عدم تشدد کو ملک کا مذہب بنا دیا تھا۔ اہنسا مجھ جیسے ڈرپوک آدمیوں کا پردہ ہے۔ موت کے منہ میں کون جائے؟ چند دن قید کاٹی عمر بھر کی لیڈری مل گئی۔ سچ یہ بھی ہے جب کوئی جماعت "تشدد" کرتی ہے۔ تو ملک اندھیر نگری بن جاتا ہے۔ جہاں بے داد راجہ پھانسی کے پھندوں کے مطابق موٹی گردن دیکھ کر گناہ گار کو چھوڑ کر بے گناہوں کو نوری کی طرح لٹکا دیتا ہے۔ یہ ڈر کہ انگریزی حکومت کہاں کی فرشتہ ہے؟ جلیاں والا باغ کا خون چکاں حادثہ تو آنکھوں دیکھی بات ہے۔ بے گناہوں کا موت کے گھاٹ اتارنا کسی حکومت میں اچھا چیز نہیں۔ ڈر کے ساتھ خدا نے حوصلہ دیا۔ کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ بس میں جماعتی کام میں مصروف ہو گیا۔ انگریزی پولیس نے تحقیقات شروع کی۔ سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی خان بہادر مرزا معراج دین نے میرے بیانات لیے میں نے تشدد کے الزام سے اپنا اور پارٹی کا دامن پاک بتایا۔ اور ساتھ ہی ایک سوال کے جواب میں یہ بات صاف کر دی۔ کہ باوجود ان واقعات کے ہم سول نافرمانی بند نہ کریں گے۔ اس نے کہا۔ گاندھی جی نے چورا چوری کے حادثہ سے سبق حاصل کیا تھا میں نے کہا کہ احرار اس سبق کو دہرانا پسند نہ کریں گے۔ ہمیں اپنا دامن پاک رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب وہ پاک ہے۔ تو دوسروں کے عمل کے باعث اپنے پروگرام کو کیوں بدلیں؟ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے اس رویے کا بہتر اثر ہوا۔ انہیں یہ یقین ہو گیا کہ احرار کے دل میں چور نہیں۔ ورنہ یہ زم تو ضرور ہو جاتے۔ ہماری انگریزی کی تحریر کے باعث غلط فہمیوں کے بادل اور بھی چھٹ گئے

"رمضانِ مبارک" اور "نامبارک ذہن"

مسلمانوں میں ان دنوں تحریک خلافت سے زیادہ سرگرمی تھی۔ پنجاب کے مسلمانوں کو ایک نشہ سا چڑھا تھا۔ سول نافرمانی کو چوتھا مہینہ تھا۔ گر یہ سیاسی طوفان برابر بڑھ رہا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا بے حد متاثر تھی۔ اگر میری اطلاع غلط نہیں تو نواب اسماعیل خاں کی معرفت وائسرائے نے کسی احرار لیڈر سے براہ راست مل کر اس تحریک کی خصوصیات معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ گر مسلمانوں کے اونچے طبقے نے اس کو فخر کی بات سمجھا۔ جس فخر کے وہ تنہا اپنے آپ کو مستحق سمجھتے تھے۔ احرار جیسی ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی مدعی جماعت کے لیے یہ بات

قابل فخر نہ ہوتی بلکہ معمولی کاروباری بات ہوتی۔ اچھا ہوا کہ اعلیٰ طبقے نے میری اطلاع کے مطابق یہ کہا کہ ان چھوٹے طبقے کے لوگوں کو منہ لگانا ٹھیک نہیں اور وائسرائے باز رہے۔

اتنے میں رمضان کا مہینہ آگیا میں متوقع تھا۔ کہ مسلمانوں میں جہاد کا جوش اور شہادت کا شوق بہت بڑھ جائے گا۔ ایسا نہ ہو۔ کہ یہ جوش اور یہ شوق مسلمانوں کو بالکل سرمست کر دے اور تحریک میں نظم قائم نہ رہ سکے۔ مولانا مظہر علی، سید عطاء اللہ شاہ صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ حسام الدین، مولانا داؤد اور مولانا احمد علی صاحب جن کا عوام میں کوئی روشناس ہی نہیں۔ رمضان میں جہاد اور شہادت کے شوق کو کون مناسب حدود میں رکھے گا؟ میری جان دھڑکوں جاتی تھی کہ کہیں مسلمان سر ہتھیلی پر رکھ کر خون کی ہولی کھیلنا شروع نہ کر دیں۔ خون ریزی کا ایک واقعہ ہو چکا تھا۔ کہ احرار کے جلوس میں کسی ہندو نے ایک غریب مسلمان نوجوان کو دن دہاڑے بیچ بازار مار دیا تھا۔ دوسرے دن مسلمانوں نے کئی ہندوؤں کو ہلاک کر کے دم لیا۔ لیکن قتل کے الزام میں لاہور کے سالار اعظم علم الدین دھر لیے گئے۔ جو بعد از خرابی بسیار باعزت رہا ہوئے۔ لیکن معلوم ہوا کہ رمضان مبارک میں قربانی کے ولولے قرونِ اولیٰ کے تاریخی واقعات ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کے لیے رمضان میں کوئی قربانی اور ایثار کا پیغام نہیں بلکہ محض فاقہ کر کے خدا کو خوش کرنے کا مہینہ ہے۔ اگر صبح کے بعد شام کو کھا لینے سے خدا خوش ہو جائے۔ تو شوقِ شہادت اور دردناک اسیری کی سردردی کوئی مول کیوں لے؟ مسلمان اس گئے گذرے زمانے میں بھی خدا کی خوشنودی کو ضرور سامنے رکھتا ہے۔ وہ قربانی کرتا رہا۔ جب تک اسے یہ یقین تھا۔ کہ اس کا خدا یوں خوش ہے۔ اب رمضان مبارک کے آتے ہی خدا کی خوشنودی کا آسان راستہ معلوم تھا۔ کون نہ روزے رکھ کر خدا کو اپنا گرویدہ کر لے؟ میں نے دیکھا۔ کہ پوری قوم پر اوس پڑ گئی ہے۔ ہر شخص جیل جانے کی بجائے روزہ رکھ کر گھر میں معتکف ہو بیٹھا۔ پوری نو کروڑ کی آبادی میں سے ایک بھی تو نظر نہ آیا۔ جس نے خوش دلی سے یہ کہا ہو کہ رمضان میں ہم امتحان کے لیے تیار ہیں۔

اللہ اکبر! کیسا بڑا انقلاب ہے! یا وہ دن تھے کہ رمضان کے مہینے میں شہادت پانے کی مسلمان آرزو کرتے تھے۔ اکثر مسلمان مجاہدوں نے عمر بھر روزے نہیں رکھے۔ مبادا جہاد کے میدان میں ہاتھ کمزور ہو جائیں۔ یا اب یہ الٹی تعلیم ہو گئی۔ کہ جہاد سے منہ موڑ کر رمضان کے روزے مقدم سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ

جتنا کوئی زیادہ دین دار تھا۔ اتنا ہی کشمیر کے مظلوموں اور اپنے سے پہلے جیل میں پہنچے ہوئے مسلمانوں سے بے نیاز ہوکر احرار کی صفوں کو خالی چھوڑ چپکے سے روزے رکھنے لگا۔ اور صاف کہا کہ جو ہو گا اب رمضان کے بعد دیکھا جائے گا۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ جس کے پاس جاتا ہوں۔ قرآن خوانی میں مصروف ہے۔ ہوں ہاں کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔

چودھری عبدالستار بی۔ اے مرحوم فیروزپور سے اپنی گھر والی اور اپنے عزیز واقارب کی بیویوں کو ساتھ لے کر لاہور آ گئے تھے۔ یہ شخص اخلاص اور نیکی کا مجسّمہ تھا تم اس کی سیرت کی عظمت کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہو کہ معزز دوستوں نے اپنی پردہ دار بیبیاں ہمراہ کر دی تھیں۔ کہ اس اسلامی تحریک کی تقویت کے لیے جیل جانا پڑے تو چودھری صاحب موصوف کے حکم کے مطابق سول نافرمانی سے دریغ نہ کریں۔ میں اور چودھری صاحب مرحوم کبھی مل بیٹھتے تھے۔ تو اس بنیادی انقلاب پر بحث کرتے تھے۔ جو مسلمانوں کے خیالات میں آ گیا ہے جس سے مسلمان جہادی زندگی کو خیر باد کہہ کر قولی عبادت کا قائل رہ گیا ہے سینے پر زخموں کے نشان بہادروں کا سب سے بڑا تمغہ ہیں۔ مگر مسلمان نے ان تمغات سے سینوں کو مزیّن کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اسلام کے لیے دشمن کی کڑی قید جھیلنے کا کوئی ولولہ باقی نہیں رہا۔ اکھڑے دل کی نمازیں، رمضان کے بے روح روزے' ان مسلمانوں میں اسلام کا آخری نشان ہیں، حالانکہ سچا مسلمان نیک وقت نمازی اور غازی ہونا چاہیے۔ نمازیں وقت بے وقت ہو جائیں روزے رہ جائیں۔ مگر میدان جہاد میں قدم نہ ڈگمگائے اور ہمت جواب نہ دے جائے۔ کہیں ایسا ذاتی فلاح چاہتے چاہتے قوم مسلم کو کمزور کر دیں۔ اور قولی عبادت کے ذریعے اپنے لیے جنّت میں گھر بناتے رہیں۔ اور ادھر ملت کو کفر کے مقابلے میں خاک چاٹنی پڑے۔

"عورتوں کی شمولیّت کا مسئلہ"

چودھری عبدالستار مرحوم خالص اسلامی ذہن کا مالک تھا۔ وہ جہاد کے معاملے میں عورت اور مرد کے لیے مختلف احکام کا قائل نہ تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ جب نفیرِ عام ہو تو جہاد مرد وعورت پر یکساں فرض ہے۔ جو لوگ عورت کو مختلف جنسیّت کی بنا پر سپاہیانہ زندگی سے محروم رکھتے ہیں۔ اور رسمی پابندیوں کی بنا پر روحِ جہاد سے

ناآشنا رکھتے ہیں۔ اسلام کے بدترین باغی ہیں۔ اگر وہ خود بھی جہاد کریں تو بھی عورتوں کو جہاد کے قابل نہ بنانے پر پوچھے جائیں گے۔ کیا جس قوم کی نصف آبادی جوش جہاد سے بے خبر ہو۔ قوموں کی کشمکش میں اپنا مقام کیسے حاصل کر سکتی ہے؟ جب قوم کے مرد شکست کھائیں گے۔ تو وہی عورت جس کو ہم نے چھوئی موئی بنا کر رکھا ہے۔ اقوام غالب کی عیش پسندیوں پر قربان ہو جائے گی۔ میں نے کہا بھیّا! تم سچ کہتے ہو۔ تو کہا تم سچ پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ میں نے جواب دیا کہ بھئی! میرا دل کافر اور دماغ مسلمان ہے۔ ہم علم اور عقل کی رو سے اسلام کو برحق مانتے ہیں۔ مگر یہ شہنشاہی پسند بڑا کافر ہے۔ اپنی عورتوں کو پردے میں بٹھانے اور غریبوں کی عورتوں کے چہروں کو چاند ماری کا ہدف بنانے کا عادی ہے۔ اگرچہ اقتصادی حالات نے کچھر کس نکال دیا ہے۔ مگر دل راجپوتی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اسلام کا نقش گہرا نہیں کہ ہماری عورتیں بھی اللہ رسول کے نام پر قربان ہونے کے لیے نکل پڑیں۔ ہم لوگ تو سچ پوچھو اسلام کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ خود اسلام کے لیے استعمال ہونا نہیں جانتے۔

میں نے انہیں یہ بھی کہا۔ کہ جب آپ ابھی تشریف نہ لائے تھے۔ عورتوں نے سول نافرمانی کی خواہش کی تھی۔ تحریک کا وہ جوبن تھا۔ جب تحریک بہار پر ہو تو ہر ایک کا دل لہراتا ہے، چاہتا ہے کہ بہاؤ کے ساتھ بہتا جاؤں۔ انبوہ کے ساتھ موت میں بھی مزا ہے۔ لیکن جماعت کے مذہبی عنصر اور تھوڑا بہت سرمایہ دارانہ ذہن اور شاہی دماغ رکھنے والوں نے سول نافرمانی کو عورت کی توہین اور مردوں کی عزت کے منافی قرار دیا ہے۔ اب جبکہ تحریک کا زور رمضان مبارک کے باعث کمزور ہو گیا ہے۔ اب عالی حوصلہ عورتیں کہاں سے آئیں گی۔ کہ اس مردہ بازاری اور سست رفتاری میں خود قربان ہو کر مردوں کی غیرت کو للکاریں؟ جب مردوں کا مذہب میدانِ محاربہ کو چھوڑ کر رمضان کے روزوں اور نمازوں کے لیے معتکف ہو جاتا ہو۔ تو حالاتِ زمانہ سے ناواقف رکھی ہوئی عورتیں تعلیم اسلامی سے بے خبر بے چاریاں کیا پہاڑ ڈھائیں؟ جہاد مرد و عورت پر یکساں فرض ہے۔ مگر جب مرد معتکف ہو جائیں تو خاص دل و دماغ کی عورتیں ہی عزم بلند لے کر نکلیں تو نکلیں۔

میں نے ہزار کہا۔ بھائی جب سب علما، صوفیا اور لیڈروں کی بیبیاں گھروں میں بیٹھی ہوں، تم بھی اپنی گھر والی کو لے جاؤ اسے جیل نہ دکھاؤ۔ کیونکہ مسلمان کم علم اور بسیار گو ہیں، طعنہ دیں گے۔ کہ مسلمان مرد مر گئے تھے جو عورتوں کو آگے کیا؟ کہنے لگے۔ کہ "ایسے بہادر پھر جائیں جیل میں، بیوی کو روک لوں گا۔" میں نے کہا "جو گرجتے ہیں وہ برستے

نہیں۔ طعنہ دینے والے قیامت تک کام نہیں کرتے۔ البتہ کام کرنے والوں کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔" مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اپنی بیوی کو جیل جانے کے لیے آمادہ کر لیا۔ چوہدری صاحب موصوف کی اہلیہ بیچاری گھر گھر پھری۔ کہ کچھ اور عورتوں کو آمادہ کر سکے۔ فی زمانہ خود لیڈروں کی عورتوں کو قربانی سے سروکار نہیں ہوتا۔ علماء کی بیویاں جاہل، صوفیاء کی گھر والیاں نمازوں سے بیزار۔ ہم نے قربانی اور علمِ دین کو نام کی شہرت کا باعث بنا یا ہوا ہے۔ لیڈری، علم اور دینداری آج کل بطورِ فن زیرِ استعمال ہیں اور وہ بھی ذاتی فن۔ ان فنون سے اہلِ خانہ کو آشنا کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ جب مذہب اور علم ترقی درجات اور جلبِ منفعت کے کام آئے۔ تو ایسے ہی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ غرض ہر دہلیز پر ماتھا رگڑنے کے باوجود چوہدری صاحب اور ان کی اہلیہ اور ان کی ساتھی عورتیں صنفِ نازک کو جیل کی سختیوں کے لیے آمادہ نہ کر سکیں۔ مجھے انہوں نے رپورٹ دی کہ سب لیڈروں، ایڈیٹروں، عالموں اور صوفیوں کی عورتوں کو اسلامی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں وہ سخت گندۂ ناتراش ہیں۔ میں نے کہا کہ چراغ تلے اندھیرا ہی رہا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اندھیرا ہونا چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ مگر بات کرو تو وہ کاٹ کھانے کو آتی ہیں۔ میں نے کہا۔ انسان بھی جانور ہے نہ سدھایا جائے تو آخر کاٹنے ہی کو آئے گا۔

باوجود حوصلہ شکن حالات کے ان عورتوں نے ہمت نہ ہاری۔ انہوں نے احرار کی زنانہ شاخ کا اعلان کیا۔ مختلف بیانات کے ذریعے مسلمانوں کے سرد سینوں میں ایمان کی بجھی چنگاریوں کو ہوا دینا شروع کی۔ سلگتی کو بھڑکایا جا سکتا ہے۔ مگر اوس پڑے ایندھن کو جلایا نہیں جا سکتا۔

ولولوں کا سرد پڑ جانا

مختلف قوموں کے مختلف مزاج ہوتے ہیں جن کا انحصار ان کی مذہبی اور قومی تعلیم پر ہے۔ مسلمانوں کے لیے ہندوستان کا ماحول ایسا سدح فرسا ہے۔ کہ اس میں قوتِ عمل بے حد کمزور ہو گئی ہے۔ سیاسی جماعتوں کے اعتبار سے کانگرس اور احرار اگر ہندوستان کی دو نمائندہ جماعتیں مانی جائیں۔ تو مسلمانوں کی قوتِ عمل کا اندازہ نصف ہے۔ کانگرس ایک سال تک سول نافرمانی کر سکتی ہے۔ احرار سول نافرمانی کو چھ ماہ سے زیادہ نہیں چلا سکتے۔ کشمیر کی تحریک کا یہی میرا اندازہ تھا۔ اگر درمیان میں رمضان نہ آ جاتا۔ تو شاید میرا قیاس درست نکلتا۔ بہ میرے گمان میں

بھی نہ تھا۔ کہ مجاہد روزوں کے بہانے کھسک جائیں گے۔ ہمارے دلوں میں مذہب نے کیسی بری صورت اختیار کر لی ہے۔ جہاد قولی عبادتوں اور رسمی روزوں پر قربان کیا جانے لگا ہے۔ غرض جو نہ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ہوا رمضان میں عام مسلمانوں کی خاموشی میدان سے باقاعدہ پسپائی نہ تھی۔ بلکہ ہتھیار اٹھانے سے کانوں پر ہاتھ دھرنا تھا۔ ان حالات میں دفتر نے اعلان کر دیا۔ کہ عید کے بعد سول نافرمانی کا پروگرام زور شور سے جاری کیا جائے گا۔ حالانکہ اب کسی "زور شور" کی امید باقی نہ تھی۔ اب ہمارے پاس بہت تھوڑے والنٹیر رہ گئے تھے۔ وہ بھی کٹے پتنگ کی طرح اداس اور اکیلے اکیلے سڑک کے حاشیوں پر پھرتے تھے۔ بھاگڑ مچی فوج کا دوبارہ مربوط ہو کر لڑنا خوش قسمتی کا کھیل ہوتا ہے۔ ورنہ قانونِ قدرت یہی ہے۔ کہ صفوں کے اکھڑے پاؤں نہیں جمتے۔ اسی لیے پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چار نمازوں کو مؤخر کر دیا تھا۔ لیکن سپاہ کی صفوں کو نہ چھوڑا۔ اور میدان سے منہ نہ موڑا تھا۔ کسی باعث صفوں میں انتشار شکست کا پیش خیمہ ہوتا ہے ٹوٹی ہوئی ہمتیں مشکل ہی سے بندھتی ہیں۔ اب بچی کھچی فوج کا بہترین استعمال کر کے جو فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ اٹھانے کا سوال تھا۔ تاکہ تھوڑا عمل بھی زیادہ معلوم ہو۔

اس وقت کانگرس کی سول نافرمانی شروع تھی۔ لیکن احرار کے عدمِ شمولیت کے باعث اس کی حیثیت خالص ہندوؤں کے مظاہرے سے زیادہ نہ تھی۔ ہمارے سامنے سوال یہ تھا۔ کہ کانگرس کی سول نافرمانی میں شریک ہو کر انگریز کے گھاؤ کو گہرا کریں۔ شاید یوں انگریز ریاست کے مسلمانوں سے انصاف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ علاوہ ازیں یہ بھی مقصود تھا۔ کہ کانگرس کی تحریک مسلمانوں کی شمولیت کے بغیر نہ رہ جائے۔

آخر یہی مناسب خیال کیا گیا۔ کہ اپنے پلیٹ فارم کو قائم رکھ کر مقامی طور پر بدیشی کپڑے کی دوکانوں پر پکٹنگ لگا دی جائے۔ اس طرح مجلس اخراجات کی زیرباری سے بچے گی۔ کیونکہ احرار کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔

گلینسی کمیشن کا تقرر

ریاست کے اندر اور باہر کے حالات جب پورے طور پر مخدوش تھے حکومتِ انگریزی نے بھڑکتے شعلوں پر پانی ڈالنے کے لیے گلینسی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ حکومت پنجاب اب تک احرار کے تعاون کے لیے

لیے تاب تھی اسے علم نہ تھا۔ کہ ہماری تحریک رمضان کے مبارک مہینے کی نذر ہو چکی ہے۔ سر سکندر حیات ذاتی طور پر یا سرکاری طور پر مسلمانوں کے کسی متفقہ مطالبے سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی کوٹھی پر مختلف اسلامی جماعتوں کے نمائندوں کا اجتماع ہوا۔ میں احرار کی طرف سے۔ مرزا بشیر الدین محمود کشمیر کمیٹی کی طرف سے۔ ملک برکت علی لیگ کی طرف سے۔ غالباً محسن شاہ صاحب کشمیر کانفرنس کی طرف سے۔ نواب مظفر خاں ذاتی حیثیت میں شریک ہوئے۔ جانے کے ساتھ ساتھ ریاستی حالات پر بحث شروع ہوئی۔ مجھے اصرار تھا کہ ریاست کشمیر میں بھی پنجاب کا سا دو عملی آئین فوراً جاری کر دیا جائے۔ مرزا بشیر الدین محمود متردد تھا۔ غالباً دلیل یہ تھی کہ ریاست کا مسلمان ابھی تک ایسے آئین کے لیے تیار نہیں۔ کیا جانے کیوں مرزا بشیر الدین محمود نے یک بیک مجھ پر انتخابات میں "کرم فرمایوں" کا ذکر شروع کر دیا۔ حاضرین کو اصل موضوع سے گریز پر تعجب ہوا۔ اور مجھے خلافِ واقعہ احسان جتانے پر غصہ آیا۔ میں نے کہا مرزا صاحب! کوئی الیکشن ایسا نہیں گزرا جس میں مرزائیوں نے میرے خلاف ایڑی سے چوٹی تک کا زور نہ لگایا ہو۔ اور ایک میرا ہی کیا ذکر تمام آزاد خیال مسلمانوں کی مخالفت آپ نے مذہبی فرض سمجھا ہوا ہے۔ ہمارا ابھی خدا کے فضل سے فیصلہ یہی ہے کہ اس جماعت کو مٹا کر چھوڑیں گے۔ ابھی اور بات بڑھا ہی چاہتی تھی۔ کہ نواب مظفر خاں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ آخر قرار یہ پایا کہ متفق ہو کر پنجاب کے موجودہ آئین کو ریاست میں نافذ کرنے پر زور دیا جائے۔ لیکن مرزا صاحب اپنے قول پر قائم نہ رہے۔ اور گلینسی کمیشن کی تقرری کے اعلان کو تسلیم کر لیا۔ مگر احرار نے اس کے ساتھ تعاون سے قطعی انکار کر دیا۔

"جیل میں ورکنگ کمیٹی"

پنجاب گورنمنٹ کو اصرار تھا۔ کہ احرار گلینسی کمیشن کے اعلان شدہ امور پر تنقیح کا مطلب پنجاب کے سے آئین کا اجرا لے سکتے ہیں۔ مگر اعلان شدہ امور تنقیح طلب میں یہ بات صاف نہ تھی۔ کہ یہ کمیشن کشمیر کے لیے پنجاب کا سا آئین مرتب کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انگریز کے کمیشنوں کا ہمیں تجربہ ہے۔ کہ سبز باغ دکھا کر قوموں کو سراب کی نذر کر دیتے ہیں۔ اس لیے انگریزوں کی سیاسی تحریروں سے امید سے بڑھ کر

اُمید کرنا اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کرنا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کئی بار جیل میں اکٹھی ہوئی۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے علاوہ لاہور جیل کے دوسرے احرار قیدیوں سے ملنے اور مشورہ کرنے کی پوری آزادی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ کسی مسلمان جماعت کو بھی گورنمنٹ نے جیل میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس کرنے کا حق دیا۔ دنیا میں طاقت کا بول بالا ہے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس پر سر محمد شفیع صاحب مرحوم نے بھی تو ان دنوں کانگریس کی قربانیوں کے مقابلے میں احرار کو بڑھا کر کہا تھا کہ "ہندو سمجھ لیں کہ مسلمانوں میں احرار جماعت ہے"۔ اس وقت کے حالات ایسے تھے کہ حکومت انگریزی بھی متاثر تھی۔ اس لیے جہاں کانگریس کو ایک سال پہلے آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کو جیل میں اجلاس کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ویسی اجازت احرار کو بھی دی گئی۔ لیکن دوستوں میں سے کسی نے گلینسی کمیشن کو قبول کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید ہر ملاقات میں موجود رہتے تھے۔ وہ بھی احرار ورکنگ کمیٹی کے ہم خیال تھے۔ ہماری رائے یہ تھی کہ ان تنقیح طلب امور کی موجودگی میں گلینسی کمیشن کو کشمیر کے لیے ذمہ دار حکومت کی سفارش کرنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ بہت ہمت سے کام لے۔ لیکن انگریز حقوق دینے کے بجائے حقوق لینے کا عادی ہے۔ مقدر نے اسے شاہ بنایا ہے۔ مگر بنیا شاہ ہے آنکھ بچے تو ڈنڈی ضرور مار جاتا ہے۔ غرض احرار نے امور تنقیح طلب کو نامنظور کر کے قید کی پوری میعاد بھگتنے کا اعلان کر دیا اور ادھوری تمناؤں کے لیے آزادی حاصل کرنا گوارا نہ کی۔ اب سوائے جنگ کو جاری رکھنے کے چارہ کار نہ تھا۔

"مُسلمانوں میں حُقّہ نوشی"

یہ نہیں کہ ایک صرف میری ہی فطرت اس گندی علت کی متحمل نہیں۔ بلکہ ساری ورکنگ کمیٹی اس امر کی شاہد عدل ہے کہ حقہ نوشی گندہ ذہنی کے علاوہ مسلمانوں میں کم ہمتی کا سب سے بڑا باعث ہے حقہ نوش قوم کبھی سپاہی نہیں ہو سکتی۔ کسل اور کاہلی حُقہ نوش قوموں کا امتیازی خاصہ ہے رسول نافرمانی میں ہماری سب سے بڑی کمزوری یہی بدعادت تھی۔ حقہ نوشوں نے قیامت بپا کر دی۔ جیل میں آنے کے دو گھنٹہ بعد ہی منہ کھول کھول کر جمائیاں لینے لگے کچھ اور عرصہ گذرا تو طبیعت پر اور قہر ٹوٹا۔ دن گزرا تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا۔

ساتھ والوں کی منتیں کرنے لگے۔ کہ کہیں سے حُقّہ ملے تو عمر بھر احسان مانوں۔ جب تک حقّے کی بجائے سگریٹ کے کش نہ لگائے برابر منہ سے پانی جاری رہا۔ جیل میں سگریٹ کی اجازت کہاں؟ جب نہیں ملتا۔ نوجوان پر بن آتی ہے۔ رات کالی ڈائن کی طرح بال کھولے کھڑی نظر آتی ہے۔ دن پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔ مسلمان کو کئی کئی دن روٹی نہ ملے تو کچھ پروا نہیں۔ لیکن ایک حقّہ سگریٹ کا ناغہ برداشت نہیں ہوتا۔ پیٹ پر پتھر باندھ سکتا ہے۔ مگر نشے سے صبر نہیں کر سکتا۔ قوم کی عزت و شان بیچ کر معافی مانگ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کا سیدھا راستہ لیتا ہے۔ پھر کیا نشے کے عادی افراد کے بل بوتے پر قومی جنگ جیتی جا سکتی ہے؟ حُقّے کی تباہ کاری کا حال زمینداروں کے حال میں اور نمایاں ہے۔ ایک ہی گاؤں میں دو قومیں یعنی مسلمان اور سکھ بستے ہیں۔ یہ سکھ جہاں حقّہ نوش نہیں وہاں اُن کے کھیت لہلہاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مسلمان زمینداروں کے کھیتوں میں خاک اُڑتی ہے جھاڑیاں کھڑی ہیں۔ حقّہ نوش شخص "صوفی" کے مقابلے میں نصف محنت بھی نہیں کرتا۔ ایک ہی گاؤں میں سنّیوں اور اہل حدیثوں کا حال دیکھو۔ اہل حدیث حقّہ نہیں پیتے ان کی کھیتی ندا اُگلتی ہے۔ اسی جیسی زمین پر حقّے کا عادی سنّی کاشت کرتا ہے تو محض غم برداشت کرتا ہے اور کچھ پلّے نہیں پڑتا۔ یہ اس لیے کہ حقّہ نوش کاہل اور محنت سے جی چرانے والا ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حقّہ نوش شخص حاملہ عورت سے بھی زیادہ ناکارہ اور نکمّا ہوتا ہے۔ وہ تو پیٹ میں بوجھ اٹھائے پھرتی ہے۔ کام کے لیے ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ مگر یہ بچّے کا باپ بچّے سے زیادہ بوجھل حقّے کو ہاتھوں میں اٹھائے پھرتا ہے۔ حقّہ اٹھانے والی قوم کھیتی کرنے اور ہتھیار اٹھانے کے لائق نہیں رہتی۔ اسلحہ اٹھا کر چلے یا حقّہ؟ ہاتھ سے ہل چلائے یا منہ سے نَے لگائے؟ کیا قیامت ہے کہ کافر تو صبح اُٹھ کر منہ صاف کرنے کی فکر کرتا ہے۔ مسلمان حقّہ نوش دہن کو اور گندہ کرنے کا سامان کرتا ہے۔

بعض لوگ طبّی لحاظ سے حقّے کو سگریٹ پر ترجیح دیتے ہیں۔ مگر احرار ان طبّی ترجیحات پر بحث نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک دونوں سخت مضر ہیں۔ لیکن حقّے کا وزن حقّہ نوش کو فوراً بیکار کر دیتا ہے۔ حقّے کو سلگاؤ تو بیٹھ کر پیو۔ کھڑے ہو تو اس کو ساتھ اٹھاؤ۔ ایک مصیبت ہے۔ سلگانے تازہ کرنے میں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ حقّہ نوش قوم کے نزدیک وقت کی کوئی قدر نہیں محنت کی کوئی قدر نہیں۔ ذرا حقّہ نوش مزدور کو عمارت کے کام پر لگا کر دیکھو تو تمہیں خود اس بیان کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ کبھی آگ بناتا۔ کبھی سلگاتا۔ کبھی حقّہ تازہ کرتا۔ کبھی اس

کو کش لگاتا پاؤ گے۔ بھلا ایسی قوم کو کوئی مزدوری پر کیسے لگاتے؟

ان حالات کے پیش نظر خصوصاً تمباکو نوشوں کی معافیوں کو دیکھ کر احرار نے فیصلہ کیا کہ تمباکو کے خلاف جہاد کیا جائے۔ کیسے مشکل کام پر ہاتھ ڈالا ہے۔ خدا خیر کرے مسلمانوں میں عادت راسخ ہو گئی ہے۔

"ریاست سے ہجرت"

علاقہ میرپور میں زیادہ تر اسلامی آبادی تھی۔ وہاں جو ہل چل ہوئی تو انتظام مسلمان افسروں کے سپرد ہوا۔ غیر مسلموں کے مظالم ان کے مقابلے میں گرد ہو گئے۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ مصیبتوں سے کہیں پناہ نہ پا کر ریاستی مسلمان دھڑا دھڑ انگریزی علاقے میں چلے آئے۔ اُف! بے سروسامانی اور غریب الوطنی! گھروں میں آرام کے دن گزارنے والے کیا جانیں کہ رضاکارانہ جلاوطنی بھی کتنی دردناک ہوتی ہے۔ گھر کے در و دیوار یاد آتے ہیں تو پہروں یاد آتے ہیں۔ وہ ہوائیں وہ فضائیں جن میں پرورش پائی ہو۔ دیارِ غیر میں بہشت کی فضاؤں اور ہواؤں سے زیادہ دل کش اور خوش گوار معلوم ہوتی ہیں۔ غریب الوطنی کی شام جیل کی شام سے زیادہ اداس اور گورِ غریباں سے زیادہ بھیانک نظر آتی ہے۔ اور صبح پھانسی کی صبح کی طرح زرد اور یاس انگیز دکھائی دیتی ہے۔ کون غریب ہے جو دکھیا ہونے کے بغیر گھر سے نکلتا ہے؟ جہلم کے کنارے یہ قافلے اُترے شہر ہی کتنا جو مہاجرین کی بڑی تعداد کے لیے پناہ گاہ ہوتا؟ باشندوں نے بڑی جان لڑائی۔ مگر یہ بوجھ ان کی برداشت سے زیادہ تھا۔ اس لیے پیال کورٹ کے غیور مسلمان پھر کام آئے۔ ایک بڑی تعداد کو اپنے شہر میں رکھنے کے لیے لُوٹ آئے۔

میں اس نقل مکانی کو مناسب نہ سمجھتا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی افغانستان کی طرف ہجرت کا واقعہ میرے سامنے تھا۔ ایسے بوجھ کو تو سلطنت بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہم نے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا کہ احرار کا ارادہ ہے۔ کہ شہر میں ریاست کے ان مہاجرین کو پہنچایا جائے۔ چونکہ اب ریاست میں انگریزی انتظام تھا۔ اس لیے انگریزی اور ریاستی حکام دونوں کو اپنی بدنامی معلوم ہوئی۔ انہوں نے مہاجرین کو واپس بلانے کے لیے آدمی بھیجے۔ لوگوں میں پھر ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ کچھ امراء نے بھی رقم جمع کی۔ اور یہ رقم ہمارے انتظام میں نہیں دی بلکہ جہلم میں ہجرت کمیٹی بنا کر یہ روپیہ اس کے سپرد کیا۔ کچھ رقم مظلومین ریاست کے لیے جمعیت العلماء کے دفتر میں آئی۔ انہوں

نے بھی اس کو اپنے نمائندے کی معرفت خرچ کرنا مناسب سمجھا۔ ابھی مہاجرین کی آمد آمد تھی کہ ریاست کے حکام اور انگریزی پولیس کے تعاون سے پھر ان مہاجرین کو لاریوں میں لاد کر واپس لے گئے۔ بارے اتنا ہوا کہ مظالم کم ہوئے اور سب کو تسلّی دی گئی کہ گلینسی کمیشن کا نتیجہ دیکھو ریاست کی کایا پلٹ ہونے والی ہے۔

باب سوم

بعض اوقات اِخلاص جو روح جہاد ہے اِفلاس پر قربان ہو جاتا ہے۔ اگرچہ تحریک سے جان نکل چکی تھی۔ لیکن مخلصین کا ایک حصّہ البتہ مُصر تھا کہ اگر ان کے بچوں کے نان و نمک کا سامان کر دیا جائے تو وہ جیل کو کھیل سمجھیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مالی مدد بہم پہنچائی جائے۔ سیالکوٹ میں ایک معقول رقم پڑی تھی۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ تم خود جاؤ لے آؤ۔ وقت کی بات ہوتی ہے کہ سیالکوٹ کے مقامی کارکن ایک کانگریسی دوست کے زیرِ اثر آ چکے تھے۔ اُنہوں نے بھرے جلسے میں کہہ دیا کہ یہ رقم مرکز کو نہیں مل سکتی۔ یہ بہت ہی بُرا ہوا۔ اگر یہ مدد مل جاتی تو قیاس تھا کہ تحریک ایک ماہ اور بغیر ہماری کمزوری کے اظہار کے زور پر نظر آتی۔ یہ مہینہ فیصلہ کن ہوتا۔ حکومت انگریزی اور ریاست کافی گھبرائی ہوئی تھیں۔ تعجب نہ تھا کہ بہت بڑی عزت کے ساتھ سمجھوتہ ہو جاتا۔ دوست اور دشمن مُسلمانوں کا اور لوہا مانتے۔ سیالکوٹ کی رپورٹ سے حکومت پر ہماری حالت بالکل واضح ہو گئی۔ آج کل کی حکومتیں ایسی بے خبر کہاں؟ اتنے مہینے میں مشکل میں ایک آدھ بار دفتر سے نیچے اُترا تھا۔ سیالکوٹ سے ناکام واپسی پر اب لاہور میں مالی مدد حاصل کرنے کے لیے دروازے دیکھنے پڑے۔ سب کو معلوم

ہو گیا کہ یہ بیمار نہیں ہوشیار ہے۔ بیماری کے دار و گیر سے بچا رہا ہے۔ چنانچہ چیف سیکرٹری کی طرف سے حکم ملا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر لاہور سے چلے جاؤ اور اپنے وطن گڑھ شنکر میں نظر بند رہو۔ دوستوں نے بھی مشورہ دیا کہ جس راستے سب چلے اسی راستے تم چلو۔ یعنی گھر نہ جاؤ جیل جاؤ۔

بزدل اور بہادر

شاید نوجوان میری طبیعت سے اپنی طبیعت کا موازنہ کر کے فائدہ حاصل کر سکیں۔ میں بے حد محتاط طبیعت ہوں۔ محتاط انسان کا خمیر مایہ بزدلی سے اٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے طبیعت کے لحاظ سے بزدل ہوں۔ ہر قدم پر گڑھے نظر آتے ہیں۔ والدہ کی تربیت نے طبیعت میں فرض کا گہرا احساس پیدا کیا ہوا ہے۔ کچھ بہادر دوستوں کی صحبت بھی بزدلوں کو بہادر بنا دیتی ہے۔ ان دو اثرات کے باعث پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوں مگر میدان سے منہ موڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ڈرتے ڈراتے بڑھا چلا جاتا ہوں۔ بہادری خوف سے بالکل بے نیاز ہو جانے کا نام نہیں۔ ڈرتے مرتے بڑھے جانے ہی کو شاید بہادری کہتے ہیں۔ اگر یہ نہیں تو میں ضرور بزدل ہوں۔ مگر وقت پر کام دے جانے والا۔ شاید آج سے پہلے کسی کو میرا یہ راز معلوم نہ ہو کہ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھتا ہوں۔ ممکن ہے کہ انہیں یہ غلط فہمی ہو کہ میں آتش نمرود میں بے خطر کود جانے والا بہادر ہوں۔ ہم میں سے میری طرح جو بھی بزدل ہے وہ فرض کا گہرا احساس ہی کر لے تو جماعت کا کام چل سکتا ہے۔ ورنہ بزدل لیڈر اپنی جان بچانے کو ساری پارٹی کی بربادی کا باعث ہوتے ہیں۔ اور میدان سے پیٹھ دکھا کر فتح کو شکست میں بدل دیتے ہیں بعض اوقات تو وہ لیڈری کا اعزاز چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ الٹے قدم لوٹا لینے کے جواز میں دلائل دینا شروع کرتے ہیں جس سے لوگوں میں بزدلی بڑھتی ہے۔ لیڈر کو بعض اوقات یہ احساس نہیں ہوتا کہ میں بزدل ہوں۔ اس لیے چاہیئے کہ دلائل میں دل کے تقاضوں کو دخل کا موقعہ نہ دے۔ صرف دماغ ہی سے سوچے۔ جب دماغ یہ کہے کہ قربانی کا وقت آ گیا ہے تو دل کی آواز پر کان نہ دھرے۔ اللہ کا نام لے کر کود جائے۔ دنیا کے مفاد سے آنکھیں بند کر کے ہی آخرت کی دولت ملتی ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ دل کے ہاتھوں میرے دماغ نے شکست کھائی ہے۔ مگر عموماً دماغ

ہی میرے دل پر حکمران رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میدانِ عشق و محبت میں بھی دلائل سے کام لے کر وارفتگی سے بچ جاتا ہوں۔ اسی طرح احتیاط میرا جوہرِ خاص ہے۔ میں نے اس تحریک میں بھی بچنے کی بڑی کوشش کی۔ مگر اب جب وقت آ گیا تو باوجود خرابیٔ صحت کے جو میری زندگی کا جزو لازم ہے۔ دوستوں کے مشورے کو قبول کرنے میں زیادہ تردد نہیں ہوا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے جیل کی نسبت نظر بندی قبول کی۔ تو جماعت کی بدنامی اور کئی نوجوانوں کی دل شکنی ہو گی۔ جو باوجود افلاس کے بھی قیدیں صبر سے کاٹ رہے ہیں۔ اگر میں جیل کاٹ آیا۔ تو دوست دشمن سبھی کہیں گے کہ احرار کا آخری سپاہی بھی ہمت نہ ہارا۔ یہ میں آپ بیتی سمجھ کر نہیں لکھ رہا۔ غرض صرف یہ ہے کہ جماعت کے ہر فرد کو معلوم ہو کہ قربانی میں ہر شخص کو خطرہ معلوم ہوتا ہے اور دل ڈرتا ہے۔ اس ڈر کو فرض کے احساس سے دور کرنا چاہیئے۔ احساسِ زیاں اور خوف کے باوجود آگے بڑھنا ہی قربانی اور بہادری ہے۔ خوف کا دل کے کسی گوشے میں نہ ہونا اکثر ناممکن ہوتا ہے۔ خوف پر قابو پانا ہی مجاہد کی حقیقی کامیابی ہے۔ جس احرار کے دل میں اقدام کے موقعہ پر خوف طاری ہو۔ وہ اپنے کو بزدل سمجھ کر بھاگ نہ نکلے۔ بلکہ احساسِ فرض کو سامنے رکھے اور کود جائے۔ اس طرح دنیا میں بہادری کے جوہر دکھلائے۔

عورتوں کی سولِ نافرمانی

غرض میں تکلیفوں کا چارج چوہدری عبدالستار کو دے گیا۔ اور مجھے ایک سال کی سزا ہوئی۔ مرحوم محض پرجوش مسلمان اور بے وقوف مجاہد ہی نہ تھا۔ بلکہ چوہدری عبدالحق بیرسٹر صدر میونسپل کمیٹی فیروزپور کا بھائی اور خود ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر اور حزب الاختلاف کا لیڈر تھا۔ الیکشنوں کے کئی میدان مارے ہوئے تھا۔ اس طرح وہ سیاسیات میں خاصا منجھا ہوا تھا۔ لیکن مردہ تحریک کو زندہ کرنا کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے اور بڑے جتن کیے۔ مگر خاکستر کو کون سلگا سکتا ہے؟ ناچار عورتوں کو آگے بڑھایا کہ شاید مردوں کی ہمت بڑھے۔ مگر ان کی نبضیں چھوٹی ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں سر ہری کشن کول کی جگہ مسٹر کالون وزیر اعظم بنائے گئے تھے۔ ہندو کو برسر اقتدار دیکھ کر مسلمان عوام بے قرار ہو جاتے ہیں۔ اب ریاست میں ایک انگریز کو حاکم دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے اس لیے نہیں کہ ان کے خیال میں انگریز ہندو سے بہتر ہے بلکہ اس لیے کہ وہ ہندوؤں کے

عوام کے ساتھ طرزِ عمل سے بے حد دل برداشتہ ہیں۔ جو ان سے اچھوتوں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان عوام ان کو ہر شعبۂ زندگی میں ذلیل رکھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس سلوک کا انتقام لینے کے لیے وہ اپنے جان اور مال کی بھی پروا نہیں کرتے۔ باوجود ان صاف حالات کے مرحوم نے ہمت نہ ہاری۔ ان کی بیچاری اہلیہ نے مردوں کے مجمعوں میں جاکر چوہدری صاحب کی لکھی تقریریں سنائیں۔ مگر قوتِ بیان ہر ایک میں کہاں؟ عوام سامعین میں یہ نقص ہوتا ہے کہ وہ لیکچروں کو بھی سامانِ تفریح سمجھتے ہیں۔ جہاں تقریر لطافت و ظرافت سے خالی پائی وہیں کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جہاں کسی نے سُر اور تال کے ساتھ کوئی شعر سنایا۔ بغیر مطلب سمجھے جھوم گئے۔ ہر طرف واہ واہ کے ڈونگرے برسنے لگے۔ قیاس کر دا ایسے مزاج کے عوام میں کوئی پردہ دار عورت لکھی ہوئی تقریر کو پڑھ کر کیا خاک اثر پیدا کر سکتی ہے؟ تاہم اس بہادر عورت نے بھاگ دوڑ میں حد کر دی۔ مگر تحریک میں جان پیدا نہ کر سکی۔ آخر چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ عموماً غیر مسلم عورتوں کو بہتر کلاس میں رکھا جاتا تھا لیکن یہ نیک خاتون معمولی قیدیوں میں دن کاٹ کر آئی۔

"قومیں نہیں ہارا کرتیں"

جیلوں میں بند ہو کر کیا ہم ہار گئے؟ بے شک افراد ہار جاتے ہیں۔ قومیں جلدی نہیں ہارا کرتیں۔ ہاں مٹ جاتی ہیں۔ مناسب لیڈرشپ، دل لگتا پروگرام، قوم کی زندگی کا سامان ہے۔ ہم نظربند ہو گئے ہیں نہ ہم ہارے نہ مسلمان ہارے۔ کشمیر میں ہماری جنگ کی نوعیت کیا تھی؟ قابو یافتہ امراء طبقے اور اس کے ایجنٹوں سے غریبوں کی گلوخلاصی۔ ہم نے ہندو مسلمان کے امتیاز کو نگاہ میں نہیں رکھا۔ لیکن ہندو کشمیر میں چند وجوہات سے اپنے آپ کو مسلمان سے برتر سمجھتا ہے۔ راجپوتوں کا طبقہ ہے جو خون اور نسل کے اعتبار سے اپنے آپ کو حاکم گروہ تصور کرتا ہے۔ دوسرا عام ہندو۔ جو مسلمان سے چھوت کرنے کے باعث اپنے آپ کو فائق قیاس کرتا ہے۔ اس لیے ہم نے تو اپنی طرف سے غریب عوام کے لیے جنگ لڑی ہے۔ لیکن ریاست کا ہندو اپنے آپ کو عوام میں نہیں سمجھتا۔ بلکہ حاکم گروہ کا جزو قیاس کرتا ہے۔ اس لیے جب تک ہندو کے ذہن میں ایک بنیادی انقلاب نہ آجائے تب تک ریاست کشمیر میں عوام کا مسئلہ اور غریب کا سوال ہے۔ اگرچہ جوش و سرگرمی میں ہندو کیا

نیشنلسٹ مسلمان نے بھی ہم کو فرقہ پرست کہہ دیا۔ ہم خوش ہیں کہ کشمیر میں حقیقی مسئلہ ہی مسلمان کا ہے۔ صرف وہ ہی مخاطب ہونے کا مستحق ہے۔ وہاں غریب ہندو اس مزاج کا ہے کہ وہ مسلمان کو دبائے رکھنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ پس یہ دو ذہن ایک تحریک میں منسلک نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً جب احرار آواز بلند کریں گے تو ہندو گھبرا جائے گا۔ اس لیے نہیں کہ احرار ہندو عوام کے دشمن ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ہم ہر طبقاتی ذہن کے مخالف ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہندو غریب بھی مسلمان سے اچھوت کا سا برتاؤ کر کے ایک برتری کا ذہن پیدا کر چکا ہے۔ احرار عوام کے اس ذہن کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔

تاریخ عالم میں ایک اناریہ قوم ہے۔ جو آریہ قوم کے ہاتھوں ہار ہو گئی۔ اناریہ یعنی اچھوتوں پر دو طرح سے حملہ ہوا۔ ایک تو آریاؤں نے قوتِ بازو سے انہیں مغلوب کیا۔ پھر مذہب کے ذریعے ان پر اپنی قومیت کو قائم کیا۔ ان کو یقین دلایا گیا۔ کہ تم اپنے کرموں کے پھل کے باعث اچھوت ہو۔ بجز رذیل پیشوں پر قانع رہنے کے تمہارے لیے کوئی چارۂ کار نہیں۔ پس دنیا میں سوائے ہندوستان کے اچھوتوں کے کوئی قوم شکست پر راضی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں پر مدت سے اچھوتوں کا سا سلوک جاری ہے۔ مگر مسلمانوں نے باوجود اقتصادی بدحالی کے ابھی ہار نہیں مانی۔ اگرچہ خود مسلمانوں کے اندر ذات پات کے پجاری پیدا ہو گئے ہیں۔ اور سادات نے برہمنوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ پھر بھی نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے صدقے عوام کا بیشتر حصہ اُخوت و مُساوات کا دل دادہ ہے۔ ہندوؤں کی نادانستہ یا دانستہ کوششوں کے باوجود اچھوت کی زندگی بسر کرنے پر راضی نہیں ہوا۔

بعض آزاد خیال مسلمان قدرتی طور پر متوقع ہیں کہ غریب ہندو اور غریب مسلمان مل کر احرار کی وساطت سے آزادیٔ وطن کے کام میں لگ جائیں۔ مگر وہ احرار کی ابتدائی مشکل کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔ کہ ہندو عوام مسلمانوں کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ کہتری اور بہتری کے موجودہ ذہن کی موجودگی میں اتحادِ عمل کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ ہندوستان میں کسی مشترکہ پلیٹ فارم نہ ہونے کی ساری ذمہ داری ہندوؤں کے اس افسوسناک ذہن پر ہے۔ جس کو وہ ہزاروں سال سے کمال احتیاط سے پرورش کر رہا ہے۔ پس کشمیر میں ہماری جنگ کی نوعیت زبردستوں سے زیردستوں کی گلوخلاصی تھی۔ مگر وہاں کا ہندو غریبوں کا حامی ہونے کے بجائے حکام کا ساتھی تھا اس لیے وہ ہمارا مخاطب نہ تھا۔

جیل میں چلے جانے سے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ ابھی ہم برٹش امپیریلزم کی ملکر کے نہیں۔ مگر ہم نے شکست قبول نہیں کی۔ حالبسواقعات ثابت کریں گے۔ کہ احرار نہ ہندوستان میں اچھوت رہنے پر قانع ہیں۔ نہ امراء اور امپیریلزم سے شکست قبول کرنے والے ہیں۔ غلامی کا درجہ بھی بُرا ہے مگر اچھوت بن کر بسر کرنا اور بھی بُرا ہے۔ احرار امپیریلزم اور اُمراء کے اس لیے دشمن ہیں کہ یہ انسانوں کو غلام رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ احرار ہندوؤں کے دشمن نہیں بلکہ ان کے اس ذہن کے دشمن ہیں جس کے باعث وہ انسانوں کو غلاموں سے بھی بدتر درجہ قبول کرنے یعنی اچھوت رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ قومیں اچھوت بن کر ہار جاتی ہیں۔ الحمد للہ احرار نے اس رمز کو سمجھ لیا ہے۔ رہندوستان میں اب وہ شکست قبول نہیں کر سکتے۔ ہر وہ غریب خواہ ہندو ہو یا مسلمان جس کی آرزوئیں دوسروں کو دست نگر بنانے کی ہوں وہ ہمارا نہیں۔ جو دوسرے انسان کو حقیر دیکھنا پسند کرتا ہے ہم اس کے دشمن ہیں۔ خدا ایسی دشمنی میں ہمیں مضبوط رکھے ؛

"شکوہ و شکریہ"

کانگریس کی تاریخ میں "بارہ دولی" کے ایثار اور احرار کی تاریخ میں "سیال کوٹ" کی قربانی کا درجہ ایک ہے۔ حق یہ ہے کہ بعض پہلوؤں سے سیال کو فوقیت حاصل ہے۔ سیال کوٹ کی سرزمین نیکی اور قربانی کا خواہ کتنا شاداب خطہ ہو مگر بارہ دولی کی طرح سارے ہندوستان کی متحدہ قوت اس کی پشت پر نہ تھی۔ سیال کوٹ نے مظلوموں کی جنگ لڑی۔ مگر اپنی سعی و ہمت سے اگر بارہ دولی کی عورتوں نے ایثار کی مثال قائم کی تو سیال کوٹ کی عورتیں کم مصیبتوں سے نہیں گزریں۔ قربانی کے وقت جن کا رنگ سرخ شادمانی سے دمکتا رہا وہ سیال کوٹ کے مسلمان تھے۔ اس ضلع کی سرداری تھی۔ مگر دوسرے شہروں نے بھی ایثار اور ہمت کا اچھا نمونہ پیش کیا۔ اضلاع امرتسر، لاہور، گجرات، گوجرانوالہ، جہلم، جالندھر، لائل پور، ملتان، لدھیانہ، راولپنڈی، ہوشیار پور، چنیوٹ، انبالہ، وزیر آباد، یو۔ پی۔ سندھ۔ بنگال۔ بمبئی - اجمیر کے صوبجات سے رضا کار آئے سب شکریہ کے مستحق ہیں۔ قوم کی قدر قربانی کے جذبہ پر منحصر ہے بڑھ کر مرنے والی قومیں زندہ رہتی ہیں۔ جان بچانے والے لوگ مارے جاتے ہیں۔ احرار کی کشمیر میں یلغار نے مسلمانوں میں زندگی کے نشانات کو نمایاں کر دیا۔ اور اُن کا سر فخر سے

اونچا ہو گیا۔

پنجاب میں اس وقت تین روزنامے تھے۔ "زمیندار"، "انقلاب" اور "سیاست"۔ "سیاست" کی روش کھلے مخالف کی تھی جس کا افسوس نہ تھا۔ "زمیندار" احرار کا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس کے باعث بحد پریشانی اٹھانا پڑی۔ اس نے دوستی کے پردے میں کسی دشمنی کی کسر اٹھا نہ رکھی۔ خدا جزائے نیک دے "انقلاب" کو کہ اس نے دیانت داری کے سارے تقاضوں کو پورا کیا اور ساری تحریک میں اپنے انداز اور پالیسی کے پیش نظر ایک ہی روش کو قائم رکھا۔

مسلمان کانگرسی کارکنوں میں سے وہ طبقۂ اُولیٰ جو کبھی ہماری سرداری کا دعویدار تھا۔ اس تحریک کشمیر میں ہماری علانیہ مخالفت کرتا تھا۔ یہی طبقہ پھر شہید گنج کی شورش کا باعث ہوا۔ خدا دوستوں کو اجر عظیم دے اور آئندہ کام کی ہمت بخشے۔ تاکہ وہ مجلس احرار کے نظام کو ہر قریہ میں پھیلائیں۔ خدا دشمنوں کو ہدایت دے کہ وہ اس غریب جماعت کو پریشان کرنے سے باز رہیں ؛

"کمیونل ایوارڈ ۱۹۳۲ء"

جیل کی دلچسپیوں اور اُداسیوں کے ذکر کو افراد کے قلب کی واردات سمجھ کر نا موزون خیال کرتا ہوں۔ ہاں بڑے ہی قابل ذکر تاریخی حوادث اس زمانہ میں رونما ہوئے جن سے آئندہ سیاسیات پر گہرا اثر پڑا بیان کرتا ہوں۔

ایک دن ملتان جیل میں صبح سویرے جو اٹھے دیکھا کہ ہر ہندو سکھ سیاسی قیدی کا چہرہ اداس ہے جو جیل کا ہندو افسر آیا وہ بھی پژمردہ۔ الٰہی کیا بیت گئی کہ نصیب دشمناں ان دوستوں کا رنگ رُخ یوں اڑا اڑا سا نظر آتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ بھئی خیریت تو ہے؟ کہا کہ پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد میں اسلام راج کا اعلان ہو گیا۔ اصرار اور تکرار سے پوچھا تو پتہ چلا کہ آج رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم انگلستان نے بندر بانٹ کر دی ہے۔ "سب کچھ اپنے پاس رکھ کر کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ کچھ" صوبوں کو عنایت فرمایا ہے جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت کو قائم کیا۔ البتہ بنگال میں توازن انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ مدت سے ہندو کوشاں تھے کہ اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمان اقلیت میں رکھے جائیں۔

کئی سال سے ہندو مسلمانوں میں یہی تنازع تھی۔ ہندو نہ سندھ اور سرحد میں آئینی حکومت چاہتے تھے اور نہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت پسند کرتے تھے۔ باہم مل کر یہ گتھی نہ سلجھ سکی۔ تو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقدہ لندن میں رامزے میکڈانلڈ کو ثالث ٹھہرایا گیا۔ اس ثالثی پر ہندو مسلمان سکھ سب متفق تھے۔ سب کو یقین تھا کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا۔ سکھوں نے اپنے بڑھے ہوئے مطالبات کے باعث رامزے میکڈانلڈ سے "دلچسپ قوم" کا لقب پایا۔ ہندو سکھ تو بڑی امید لے کر لوٹے تھے کہ پانسہ مار لیں گے۔ مگر ترازو کا جھکاؤ مسلمانوں کی طرف ہو گیا۔ دھم نے زور کیا۔ تخیّل کی پرواز نے اسلامی راج کی صورت پیش کی۔ ڈرے کہ اب دھوتی چوٹی کی خیر نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ اچھے بُرے دونوں قسم کے حملہ آوروں کی داستان ہے۔ مگر انگریزی مصلحت نے مسلمانوں کی تاریخی برائیوں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کر کے ہندو کو مسلمان سے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ اب جو انہیں مسلم راج نظر آیا۔ تو خواب پریشان ہونے لگے۔ سکھوں کی "دلچسپ قوم" نے دلچسپ طرزِ عمل اختیار کیا۔ یعنی گرو گرنتھ کے سامنے حلف لیا کہ ہم کمیونل اوارڈ کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔ اس پر بس نہ کی۔ ہر جلسہ میں "خون کی ندیاں" بہا دینے کی دھمکیاں دینے لگے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی پراگندگی اور سیاسی حماقت سے فائدہ اٹھا کر سکھ جو چند دن پنجاب میں وحشت اور دہشت پھیلانے کا سکھ راج تمام دے چکے ہیں۔ انہیں اب بھی بنا بریں یہی گھمنڈ ہے۔ کہ مسلمانوں کو دبا لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ادھر مسلمان عوام پر خود غرض اور جاہل امراء سوار ہیں۔ وہ قوم کو ہوش ہی نہیں آنے دیتے۔ ان کو منظم کر کے خطرے کا مقابلہ کرنا تو درکنار انہیں تو یہ خوف کھائے جاتا ہے کہ نچلے طبقے کے مسلمان کہیں برابری کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ مسلمانوں کے کسی گاؤں میں جا کر دیکھو اونچے طبقے کا مسلمان نچلے طبقے پر کس طرح ظلم توڑ رہا ہے۔ ادھر مسلمان امراء ادھر سکھ اور ہندو ساہوکاروں نے مل کر پنجاب میں عام مسلمانوں کو بے حال کر رکھا ہے۔ جب سکھ مسلمانوں کو دھمکاتے ہیں تو تمام ہندو پریس اور ہندو سیاستیں شہ دیتے ہیں۔ اس طرح پنجاب میں بھاری پیمانے پر سول وار کو قریب لا رہے ہیں۔ مسلمان ہر چند اپنے ہی امراء کے مارے ہوئے ہیں۔ تاہم سکھوں کی آئے دن کی دھمکیوں سے چڑ بڑ ہوتے ہیں۔ شاید وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکیں۔ ان دھمکیوں کا بڑا مرکز امرتسر تھا۔ امرتسر ہی میں ان کے مقابلے میں مجلس احرار نے سکھوں کی دھمکیوں کا جواب دینے کے لیے عید گاہ میں کامیاب

اجتماع کیا۔ کہتے ہیں کہ امرتسر میں اس سے بڑا اجتماع کبھی نہ ہوا تھا۔

خدا سیّد عطاء اللہ شاہ کی قوتِ بیانیہ میں اور برکت دے جیل سے رہا ہوتے ہی سکھوں کی "خون بہانے" کی دھمکیوں کے جواب میں کیا عمدہ بات کہی کہ "غیرت آج حیران ہو کر ہر نوجوان مسلمان کے منہ کو دیکھتی ہے۔ کہ تم ہی ہو اس قوم کے بے خبر فرزند جس کو انگلیوں پر گنے جانے والے لوگ "خون کی ندیاں" بہانے سے ڈراتے ہیں؟ قومِ مسلم کے بے خبر نوجوانو! ہوش سنبھالو! سکھوں سے کہو کہ ہمیں اپنی پایاب ندیوں سے نہ ڈراؤ۔ ہم تو خون کے قلزم میں گھوڑے دوڑاتے کے عادی ہیں"۔

شاہ صاحب نے تمام پنجاب میں دورہ کر کے مسلمانوں کو حالات سے خبردار کیا۔ بارے سکھوں کا بخار اتر گیا۔ دھمکیاں دینے کا ہذیان کم ہوا۔ اب گرو گرنتھ صاحب کے سامنے حلف کے ایفار کا وقت آیا تو سکھوں میں ایک ایک سیٹ پر جان توڑ لڑائی ہوئی۔ کسی ووٹر نے بھی اسمبلی کے بائیکاٹ کے عہد کو نبھانے کی کوشش نہ کی۔ مسلم عوام ہر چند غیر منظم ہیں۔ لیکن وہ دوسری قوموں سے زیادہ مذہب کی پاسداری کرتے ہیں۔ اگر انہیں نظام میں شامل ہو کر زندہ رہنے کا شعور آ جائے تو دنیا کی کوئی قوم ان کا کیا مقابلہ کرے گی؟

ایک وقت تھا جب جوشِ جوانی میری عقلِ سلیم سے دو چار قدم آگے چلتا تھا۔ اور میں دماغ کے بجائے دل سے سوچا کرتا تھا۔ میں کانگرسی مسلمان کی طرح صرف مسلمان ہی کو ہندوستان کی غلامی کا باعث قرار دیتا تھا۔ لیکن ہندوؤں کے نفرت نما سلوک یعنی چھوت کا مجھ پر گہرا اثر تھا۔ اس لیے حب الوطنی کا جوش کبھی ذرا تھمتا تو کبھی کبھی خیال بھی آتا کہ مسلمان بھی آخر انسان ہے۔ ہندو کے موجودہ سلوک کی موجودگی میں مسلمان سے اتحاد کی خواہش امرِ محال ہے۔ چند مسلمان تو تعاون کے لیے مل سکتے ہیں۔ مگر قوموں کے درمیان چھوت نے ایسا پاٹ ڈال رکھا ہے جس کا پُر کرنا آسان نہیں۔

"کشمیر کے لیڈروں سے تعلّقات"

فطرت کی شرافت انسان کی خواہش آزادی سے جانچی جاتی ہے۔ کشمیر کے محترم لیڈر ایک عارضی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کامل آزادی کی آرزو سے محروم رہے۔ گر وہ بھی جب جیل سے باہر آئے تو فطرتِ سعید کے تقاضوں

سے مجبور ہو کر اسی عنوان سے جدوجہد شروع کرنے لگے۔ جس کے لیے ہم اُن پر پہلے زور دیتے تھے۔ جیلوں میں جا کر ان کی روحوں نے آزادی کا نیا پیام پایا۔ اور آتے ہی ریاست میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کیا۔ اس طرح احرار اور کشمیر کی غریب آبادی کے یہ جانباز سردار اپنی آرزوؤں میں ہم آہنگ ہو گئے۔ ہمیں ابتدا میں یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ کشمیر کے لیڈر ہماری مزید امداد کو شُبہ کی نظر سے دیکھیں گے۔ انہوں نے ہماری امداد کو اپنے اثر و رسوخ کی کمی کا باعث سمجھا۔ سب سے اہم یہ کہ کشمیر کے محترم لیڈروں کا اس وقت جب احرار کشمیر کی سیاسی تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ احرار کے ساتھ سیاسی نصب العین میں ہم آہنگ نہ ہونا عوام نے بری طرح محسوس کیا۔ جس کا گہرا اثر جماعت کے افراد پر پڑا۔ بظاہر آئندہ کے اتحاد عمل میں دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ احرار کو اس سے زیادہ کوئی اور خوشی نہیں کہ کشمیر کی مظلوم آبادی کو آزادی ملے۔ خواہ کسی کے ہاتھ سے ملے لیکن یہ احساس ضرور ہے کہ کشمیر کے قابل عزت کارکنوں اور ہندوستان کے احرار میں پوری پوری یک جہتی نہیں ہوئی۔ ایسا ممکن نہ ہو سکا کہ جو آواز کشمیر سے اٹھے۔ اس کی صدائے بازگشت ہندوستان میں سُنی جائے یا جو صدا ہندوستان کے احرار اٹھائیں۔ اسی کی گونج کشمیر کی وادی میں بلند ہو۔ تاہم دونوں طرف سے یہ کوشش جاری ہے کہ شریفانہ تعلّقات میں کمی نہ آئے۔

دنیائے اسلام کی سب سے بڑی بدبختی مسلمانوں کا قبائل اور خطوں میں تقسیم ہونا ہے۔ جس کا نتیجہ ہر خطے اور قبیلے کی کمزوری اور بے بسی ہے۔ یورپ نے پانچ صدیوں کی متواتر کوششوں کے بعد اسلام میں لامرکزیت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی کا سہرا زیادہ تر انگلستان کے سر ہے۔ جس کی رہنمائی میں اسلامی ممالک خوانِ یغما کی طرح فرانس، اٹلی اور انگلستان میں بٹ گئے۔ شیر برطانیہ نے اس بانٹ میں سب سے بڑا حصہ پایا۔ آج اسلامی ممالک کے اجزا ایک دوسرے سے علیحدہ اور آزاد ہیں۔ دو کروڑ کی آبادی کے ممالک سے لے کر ۱۵ ہزار کے قبائل پر شاہ اور شیخ مسلط ہیں۔ اور یہ اسلامی شاہ اور شیخ، شاہِ شطرنج کی طرح انگریز اور یورپی پیادوں کے آگے بھاگتے ہیں۔ اور زِچ ہو ہو کر مات کھاتے ہیں۔ مگر ہر روز جوتے کھانے کے باوجود ہوش نہیں آتا کہ آؤ مل کر ایک اسلامی فیڈریشن بنا لیں۔ مگر انہیں یہ خیال کیوں آئے؟ اگر وہ یورپ سے جوتے ہیں تو اپنے ہم مذہب غریب بھائیوں کو لوٹ لوٹ کر کھاتے ہیں اور انہیں اپنے جوتے تلے دباتے ہیں۔ بڑے بڑے شیوخ اور چھوٹے چھوٹے

سلاطین کو یہ زندگی پسند آ چکی ہے۔ اسلام کے حقیقی انقلابی پیغام کی ان کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ امیرانہ زندگی انہیں حاصل ہے وہ اسی پر قانع ہیں۔ غریب مسلمان بھاڑ میں جائیں ان کی تو مزے میں گزرتی ہے۔

ہندوستان کے احرار باوجود ہندو کی تنگ دلی کے آزادی وطن کے ان تھک سپاہی اور بارعایت مذہب سب کے خادم ہیں۔ لیکن بحیثیت مسلمان کے ان کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کے ہر حصے کے غریب مسلمان ایک لڑی میں پروئے رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ موجودہ حال کی طرح وہ ہمیشہ اسی طرح بے حیثیت گروہوں میں منقسم رہیں۔ نہ اپنے لیے مفید نہ ملک اور انسانیت کے لیے فائدہ رساں۔ تحریک کشمیر میں ہمارا حصہ اس خواہش کا اظہار بھی تھا کہ غریب عوام کی خدمت کے ساتھ یہ بات بھی ظاہر ہو جائے کہ مظلوم اور غریب مسلمان بے یار و مددگار نہیں ملکی اور صوبائی علیحدگی اور حد بندی کو ہم قبول نہیں کرتے۔ اس زمانہ میں صوبہ جات کی آزادی نے مسلمانوں میں صوبجاتی تعصّب زیادہ کر دیا ہے۔ اور ہر صوبہ چند خود غرض نام نہاد لیڈروں کی آرزوؤں کے مطابق کام کر رہا ہے۔ یہ لیڈر چونکہ طبقۂ اُولیٰ سے متعلق ہیں۔ غریبوں کی خواہشات سے الگ ان کے اغراض ہیں۔ اس لیے ہر صوبے کے مسلمان الگ الگ زاویہ نگاہ کے مطابق تربیت پا رہے ہیں۔ ہندوستان میں غریب مسلمانوں کی یہ گروہ بندیاں صرف چند امرا کی خدمت کے کام آئیں گی جس طرح افریقہ اور ایشیا کے قبائل اور ملک شاہ و شیوخ میں تقسیم ہو کر برباد ہو رہے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے صوبے الگ الگ ہو کر پامال ہوں گے۔ الحمدللہ احرار ایسی تحریکات سے بیزار ہیں۔ صوبائی تعصّبات کو پیدا کرنا اسلام کے اعضا کو کاٹ کر الگ کرنا ہے۔ مصر، ترکی، عرب، ایران، مراکش اور افغانستان نے الگ الگ رہ کر کیا فائدہ اٹھایا جو ہم ہندوستان میں اٹھائیں گے؟ کیا یہ ممالک کسی بڑی یورپی سلطنت سے الگ الگ رہ کر دو دن بھی ٹکر لے سکتے ہیں۔ ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد چن کر امرا نے مسلمانوں کی عام قوتوں کو برباد کر رکھا ہے۔ ہم مسلمانوں کی موجودہ پریشان حالی کا باعث شیوخ سلاطین اور امرا کو سمجھتے ہیں۔ غریب مسلمان اب بھی دنیا کی عظیم قوت بن سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے سر سے امرا، شیوخ اور سلاطین کا منحوس سایہ اٹھ جائے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ کشمیر کی لیڈر شپ احرار کی طرح غریبوں کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح وہ ٹھوکر کھا کر کشمیر کے سیاسی نصب العین کو ذمہ دار حکومت قرار دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اسی طرح ایک دن احرار کے

ساتھ گہرے قلبی تعلقات قائم کرنے کو ضروری سمجھیں گے۔ کیوں کہ ان کے اور احرار کے ذہن میں تفاوت نہیں۔ عوام کی حکومت قائم کرنا دونوں کا نصب العین ہے۔ انہیں جاگیرداروں، بڑے بڑے سرداروں کا خوب تجربہ ہے۔ احرار کے افراد کو گزشتہ باتیں بھول کر بطور غریب لیڈروں کسان کی قدر کرنی چاہیئے۔ جہاں تک ہوسکے ان کی عزت افزائی کرنی چاہیئے۔ یاد رکھو جو غریب لیڈر آپس میں رواداری اور محبت نہ رکھیں گے۔ ہمیشہ امیروں کے ایجنٹ بن کر رہیں گے اور سرمایہ داروں کو گردن پر سوار رہنے کا موقعہ دیں گے۔

"کپورتھلہ ایجی ٹیشن"

(۱۹۳۳ء)

ریاست کپورتھلہ کی ایجی ٹیشن مصیبت زدہ کسانوں کی بھیگی ہوئی پلکوں کی دکھ بھری کہانی ہے۔ کسی کا حق نہیں کہ راجوں مہاراجوں کے عالی شان محلات سے رعایا کی خوشحالی کا قیاس کرے۔ بلکہ یقین یہی کرے کہ ان سر بفلک کشیدہ عمارتوں کی تعمیر کسانوں کی پھوٹی تقدیر نے کی ہے۔ ریاستوں کی دکھی دنیا کی داستانِ مصیبت کو شروع کر کے آنسو رونے کے بغیر کون ختم کر سکتا ہے؟ انگریزی علاقے کے کسان کے جسم پہ چیتھڑے اڑے دیکھ کر گھبرا جانے والے اگر ریاستوں کے کاشت کاروں کی پریشان حالی دیکھیں۔ تو انگریزی حکام کی رحم دلی کی داد دیں اور انگریزی علاقے کے کسان کو بہشت کا باشندہ سمجھیں۔ ریاستوں کے رئیس نہ ہندو ہوتے ہیں نہ مسلمان۔ وہ خالص رئیس ہوتے ہیں۔ یعنی خوفِ خدا سے بے نیاز طعنہ خلق سے بہت دور۔ جب تک سرکار انگریزی کا سایہ ہندوستان میں موجود ہے۔ کوئی رؤسا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بد اعتدالیوں کی انہیں کھلی چھٹی ہے جیسے قوانین چاہیں جاری کریں۔ جو لگان چاہیں وصول کریں۔ شادی اپنی رچائیں اور ٹیکس رعایا پر لگائیں۔ دوسرے ریاستوں کے مدعو راجوں مہاراجوں کے گل چھرّے اڑانے کا ڈنڈ مفلس کسانوں سے طلب کریں۔ سرکار انگریزی باز پرس کیوں کرے؟ انگریزی راج کے ساتھ دیسی سوراج کا ایسا نمونہ چاہیئے تاکہ لوگ انگریز بہادر کی جے پکاریں اور سب کہیں کہ بھیا فرنگی سرکار میں بڑا امن ہے۔

یاد رکھو کسی ملک میں اچانک تحمل کا پیدا ہو جانا۔ لوگوں کی تکلیفوں کے گہرے احساس کا مظہر ہے۔ کون ہے جو آرام کو بیچ کر مصیبتوں کو مول لے۔ چند عام لوگ کسی اعلیٰ یا ادنیٰ جذبہ کے ماتحت کبھی ایسا کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن عوام کا قانون یہی ہے کہ خوش حالی میں کوئی بے اطمینانی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ جہاں فاقوں سے ماری مخلوق بستی ہے وہاں معمولی سا شوشہ فتنۂ قیامت بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی پشت پر گہرے جذبات کام کرتے ہیں۔

کپورتھلہ ایجی ٹیشن بہ باسانی افق پر ایک ٹکڑا ابر کی طرح نمودار ہوا جو دیکھتے دیکھتے طوفان بن گیا۔ قصبہ بھوگا کہ بھگوال میں جو ریاست میں راجپوتوں کا مرکزی مقام ہے مظلومینِ کشمیر کے حق میں جلسہ عام ہوا۔ دردمند دل کو دیکھ کر اپنے دکھ یاد آجاتے ہیں۔ کشمیر کے ہنگامے نے لوگوں کو خون کے آنسو رلا دیئے۔ ابھی اس ریاست میں سیاسی تحریک اٹھانے کا یارا کسی کو نہ تھا۔ اس اجتماع سے فائدہ اٹھا کر کچھ اصلاحی کاموں پر توجہ دینا شروع ہوئی۔ یہ کچھ عجب نہیں قدرتی بات ہے۔ کہ مسلمان جہاں مل بیٹھ کر کوئی کام شروع کرتے ہیں عموماً ان کی پہلی توجہ اپنی اقتصادی بدحالی کی طرف جاتی ہے جب وہ اس کے اسباب تلاش کرنے لگتے ہیں۔ تو ہندو دکاندار اور ہندو ساہوکار سامنے آتے ہیں۔ ساہوکار سے زیادہ ہندو دکاندار ان کی آنکھوں میں خار کھٹکتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ پیسہ کماتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ چیز دیتے اور پیسہ ہاتھ میں لیتے وقت مسلمان گاہک سے اچھوت کا سلوک کرتا ہے۔ وقت پر خواہ وہ کیسی بے غیرتی دکھا کر اس بدسلوکی کو برداشت کر جائے۔ مگر دل میں گرہ ضرور رہتی ہے۔ کہ روپیہ بھی خرچ کیا۔ بے عزت بھی ہوئے نقصان با برداشت ہو سکتا ہے۔ مگر سلوک ہمسایہ کوئی کب تک برداشت کرے؟ ہندو مسلمان کشیدگی کی بنیادی وجہ ہندو کا مسلمان کو اچھوت سمجھنا ہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے اول بھگوال کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے اقتصادی اور مجلسی بائیکاٹ کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور خرید و فروخت عورتوں کے بجائے خود مردوں کے ذریعے کرنا چاہی۔ ہندو دکاندار بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے گربہ کشتن روزِ اول کے مصداق شور مچانا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے ہمارا بائیکاٹ کر دیا۔ ساہوکاروں نے دکانداروں کی حمایت کی معاملہ ذرا بڑھا۔ بنیا بڑا کایاں ہے معمولی بات پر کائیں کائیں کرنے لگتا ہے اس ریاست میں ساہوکاروں کا بڑا رسوخ ہے تھوڑا سا شور بڑی پکار بن کر حکام کے کانوں میں پہنچتا ہے۔ لیکن حکام کیا کہیں کہ مسلمانو! تم اپنی عورتوں کو خرید و فروخت کے لیے ضرور بھیجا کرو اس لیے افسران نے ہندوؤں کی پکار پر دھیان نہ دیا۔ ہندوؤں نے

ہڑتال کر دی۔ مسلمان ایک ہی جون میں حیران ہو گئے اور لگے بغلیں جھانکنے اور تو کچھ نہ کر سکے۔ ساہوکاروں کی اراضیات کاشت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جانِ مجنوں کو ایک رنج و عذاب نہیں۔ جانِ شیریں ساری داغ داغ ہے۔ پنبہ کہاں کہاں رکھے؟ یہاں کے مطابق زمیندار کو ہندو دوکاندار سے اس کی چھوت کرنے کا شکوہ، ساہوکار سے خون چوس جانے کا گلہ، حکام سے ٹھیاں ٹپیں ڈالنے کی شکایت۔ ساہوکار اور سرکار کاشت کے معاملے میں ایک ہو گئے۔ حکم جاری ہو گیا۔ کہ جس گاؤں میں جتھے بندی کے طریق پر کاشت اراضی سے انکار ہوگا۔ اس کا بار اس کے باشندوں پر ڈالا جائے گا۔ پولیس تو حکام کے اشاروں کی منتظر ہوتی ہے۔ جب ساہوکار اور سرکار ایک ہوں تو پولیس کا غصہ نتھنوں میں کیوں نہ آ جائے؟ یہ مقامی جھگڑا بڑھا اور ساری تحصیل بھولتھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پولیس کے تشدد نے معاملے کو ہوا دی۔ ساہوکار اور کاشتکار کے سوال نے مہیب صورت اختیار کر لی۔ عوام کو امید تھی۔ کہ ریاستی سرکار، ساہوکار اور کاشتکار کے معاملے میں بدحال کاشتکار کی مدد کرے گی۔ نتیجہ امید کے خلاف پا کر وہ حکام سے قطعی مایوس ہو گئے۔ بعض نے ہجرت کا مشورہ دیا۔ کیسا غلط مشورہ تھا؟ ہجرت قربانی کی بڑی کٹھن منزل ہے۔ مکہ (معظمہ) کے خوش نصیب مہاجرین کو مدینہ (منورہ) کے نیکوکار انصار مل گئے۔ لیکن ہر خطہ مہاجرین کا مدینہ نہیں، ہندوستانیوں کی کابل کی طرف ہجرت کا ہمیشہ سبق یاد رکھنا چاہیئے۔ ہجرت اسی حال میں بابرکت ہے جب مہاجر دیس سے زیادہ پردیس میں مصائب جھیلنے کا فیصلہ کر کے گھر بار چھوڑے۔ جو آرام پانے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں دکھ اٹھاتے ہیں جو دکھ اٹھاتے چلیں فتح و کامرانی کا منہ دیکھتے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں واقعات اور اس کے نتائج پر بحث کروں۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء تک کے حالات کا نظارہ طائرہ کر لیں۔ سیکرٹری مجلس احرار دسوہہ نے خود واقعات کا جائزہ لے کر جو بیان اخبارات میں دیا۔ اس کا مطالعہ فرمائیں۔

"ریاست کپورتھلہ کے ہندو ساہوکاروں کی اشتعال انگیز روش"

تحصیل بھولتھ کے مسلمان کاشتکاروں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے منصوبے

"کئی ماہ سے تحصیل بھولتھ ریاست کپورتھلہ کے متعلق ہندو اخبارات کے پروپیگنڈا سے بے شمار غلط فہمیاں دوآبہ بست جالندھر میں خصوصاً اور پنجاب کی اخباری دنیا میں عموماً پیدا ہو گئی ہیں۔ بحیثیت ایک خادم ملت

مجھے اس امر کے احساس نے صحیح حالات کی تحقیق پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو میں نے اسی امر کی جستجو میں تحصیل ہٰذا کے شمالی حصہ کے دس دیہات کا دورہ کیا جس کے نتائج امید ہے کہ ان غلط فہمیوں کے ازالے کا باعث ہوں گے۔

گزشتہ رمضان مبارک میں جب سرفروشانِ احرار، ریاست کشمیر کے عاقبت نااندیش حکام کے انسانیت سوز مظالم کے خلاف مصروف جہاد تھے۔ اس وقت بیگووال کے حساس مسلمانوں کو بھی اپنے ان مظلوم بھائیوں کی اخلاقی و مالی امداد کے فریضے کی ادائیگی کی طرف رغبت ہوئی۔ تو میر پور رڈے کے عظیم الشان جلسے میں بمقام بیگووال قرار پایا کہ عید الفطر کے موقعہ پر چندہ فراہم کر کے مظلومین کشمیر کی بذریعہ مجلس احرار امداد کی جائے۔ ساتھ ہی مسلمانانِ علاقہ کی اخلاقی و اقتصادی اصلاح نماز و روزہ کی پابندی کے لیے تبلیغ کا انتظام بھی کیا گیا۔ ہندو ساہوکاروں کی قلیل آبادی کو یہ امر شاق گذرا۔ اس پر وہ چراغ پا ہوئے اور شور محشر برپا کر دیا۔ رضاکاران اسلام بیگووال کی جماعت نے پہلا قدم یہ اٹھایا تھا۔ کہ مسلمان عورتیں خرید و فروخت کے لیے بازار میں نہ آئیں۔ کیونکہ یہ اخلاقی و اقتصادی اصلاح کے لیے ضروری تھا۔ جب عورتوں کو یہ کہنا شروع کیا کہ خرید و فروخت مردوں کے ذریعے ہو۔ اور اگر کسی بہن کو دقت محسوس ہو تو ہم خود اس کی ضرورت کی اشیاء خرید کر لا دیں گے۔ ایسے ہندو ساہوکاروں اور دوکانداروں نے پکٹنگ کا جامہ پہنا کر حکام ریاست سے شکایتیں شروع کر دیں۔

حالانکہ رضاکار نہ بازار میں جاتے تھے۔ اور نہ دوکانوں پر خرید و فروخت میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے۔ بلکہ گھروں پر جا کر سمجھاتے بجھاتے تھے۔ اور ایسی عورتوں کا سودا خود خرید کر ان کے گھر پہنچاتے تھے جن کے مرد موجود نہ ہوں۔ یہ ہے حقیقت اس پکٹنگ کی جس کے متعلق آج تک بدستور شکایت کی جا رہی ہے اور افسرانِ علاقہ ہندو دوکانداروں کی شکایات پر بلا تحقیق مسلمانوں کو دھمکاتے ہیں۔

رضاکار صبح اور شام کے وقت مساجد میں نماز ادا کرنے کے لیے مسلمانوں کے گھروں پر کلمہ طیبہ کا ذکر کرتے ہوئے جاتے اور غافل مسلمانوں کو مسجد میں آ کر نماز ادا کرنے کے لیے توجہ دلاتے تھے۔ بیگووال کے ساہوکاروں نے اس پر بھی بے شمار اعتراضات کیے۔ یہاں تک کہ نعرہ تکبیر کی قطعی بندش کے لیے حکام ریاست سے امداد طلب کرتے تھے۔ عامۃ المسلمین ان اعتراضات پر اکثر برافروختہ ہوتے۔ مگر ذمہ دار اصحاب کی دانشمندانہ تدابیر

انہیں جادۂ عدل سے باہر قدم نہ نکالنے دیتیں۔ اسی وجہ سے کام صلاحیت سے چلتا رہا۔

اسی اثناء میں مسلمانوں کے لیے ہندو دوکانداروں نے دو روزہ ہڑتال کر دی۔ ہڑتال کے پہلے ہی دن ایک مسلمان بتقضائے الٰہی فوت ہو گیا۔ اس کا وارث کفن کا کپڑا خریدنے کے لیے دکانوں پر آیا تو جواب صاف پایا۔ اس غریب کے کفن کا کپڑا پیر سید جعفر حسین صاحب نے مہیا کیا۔ اسی طرح دو روز تک مسلمانوں کے لیے روزانہ ضرورت کی اشیاء کی فروخت بند رہی۔ اس پر خاص بھگوال اور بھولتھ دیہات سے اپنی دوکانوں کے اجراء کا تقاضا شروع ہوا۔ اور بہت جلد بھگوال اور اس کے نواح میں مسلمانوں کی دکانیں کھل گئیں جس نے ہندو سرمایہ داروں کو اس علاقہ کے غریب مزدوروں اور کاشت کاروں کے اور بھی درپے آزار کر دیا۔ انہوں نے یہ متفقہ فیصلہ کر لیا کہ ان لوگوں کو آئندہ قرض نہ دیا جائے اور سابقہ قرضوں کا فی الفور تقاضا کیا جائے چنانچہ ساہوکاروں کی طرف سے اس فیصلہ پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ اور نہایت سختی کے ساتھ مقروضوں سے وصولی قرضہ کا مطالبہ شروع ہونے لگا۔ اس پر کاشتکاروں کو اس امر کا احساس پیدا ہوا کہ پہلے کی طرح اب بلا رسید لین دین نہ کریں گے۔ چنانچہ ساہوکاروں کی اراضی کی پیداوار کی بٹائی کی کاشت کاروں نے رسیدیں طلب کیں۔ جو اس وقت تک حاصل نہ کر سکے جب تک تحصیل دار صاحب علاقہ نے ساہوکاروں کو رسیدات دینے کے لیے مجبور نہ کیا۔

اب نذر مالیہ ادا کرنے کا وقت آیا۔ تو زمینداروں اور ساہوکاروں نے مالیہ بمعہ وقت وقت پر ادا کر دیا۔ اور ساہوکاروں کو قرضہ جات کے سود واپس نہ کر سکے۔ کیونکہ یہ امر یقینی تھا کہ اگر پیداوارِ فصل ربیع ساہوکاروں کو دے دیتے تو مالیہ کی ادائیگی ان کے لیے ناممکن ہو جاتی۔

ماہ جون کے آخر میں تحصیل بھولتھ کے ذمہ دار اصحاب نے مطالبات کی ایک طویل فہرست مہاراجہ بہادر کی خدمت میں پیش کی جن کی تائید ریاست کے ہر حصے سے ہوئی۔ ان میں سے پانچ نہایت اہم ہیں جن کے باعث آج تک کشمکش جاری ہے:

۱۔ آئندہ اصلاحات کے مطابق ہندوستان میں جو اختیارات صوبجاتی کونسلوں کو دیے جائیں۔ انہی پر ریاست میں عمل درآمد ہو۔

۲۔ ایکٹ انتقالِ اراضی مروجہ پنجاب جلد از جلد ریاست میں نافذ ہو۔

۳۔ مزدوروں اور پیشہ وروں کی جائیداد غیر منقولہ (مکانات رہائشی وغیرہ) قرق ہونے سے مستثنیٰ قرار دی جائے۔

۴۔ قرضوں کی اصلیت کی تحقیق کی جائے۔ کہ اصل زر میں کتنا سود شامل ہو چکا ہے اور ڈیوڑھے سے جتنی رقم تجاوز کر چکی ہے۔ ناواجب قرار دی جائے۔

۵۔ مالیہ ریاست میں مناسب و معقول مستقل تخفیف کی جائے۔

ان مطالبات نے کشمکش میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ جو ساہوکاروں، کاشت کاروں اور مزدوروں کے مابین بے اعتمادی کی آخری حد کا باعث ہوئے۔

اب ساہوکاروں کو اپنی اراضی کی کاشت مطلوب تھی۔ اور مقروض کاشت کار اور مزدوروں کو ایسے در قرضہ کی رسیدیں درکار تھیں۔ جو وہ ساہوکاروں کو واپس کر چکے تھے۔ یہ وصولی کی رسیدیں دینے سے انکار کرتے تھے۔ اور وہ کاشتِ اراضی سے دست کش تھے۔ عوام کی ہمدردی اس غریب طبقہ سے فطرتی تقاضا تھا۔

اس تحصیل بھولتھ کے باشندگان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے مہاراجہ بہادر کی طرف سے ایک ایسی کمیٹی کا تقرر ہوا جس کا صدر مجسٹریٹ بلانہ تھا۔ جب اس کمیٹی کے روبرو یہ معاملہ پیش ہوا تو صاحب صدر نے بعد استصواب وزیر اعظم حسابات کی جانچ پڑتال کے اعتراض پر غور کرنے سے انکار کر دیا اور ساہوکاروں کی اراضی کاشت کرانے کے لیے ممبران کمیٹی پر زور ڈالا اور وہ بھی اس وقت جب کہ زمینیں خشک ہو چکی تھیں۔ اور قابل کاشت نہ تھیں۔ اتحاد کمیٹی کے صدر نے نہ معلوم اس سوال کو بعد از وقت کیوں اٹھایا اور جون تک کے وقت کیوں ضائع کیا؟

عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اتحاد کمیٹی کا صدر اتحاد کا معاملہ تعویق میں نہ ڈال رکھتا۔ تو پہلی نشست میں اس کے تصفیہ کی طرف راغب ہوتا۔ طرفہ یہ کہ ساہوکار اور زمیندار نمائندے وقتاً فوقتاً توجہ بھی دلاتے رہے۔ مگر صاحب صدر نے توجہ نہ کی۔

۱۴ر اکتوبر کو وزیر اعظم صاحب ریاست نے ساہوکاروں اور کاشت کاروں کے نمائندوں کو اپنے دربارِ دولت پر طلب فرمایا۔ ساہوکاروں کی شکایات نہایت تحمل سے سنی گئیں۔ اور کاشت کاروں کو جواب کی مہلت سے

محروم رکھتے ہوئے ذیل کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ کہ جن دیہات میں جتھے بندی کے طریق پر کاشت اراضی سے انکار ہو گا۔ ایسی اراضی کا معاملہ ان کے دیہات کے باشندوں پر باچھ ہو کر وصول کیا جائے گا۔ یہی حکم میں نے کئی دیہات میں قلمی لکھا ہوا دیواروں پر چسپاں دیکھا۔ اس خلاف قانون حکم کو دیکھ کر میری حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کسی کاشت کار کو کس ضابطہ و قانون کے ماتحت کسی زمین کی کاشت کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر وہ کاشت نہ کرے تو ادائیگی مالیہ اراضی کا کاشتکار کیسے ذمہ دار ہو سکتا ہے؟ وزیر اعظم صاحب کے انکے حکم سے تحصیل بھولتھ کے باشندوں میں بے چینی و بددلی کی ایک لہر پیدا ہو گئی ہے۔ حکام کا ایک ایسا متشددانہ رویہ امن عامہ میں ہمیشہ خلل کا باعث ہوا ہے۔ علاوہ ازیں پولیس کو غالباً ریاست میں غیر محدود اختیارات آج کل دے دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شاخ تراشی کے جھگڑوں پر بھی پولیس افسر بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور غریب کاشت کاروں کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کے تمام وسائل عمل میں لا رہے ہیں۔

اس تحصیل کے کاشت کار و مزدور اس وقت زندگی کے نازک مراحل میں سے گزر رہے ہیں۔ تحصیل کا شمالی علاقہ جو بالکل مسلمان کاشت کاروں کی آبادی ہے۔ سول و پولیس افسروں کی سختیوں کا تختہ مشق بنا ہوا ہے۔ اور حکام ریاست نے ان کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہجرت کر جانے پر آمادہ ہیں۔ ایسے نازک وقت میں مہاراجہ صاحب کو حکام کی من مانی کارروائیوں کا سدباب کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیئے کہ اس سے وفادار اور پرامن رعایا کو مشتعل ہو کر مظاہروں کا موقع ہاتھ آئے۔ اور ساتھ ہی غریب خاندانوں کاشت کاروں اور پیشہ وروں کے جائز مطالبات کو تسلیم کرنے میں والئی کپورتھلہ کو تامل نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر مہاراجہ بہادر نے صورت حالات کی اصلاح کی طرف جلد توجہ نہ دی اور نااہل افسروں پر ہی تمام معاملہ کو چھوڑ رکھا تو نتائج ایسے مرتب ہونے کا امکان ہے۔ جو ریاست اور باشندگان ریاست کے لیے نقصان عظیم کا باعث ہوں گے۔"

جنرل سیکرٹری مجلس احرار اسلام دسوہہ ضلع ہوشیار پور

روزنامہ "زمیندار"

"تحریک کی رہنمائی"

چودھری عبدالعزیز خان آف بیگووال احرار کے نائب صدر تھے۔ یہ تحریک ان کی رہنمائی میں پر امن طور پر شروع ہو گئی۔ اور ہجرت کے احتمالات جاتے رہے۔ وہی ریاست میں زمیندار لیگ کے جنم داتا ہیں۔ زمیندار لیگیں عام طور پر امیر طبقے کی اپج ہوتی ہیں چھوٹے زمینداروں کا نام لے کر بڑے زمیندار حکومتوں سے اپنے لیے مفاد حاصل کرتے ہیں۔ لیکن یہ جماعتی ذہن کا اثر تھا کہ سنٹرل زمیندارہ لیگ کی عرضداشتوں کا رخ ہر قسم کے سرمایہ داروں کے خلاف تھا۔ چودھری عبدالعزیز خاں نے "انصاف اور روٹی کی پکار" کے عنوان سے جو عرضداشت بحیثیت سیکرٹری جنرل زمیندارہ لیگ مہاراجہ صاحب کی خدمت میں بھیجی وہ قابل غور ہے۔ اگرچہ ابھی عرضداشت کے مطالبات انقلاب پیدا کرنے والے نہیں۔ لیکن وہ فرض جو یہ تحریر پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وہ انقلابی ہے۔ وہ ہر قسم کے سرمایہ داروں سے غریب اور کسان کی جان چھڑانے کو نصب العین قرار دیتی ہے۔ چھوٹے طبقے کی محنت کے ثمرہ کو سرمایہ داروں اور امتیازی خاندانوں کی پرورش پر صرف کرنے کے فعل پر صدائے ناراضگی بلند کرتی ہے۔

پنجاب کے زمینداروں میں یہ پہلی لیگ ہے جس نے طبقاتی کشمکش کو حوصلہ مندی سے اپنے سامنے رکھا۔ اور انقلابی نصب العین کے لیے بسم اللہ کہہ کر کام شروع کیا۔ انصاف اور روٹی کی پکار کے آخری حصوں کو احرار مطالعہ کرے۔ اور یہ پیش نظر رکھے۔ کہ ابتدا ہی سے مجلس احرار کے ذمہ دار احرار لیڈروں کے سامنے یہی مقصد حیات تھا۔ کہ مزدور اور کسان کو خاص حقوق اور مراعات رکھنے والے لوگوں کے خلاف منظم کیا جائے تاکہ ان امتیازی خاندانوں اور مالداروں کو غریب کاشت کاروں اور مزدوروں کی محنت کا ثمرہ اڑا لیجانے سے روکا جائے۔ اور اسلام اور اشتراکیت کا لٹریچر ان ہی چند فقروں کی تفصیل ہے۔ بہر حال وہ پوری عرضداشت درج ذیل ہے:۔

"انصاف اور روٹی کی پکار"

"حضور والا!

عقیدت و فرمانبرداری کے جذبات کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں کہ حضور والا کی خدمت میں مفصلہ ذیل

چند سطور گزارش کروں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ حضور والا مہربانی سے اس معاملہ پر غور فرماتے ہوئے ازراہ نوازش اپنی غریب زمیندار رعایا کی حفاظت کی خاطر فوری احکام صادر فرمائیں گے۔ ریاست ہذا میں قانونِ انتقال اراضیات پنجاب کے نفاذ و نیز تخفیف ابواب یعنی رقم ملبہ و بیگار کا مطالبہ دیرینہ ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے جس نے زمینداران کے درمیان گزشتہ پندرہ [15] سال کے عرصہ کے اندر طاقت حاصل کرنے کے بعد ایک عام تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ زمینداران نے اپنی حالت کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد آج سے بہت عرصہ پہلے حضورِ والا کی خدمت میں اپنے مطالبات جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے پیش کیے تھے ۔

ا۔ یہ کہ محصولِ مالیات کا معیار اُسی پیمانے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ جس کا عملدرآمد ملحقہ اضلاع برطانوی ہند میں ہے ۔

۲۔ ابواب مالیات مثلاً بیگار ملبہ جو داخل خزانہ سرکار ہوتا ہے ترک کیا جا کر یکدم بند فرمایا جائے۔

۳۔ تحفظِ حقوقِ زمینداران کے پیشِ نظر قانون انتقال اراضیات پنجاب کے اصول پر ریاست میں بھی قانون نافذ فرمایا جائے۔

۴۔ اسمبلی ریاست آئندہ صحیح طور پر ایک نمائندہ مجلس ہونی چاہیئے۔ جسے وضع قوانین اور اسی قسم کے دوسرے اختیارات حاصل ہوں جن سے برطانوی ہندوستان کی ایسی مجالس بہرہ اندوز ہو کر استفادہ کر رہی ہیں ۔

۵۔ بلا ضرورت اسامیوں بلکہ محکمہ جات کو تخفیف میں لایا جا کر بچت شدہ رقم دیہاتی اصلاح پر صرف کی جائے۔

چونکہ قانونِ انتقالِ اراضیات کا مسئلہ زمینداروں کے نزدیک نہایت اہم تھا۔ اس واسطے اس سوال کو سب سے پہلے اٹھایا گیا۔ ابتداءً منظور فرمایا گیا کہ طرفین یعنی زمینداران و ساہوکاران اپنے اپنے مقدمات جداگانہ طور پر بسری حضور ٹکا راجہ صاحب و جناب وزیر اعظم صاحب کے روبرو بیک وقت پیش کریں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ریاست نے ایک بل مرتب کر کے عوام کی رائے حاصل کرنے کے لیے شائع کر دیا۔ ساہوکاران نے شروع ہی سے اس کے متعلق مباحثہ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ اس سب کمیٹی کے جلسوں کا بھی مقاطعہ کیا۔ جو اس مسودہ قانون کی تفصیلات پر غور کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ مگر زمینداروں نے حکومت کے ساتھ یہاں تک تعاون کیا۔ کہ مسودہ مذکور کی بعض دفعات کے خلاف اپنے اعتراضات پیش کر دیئے۔ اُمید کی جاتی تھی کہ نہایت

قلیل عرصہ کے اندر زمینداران ریاست کی حفاظت کے لیے کوئی قانون ضرور نافذ ہو جائے گا۔ حضور والا کی یورپ کو روانگی کا وقت قریب آگیا تھا۔ چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں زمینداران ریاست نے بسرپرستی مرکزی زمیندارہ لیگ کپورتھلہ میں برمحل اکٹھے ہو کر ۱۶ پھاگن سمت ۱۹۸۹ بکرمی حضور والا کی خدمت میں اپنی مشکلات کے رفع واد کے لیے گزارش کی۔ حضور والا نے ان کے وفد کو حاضر ہونے کا شرف بخشا اور ان کی معروضات سماعت فرمانے کے بعد بڑی مہربانی سے اس مجمع کثیر کے درمیان تشریف لے جا کر ایک اعلان عام فرمایا جس کا منشا یہ تھا کہ حکومت ریاست کی نظر میں قانون انتقال اراضیات پنجاب کی قسم کا کوئی قانون ریاست ہذا میں نافذ کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ اعلان بصورت گزٹ اشاعت پذیر ہو گیا جس سے حالات ایک حد تک سلجھ گئے۔ گر چند ماہ بعد یہ اعلان منسوخ کیا جا کر اُس کی جگہ ۲۸ ہاڑ سمت ۱۹۹۰ بکرمی کو ایک اور یادداشت جاری ہوئی۔ یہ یادداشت نہ تو حضور والا کے اعلان کی حامل تھی اور نہ زمینداروں کے مطالبات سے مطابقت رکھتی تھی۔ گو زمیندار اس کے اجرا سے کمال مایوس ہوئے۔ لیکن اُصولاً پُر امن رہتے ہوئے حضور کی یورپ سے تشریف آوری پر مزید پُر امن تحریک کا فیصلہ کیا۔

بتاریخ ۵ مگھر سمت ۱۹۹۰ بکرمی کو مرکزی زمیندارہ لیگ کے ایک وفد نے جناب وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر باضابطہ عرض کی کہ یادداشت مجریہ ۲۸ ہاڑ سمت ۱۹۹۰ غریب زمینداروں کے حق میں ہونے کی بجائے زیادہ تر ساہوکاران کے مطالبات کی حفاظت کرتی ہے۔ اور اس یادداشت جدید میں حسب ذیل ترامیم و ایزادی تجویز کی:

ا: زمینداروں کی اراضیات کا دوامی انتقال اجرائے ڈگریات میں قطعاً ممنوع قرار دیا جائے۔

ب: اجرائے ڈگریات میں جو زمین ڈگری داروں کو منتقل کی جائے وہ مقررہ میعاد کے لیے ہو جو کسی حالت میں بھی بیس [20] سال سے زائد نہ ہو۔ اور اس میعاد کے ختم ہونے کے بعد اراضی منتقلہ مالک اراضی کے نام ہر قسم کے بار سے آزاد دوبارہ منتقل ہو جائے۔

ج: زمینداروں کو اپنے درمیان اراضیات کے انتقال کی آزادی حاصل ہو۔

د: تمام ایسی بے ضابطہ کارروائیاں جو سابقہ قوانین مرتبہ ۸ ماگھ سمت ۱۹۳۳ بکرمی کے خلاف عمل میں آئی ہیں

کالعدم تصور فرمائی جا کر تکمیل قانون کی غرض وغائت کے لیے منسوخ ومنسترد فرمائی جائیں۔ دوبارہ ۱۵ ہاڑ مگھر سمت ۱۹۹۰ کو مرکزی زمیندارہ لیگ کا دوسرا وفد جناب وزیر اعظم صاحب کے پیش ہوا اور سابقہ معروضات کا اعادہ کیا۔ صاحب موصوف نے زمینداروں کو ہدایت کی کہ انہیں صبر و تحمل کے ساتھ ہنگامہ آرائی کے بغیر اس وقت تک انتظار کرنا چاہیئے۔ جب تک کہ ہدایت مجریہ ۲۸ ہاڑ سمت ۱۹۹۰ کے عملی نتائج سامنے نہ آجائیں۔ زمیندار اس جواب سے اس قدر دل برداشتہ ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی حالت کو خوف سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کے لیے بحالات موجودہ زیادہ عرصے تک انتظار کرنا محال ہے۔

زمینداروں کی خصوصاً چھوٹے زمینداروں کی حالتِ زار اقتصادی نکتۂ خیال سے بڑی قابلِ رحم ہے۔ زمینداروں کو برطانوی اضلاع کی مروجہ شرح بالبات سے بڑھ کر مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس رقم میں مزید اضافہ جریب کے چھوٹے ہونے کے باعث ہو جاتا ہے۔ مزید براں ابواب کا نا ئدبار ومالیہ و بیگار، ناقابلِ برداشت ہے۔

حضورِ والا! یہ امر واضح ہے کہ زمینداران ان گراں بار ذمہ داریوں اور ادائیگی مالیہ ریاست کے بوجھ تلے بے طرح دب گئے ہیں۔ یہ زمینداران کی بد قسمتی ہے۔ کہ ان کے مقدمہ کی طرف حضور والا کی نظرِ عنایت منعطف نہیں ہو سکتی۔ تا کہ یہ معاملہ جو ان کے لیے حد سے زیادہ اہم اور وقیع ہے۔ حل ہو سکتا۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ حضور والا ان تمام حالات سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ لیکن زمینداروں کے مصائب اور ان کے ساتھ حضور والا کی دوسری غریب رعایا کی تکلیفات اس لیے بھی حد سے زیادہ تجاوز کر گئی ہیں کہ ریاست کی عدالتوں کا رویہ نہایت غیر منصفانہ ہے۔ غریبوں کو خواہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان عدالتوں سے انصاف کی قطعاً توقع نہیں۔ یہ عدالتیں جو حضور والا نے انصاف کے لیے قائم کی ہوئی ہیں۔ ان عدالتوں کی تمام تر ہمدردی سرمایہ داروں کے لیے وقف ہے۔ برعکس اس کے غریب زمینداران و کاشت کار کے حقوق عدالتی کارروائیوں میں نہایت بے دردی سے پامال کیے جاتے ہیں۔

ایک بیدار مغز حکمران ہوتے ہوئے حضور والا سے قرار واقعی توقع تھی۔ کہ چھوٹے زمینداران کاشت کاران اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے سامان مہیا کرنے کی طرف کامل توجہ ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مالداروں پر نوازشات کی بارش ہو رہی ہے۔ اور غریب کاشت کاران و مزدوران کی محنتوں کا ثمرہ بڑی بے رحمی سے محض سرمایہ داران اور بعض

امتیازی خاندانوں کی پرورش پر صرف کیا جاتا ہے۔

حضور والا! میں بلا کم و کاست یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا مقصد وحید چھوٹے زمینداران و مزدور پیشہ کسانوں کی سیاسی اور مالی حالت کی اصلاح و ارتفاع ہے۔ ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ہم تہ دل سے خواہاں ہیں کہ غریب زمینداران کے مقدمے کو جامع طور پر گزارش کروں۔ نیز ہم اس امر کے متمنی ہیں کہ حضور کی توجہ زمینداران کی حالت زار کی طرف مبذول کرائیں۔ میں بلا تکلف یہ ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ بڑی کوشش سے وہ ایسا رویہ اختیار کرنے سے باز رہے ہیں جس کا ظہور ہرگز مستحسن متصور نہیں ہو گا۔ تاوقتیکہ ان کی شکایات کو رفع کرنے اور ان کے پورا کرنے کے لیے فوری اقدام اور موثر انتظام نہ کیا گیا۔ میری نظر میں حالات پر قابو پانا حد درجہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا میں التجا کرتا ہوں کہ متذکرہ صدر معاملات پر کامل غور فرمایا جائے۔

"چودھری عبدالعزیز آنریری سیکرٹری
سنٹرل زمیندارہ لیگ کپورتھلہ سٹیٹ"

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ چودھری عبدالعزیز خاں خود ریاست کے امتیازی خاندانوں میں سے ایک کے فرد ہیں۔ ہمیں افراد کے تعلقات سے بحث نہیں۔ بلکہ اُن کے ذہن اور دل و دماغ سے بحث ہے۔ اگر وہ انقلابی ہے۔ تو ہم بخوشی عوام کے لیے ان کی خدمات قبول کریں گے خواہ وہ اعلیٰ طبقہ سے بھی متعلق کیوں نہ ہو۔ اگر کوئی غریب خاندان کا فرد سرمایہ دارانہ ذہن اور قوم میں امتیازی شان برقرار رکھنے والی طبیعت رکھتا ہے۔ وہ احرار کی مشین کا پرزہ نہیں ہو سکتا۔ خود معترض کی طبیعت گواہی دے گی۔ کہ بعض اعلیٰ طبقہ کے افراد بڑے انصاف پسند اور ہمدرد طبیعت رکھتے ہیں۔ بعض غریب شاہانہ مزاج اور امیرانہ تمکنت رکھتے ہیں ہمیں بطور احرار ایسے غریبوں کو جماعت سے خارج کرنا ہے۔ اور ایسے امیروں کو عوام کی خدمت کا موقعہ دینے میں اعتراض نہیں جن کے دل میں مساوات انسانی کی تڑپ ہو۔ امرار کی ایک کمزوری کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ بوجہ ماحول اور پرورش کے ان میں سے اکثر انقلابی فوج کے کمزور سپاہی ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی تو وہ کچھ دن

کام کرنے کے بعد اداس ہو جاتے ہیں۔ اور جلدی تھک کر کشتی کو منجدھار میں چھوڑ جاتے ہیں پس انقلابی جماعتوں میں آنے والے امراء کے نونہالان کے لیے صحیح تربیت درکار ہے۔ اسی طرح امیر بننے اور موقع سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اونر رسید کر دینے والے غریبوں کی بھی احتیاط ضروری ہے۔ ہر امیر کے آباؤ اجداد کبھی غریب تھے۔ جو موقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سردار اور امیر بن بیٹھے۔ مساوات قائم کرنے کے بجائے انہوں نے اپنے لیے سوسائٹی میں امتیاز پیدا کیا۔ احرار کے لیڈروں کا فرض ہے کہ دعاوی کے علاوہ اپنے دل و دماغ کا امتحان لیتے رہیں۔ مبادا ان میں سرمایہ داری کے جراثیم پیدا ہو گئے ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ ہر ممبر پر نگرانی رکھنی چاہیئے۔ کہ وہ مساواتِ انسانی کا قدر دان ہے۔ یا نہیں۔ خدمت خلق کے شکرانہ جذبے کے سوا الیسی ہوس جاہ تو نہیں جس کا نتیجہ اخوت و مساوات کے خلاف ہو؟

غرض ہمیں زید و بکر کے خاندان کو نہیں دیکھنا بلکہ افراد کے خصائص کو دیکھنا ہے۔ ہمیں چودھری عبد العزیز یا افضل حق کے خاندانی حالات سے بحث نہیں۔ ہمیں اس امر سے بحث ہے کہ ان کا وجود اعلیٰ طبقوں کے امتیاز کو مٹانے انسانوں کو مجلسی اور اقتصادی طور پر برابر بنانے میں معاون ہے یا نہیں ہیں یہ مانتا ہوں کہ ہر دور کے نیکوکاروں نے امرا کی صحبت سے الگ رہنے پر زور دیا۔ ہم بھی سب کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے بھی ایسے لوگوں سے دل سخت کر لیا ہے۔ جو سرمایہ کو شخصی آرام اور ترقی کا ذریعہ بنائے بیٹھے ہیں۔ ہمیں صرف ان امیروں سے سروکار ہے جن کی فطرتِ سلیم سرمایہ داری کا تخت الٹ دینے کے لیے بے تاب ہے تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہیں جنہوں نے عوام سے ہم رنگ رہنے کے لیے تخت چھوڑ کر کپڑوں میں پیوند لگائے۔ ایسا ہوتا کم ہے مگر ہوا ضرور ہے تاہم احرار ہزار احتیاط سے اور لاکھ دفعہ پرکھ کر اونچے طبقے کے افراد کو شامل کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف سچ یہ بھی ہے کہ امراء کے طبقے کو ہماری جماعت سے قدرتی نفرت بھی ہے۔ خدا ان کی اس نفرت کو اور زیادہ کرے۔ تاکہ ہم یک سو ہو کر غریبوں کی خدمت کر سکیں۔ اور ان کے نظام کو مضبوط کر کے عوام کی حکومت قائم کر سکیں۔

کشمیر ایجی ٹیشن کے سارے قیدی جیلوں سے باہر آ چکے تھے۔ چونکہ یہ تحریک احرار کے ذہن اور طبیعت کے لیے موزوں تھی۔ اس لیے سب احرار کو دلچسپی ہو گئی۔ طبقاتی جنگ احرار کے مزاج کے عین

مطابق ہے۔ اس سے غرباء میں جان آتی ہے۔ اور ان میں عزت نفس کا احساس بڑھتا ہے۔ غریب جب ذلت قبول کر کے خاموش ہو جائے تو یہ انسانیت کی موت ہے۔

احرار کے معنٰی شریف اور آزاد کے ہیں۔ اس نام کی مناسبت سے آزادی اور شرافت کی تحریک کے ساتھ ہمارا دل ہوتا ہے۔ اقتصادی مساوات کا قیام اور عوام کی حکومت کی جدوجہد کتنی خوش قسمتی ہے۔ انسانوں میں اقتصادی مساوات انسانی دکھ درد کا کیسا ہمہ گیر علاج ہے۔ اس لیے تو قرآن حکیم کامل اقتصادی نظام کا قائل ہے۔ ہر احرار کو خدائے بزرگ کا یہ حکم ازبر یاد رکھنا چاہیئے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝
(سورۃ النحل)

اللہ نے رزق میں بعض کو بعض پر فضیلت دی تو کیوں ایسا نہیں کرتے کہ جن کو زیادہ روزی دی گئی ہے۔ وہ اپنی روزی اپنے زیر دستوں کو لوٹا دیں۔ حالانکہ سب اس میں برابر کے حق دار ہیں۔ اور کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں سے منکر ہو رہے ہیں؟

غرض ہم نے آتے ہی اور میدان نیا پایا۔ ہر چند آدمی تھکا ہو گلزار میں آجائے۔ کوفت دور ہو جاتی ہے قید فرنگ کی کوفت ضرور تھی۔ گرگپور تھلہ کا میدان گلزار تھا۔ وہاں موج ہوا ہمارے مزاجوں کے مطابق تھی۔ کیوں کہ وہاں اقتصادی مشکلات کے حل کے لیے پکار تھی۔ یہی پکار احرار کو سرمست کرتی ہے۔ مولانا مظہر علی کا نام ریاست کشمیر کے سلسلہ میں نمایاں ہو چکا تھا۔ کپور تھلہ کے ریاستی باشندوں کے بلاوے پر مولانا مظہر علی احرار کانفرنس منعقدہ کپورتھلہ کے صدر قرار پائے تاکہ کام اور عوام پر اس اقتصادی تحریک کی گہرائی اور قوت کا اثر ہو۔ اور معلوم ہو کہ بدونِ انصاف کیے مقامی طور پر دبانے سے یہ تحریک نہ دبے گی جس تحصیل میں تحریک کی ابتدا ہوئی۔ اور جہاں جہاں یہ پھیلی وہ زیادہ تر اسلامی آبادی تھی۔ سکھ زمیندار ضرور شامل ہو جاتے۔ گر پنتھک کمیٹی جس کا سکھوں پر اثر ہے۔ وہ اس ریاست کو غلط طور سے سکھ ریاست سمجھ کر رئیس کے خلاف یارو ہو سکے خلاف کچھ کرنا نہ چاہتی تھی۔ وہ جانتی ہے کہ بنانا مشکل اور بگاڑنا آسان ہے۔ بے علمی اور سستی پھولوں کی زمین زرک

سیج ہے۔ اس میں پڑ کر کوئی مشکل سے اٹھتا ہے۔ زمینداروں کا بے عملی کو خیرباد کہنا عام طور پر دشوار ہے۔ اگر انہیں یہ بھی سمجھایا جائے۔ کہ عمل تمہارے مفاد کے خلاف ہے۔ تو یہ آواز اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو جاتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ خالص زمیندارہ تحریک سکھ کاشت کاروں کی پوری امداد سے محروم رہی۔ اس میں شبہ نہیں کہ خود ریاست نے بھی مسلمان سکھ پیدا کرنے کی پوری کوشش کیوں نہ کرتی کہ یہ بات ریاست کے مفاد کے عین مطابق تھی۔ الغرض یہ تحریک مسلمان زمینداروں کی تحریک بن کر رہ گئی۔

مسلمان عجیب گئی گزری قوم سمجھی گئی ہے۔ ان کو کچلنا اور دبائے رکھنا کتنا آسان سمجھا جاتا ہے۔ حقہ پی کر قوائے عمل کو کمزور کر لینے والی۔ بغیر بیت المال کے فضول خرچی کر کے ہر قسم کے ذرائع سے محروم ہو کر ترقی کے سارے دروازے اپنے اوپر بند کر لینے والی قوم تشدد کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی جس کا نہ کچھ گھر میں ہو اور نہ کوئی قومی فنڈ ہو۔ قوم محض رمضان شریف کی برکتوں کے سہارے زندگی کے کامیاب سفر کو کب تک جاری رکھ سکتی ہے؟ جانوروں کی طرح بے شعور محنت کر کے جینا اور کیڑوں کی طرح مرنا ہماری بے عمل زندگی کا عنوان ہے۔ باسی کڑھی کے اُبال کی طرح ہم اٹھتے ہیں اور پیشاب کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ مسلمانوں کو سرمایہ داروں کی طرح موت سے ڈر لگتا ہے نہیں بلکہ زندگی کی نمائش کی ان کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں۔ وہ زندگی کی قدر و قیمت ہی نہیں جانتے۔ افلاس کے ساتھ اخلاص اور للّہیت پر شخصی شعور نہیں۔ قومی سرمایہ ہو تو قوم کی ترقی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ورنہ دنیائے اسلام کی طرح چند شیوخ اور رؤسا کی غلامی میں آ جاتے ہیں۔

الغرض ریاست جانتی تھی۔ کہ تنہا مسلمانوں کو مار لینا کیا بڑی بات ہے۔ اب کسی عذر معقول کی تلاش تھی۔ جب اس کی تلاش میں ناکامی ہو تو عذر نامعقول پر ہاتھ مار دینا ارباب اقتدار کا معمولی مشغلہ ہے۔ ؎

توانائوں کے بس میں ہے سراپائے حقارت سے
ہزاروں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا

بے پناہ مظالم سے جمہور کے دلوں میں لرزہ طاری کر کے دہشت طاری کر کے ظلم ناروا کو برداشت کرنے کے لیے لوگوں کو مجبور کرنا، شہنشاہیت کے معمولی ہتھکنڈے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ زخم کہاں لگایا جائے شرط یہ ہے کہ جہاں زخم لگے۔ گھاؤ گہرا ہو۔ تا کہ عبرت کی آنکھ اُسے دیکھ کر سبق حاصل کر لے۔ اگرچہ اقتصادی تحریک

کا مرکز تحصیل بھولتھ تھا۔ گر سلطان پور لودھی کے بُرے دن جو آئے۔ تو وہاں "تعزیہ اور بڑ" کا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ تعزیہ اور بڑ کے درختوں کو ہندوستان کی عورتوں کو بیوہ کرنے اور بچوں کو یتیم بنانے میں بڑا دخل ہے۔ جہاں اس پوتر درخت کی شاخ "تعزیہ شریف" سے چھوٹی بس قیامت ہو گئی۔ "یا علی" اور "جے جے مہابیر" کے نعرے بلند ہونے لگے۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے۔ گویا غزنوی نے سومنات پر حملہ کر دیا ہے۔ اور کفر و اسلام باہم گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ آن کی آن میں لاشے خاک میں تڑپتے نظر آتے ہیں۔ خون کے نالے بہ نکلتے ہیں۔ وحشت کے ایسے نظارے قومیت متحدہ کے دعوے پر بے لاگ تبصرہ بن جاتے ہیں۔ پوری ایک صدی سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں سول وار جاری ہے جس کے ختم ہونے کی ابھی کوئی امید نہیں غرضمند ہوا دیتے ہیں۔ سلگتی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔

ہاں سلطان پور کے مسلمانوں کا ستارہ گردش میں آیا۔ تعزیہ کے راستے پر ایک بڑ کا درخت تھا۔ اس سال اس بڑ کی مخصوص شاخیں بڑھ کر تعزیے کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔ زبان حال سے کہتی تھیں کہ ادھر سے گزرو تو نوجوانوں کا خون بھینٹ چڑھا کر جاؤ۔ اس بڑ کی ٹہنیاں بڑھانے کے لیے سکھوں نے کہا کہ "بے بے نانکی" کے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے۔ یوں اس بڑ کو گرو نانک جی سے نسبت دی گئی۔ اب درحقیقت "امام حسین" اور "بابا نانک" کا سوال بن گیا۔ حکام ریاست اس معاملہ میں پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ اور سمجھوتہ ہوتا ہوتا رہ جاتا تھا۔ مہندی اور علم بطور احتجاج اٹھانے سے انکار کر دیا گیا۔ تعزیہ داروں نے جو خیر سے سب "سنی مسلمان" تھے۔ ٹولیوں میں بڑ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ پولیس افسر اور علاقہ مجسٹریٹ موقعہ پر موجود تھے۔ انہوں نے گرفتاریاں شروع کر دیں۔ دو دن میں ساڑھے چار صد (۴۵۰) مسلمان گرفتار ہوئے۔ چودھری عبدالعزیز کا ایک قدم سلطان پور اور ایک قدم کپور تھلہ میں تھا۔ کہ کسی طرح سلطان پور کے مسلمانوں کے سر سے آئی بلا ٹل جائے۔ گر حکام کی بے جا ضد نے کوئی صورت نہ پیدا ہونے دی۔ میں چودھری عبدالعزیز خاں کے بیان کا وہ حصہ جو سلطان پور فائرنگ کے متعلق انہوں نے ڈسٹرکٹ ایسوسی ایشن جالندھر کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے دیا پیش کرتا ہوں۔

"بیان چودھری عبدالعزیز بگووالیہ"

"دوپہر سے قبل وفد سلطان پور پہنچا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پندرہ (۱۵) اشخاص کی ایک جماعت تحصیل دار صاحب کے دردولت یا کچہری میں حاضر ہو کر دس بجے یہ مطالبہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ کہ تعزیہ کا راستہ صاف کرا دیا جائے گر ۲ بجے تک معززین شہر کے اصرار پر یہ جماعت رک گئی۔ میں اس جماعت کے پاس گیا۔ ان کے پاس ایک بورڈ تھا جس پر بدیں مضمون عبارت تحریر تھی کہ "اسٹیٹ ریگولیشن ۱۹۱۵ء کے مطابق تحصیل دار صاحب کا فرض ہے کہ تعزیہ کے لیے راستہ صاف کرائیں۔"

ان کو ملنے کے بعد میں چودھری فتح محمد کے مکان پر گیا جہاں مجھے معلوم ہوا کہ اودھم سنگھ اس بات کے لیے تیار ہے کہ اگر وزیر اعظم صاحب یا معززین میں سے کوئی اور اس سے کہیں تو وہ اپنا اعتراض واپس لے لے گا۔ جو دوست وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے اودھم سنگھ کے پاس جانے کے لیے مخاطب کیا۔ میں منشی فیض بخش کے مکان پر اودھم سنگھ سے ملا۔ اور اس سے درخواست کی کہ تعزیہ کے راستہ کی رکاوٹ کا باعث نہ بنو۔ جس کے جواب میں اس نے کہا کہ اگر صرف اس سال تعزیہ والے ہی اس راستہ سے تعزیہ نہ گذاریں تو کون سا حرج ہو جائیگا میں تو بعض وجوہات کی بنا پر مجبور ہوں۔ وہیں تک گفتگو کا سلسلہ پہنچا تھا کہ وہ سکھ اودھم سنگھ کو بلا کر لے گئے۔

میں پھر احباب کے مشورے سے اسٹیٹ ریسٹ ہاؤس کو گیا۔ جہاں وزیر اعظم صاحب، انسپکٹر جنرل پولیس اور دیگر افسران موجود تھے۔ جس کی غرض یہ تھی۔ کہ افسران متعلقہ اور وزیر اعظم صاحب کو صورت حالات سے بخوبی مطلع کر کے تعزیہ کے راستہ کی رکاوٹ کو دور کیے جانے کے متعلق کہا جائے۔ چونکہ وزیر اعظم صاحب معززین سے گفتگو میں مشغول تھے۔ اس لیے میں منتظر رہا۔ ساڑھے بارہ بجے کے بعد مجھے اطلاع ملی۔ کہ راستہ طلب کرنے والی جماعت پر لاٹھی چارج کیا گیا ہے۔ اس اطلاع پر میں مع چودھری فضل محمد وکیل جائے وقوع کی طرف روانہ ہوئے۔ میجر کوٹھ والا اور فوجی افسر بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس وقت وہاں صرف پندرہ (۱۵) آدمی اس میں موجود تھے۔ جو عبداللہ علم والے کے مکان سے بازار کو آتی ہے۔ اور کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ میجر صاحب نے وہاں آتے ہی اس کی گلی کے دو طرفہ چھتوں پر چار چار سپاہی یعنی کہ آٹھ رائفلیں دے کر چڑھا دیئے۔ جو فائر پوزیشن لے کر

بیٹھ گئے۔ خود میجر صاحب نے ان پندرہ اشخاص کو مخاطب کر کے کہا کہ "یا تو ہٹ جاؤ ورنہ فائر کرا دوں گا۔" وہ پندرہ آدمیوں کی جماعت بلا کسی جواب کے بیٹھ گئی۔ اس وقت میں نے ایک سکھ سپاہی کو جس کا نام شاید بڈھا سنگھ تھا۔ بازار میں لیٹے ہوئے دیکھا جس کے چہرے پر چند خراشیں تھیں میں اس گلی میں سے ہوتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں دوسرے لوگ متعلقہ تعزیہ داری موجود تھے۔ میں نے ان میں سے چھبیس (۲۶) اشخاص کو مجروح پایا۔ دو اشخاص کے ضربات شدید معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے تعزیہ داروں کو اپنی مجلس قائم اور مرثیہ خوانی جاری رکھنے کے لیے کہا اور راستہ طلب جماعت کو مزید توقف کی ہدایت کی۔ اس وقت انسپکٹر جنرل صاحب پولیس نے اس مقام پر مجھ سے دریافت کیا۔ کہ آپ لوگ کسی نتیجہ پر پہنچے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ تعزیہ والے اپنے قدیمی راستہ کو منظور نہیں کرتے۔ میجر صاحب نے کہا کہ ہم بڑ کی شاخیں کاٹنے پر تیار نہیں۔ میں نے کہا گو یہ بجا ہے۔ اور بڑ کوئی متبرک درخت نہیں۔ تاہم اگر آپ زمین کھود کر تعزیہ گزارنے کی اجازت دے دیں۔ تو میں تعزیہ داروں کو رضامند کر لوں گا میجر صاحب نے کہا کہ دس فٹ زمین کیسے کھودی جا سکتی ہے؟ میں نے کہا کہ کھدائی اور پھر اس کو ہموار کرنے کا انتظام ہم خود کر لیں گے۔ آپ صرف اجازت دے دیں۔ مگر میجر صاحب نے منظور نہ کیا۔

تقریباً ۲ بجے میں پھر وزیر اعظم کی طرف گیا اور توجہ دلائی۔ کہ جو بحث اس وقت آپ کے سامنے ہندو، سکھ اور مسلمان کر رہے ہیں۔ بے نتیجہ ہے۔ کیوں کہ راستہ کے قضیہ کا حق تعزیہ داروں کی کمیٹی کو ہی کو پہنچتا ہے۔ انہیں بلا کر ان سے بات چیت کی جائے۔ میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے تحصیل دار صاحب کو تعزیہ داروں کمیٹی کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ چھ (۶) اشخاص کا ایک وفد وزیر اعظم صاحب کے پاس گیا۔ مگر اس کے کوٹھی پہنچنے سے چند منٹ قبل وزیر اعظم صاحب کپورتھلہ روانہ ہو چکے تھے۔ تعزیہ داران مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے۔ رات کے ۹ بجے کپتان عزیز احمد کپورتھلہ سے سلطان پور آیا اور تعزیہ داروں سے میری موجودگی میں کہا کہ وزیر اعظم صاحب کسی غلط فہمی کی بنا پر سلطان پور سے چلے گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صبح آپ لوگ کپورتھلہ پہنچ جائیں اور ان سے گفتگو ہو جائے۔ تعزیہ دار رضامند ہو گئے۔

۷ محرم کو صبح ۹ بجے انہی چھ تعزیہ داروں کے وفد کو میں اپنے ہمراہ لے کر کپورتھلہ پہنچا۔ وفد اور وزیر اعظم کے مابین راستہ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ وزیر اعظم اس بات پر زور دیتے تھے۔ کہ اس سال وہ راستہ

چھوڑ دو۔ آئندہ ہر امکانی کوشش اس راستہ کو صاف کرنے کے متعلق کی جائے گی۔ وفد کا خیال تھا کہ یہ محض دفع الوقتی ہے۔ اور اگلے سال کہا جائے گا۔ کہ بس تمہارا وہی راستہ ہے جس سے پچھلے سال گذر چکے ہو۔ ممبران وفد کا اصرار تھا۔ کہ بڑ کا درخت کاٹا جائے یا نہ کاٹا جائے ہمیں وہاں سے زمین کھود کر گذر جانے کی اجازت دے دیجیے۔ اور ساتھ ہی یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اسی بڑ کی شاخیں ایک مکان کی تعمیر کے لیے اگر کاٹی جا سکتی ہیں۔ تو تعزیہ کے گذرنے کے لیے کیوں نہیں کاٹی جا سکتیں۔ وزیر اعظم صاحب بڑ کی شاخوں کو کٹانے کے لیے کسی حالت میں بھی رضامند نہ تھے۔ میں نے مسٹر کوٹھاوالے کی موجودگی میں یہ تجویز پیش کی۔ کہ دو تحریریں لکھ لی جائیں۔ ایک یہ کہ اگر تعزیہ دار اس سال متنازعہ راستے سے نہ گذریں۔ تو آئندہ ہمیشہ کے لیے محلہ کے کسی فرد کو کوئی اعتراض کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ اور راستہ کی رکاوٹ دور کرنے میں کوئی عذر پیش نہ کیا جائے گا۔ اگر اس تحریر پر معترضین دستخط کر دیں۔ اور حکومت اس معاہدہ کی تکمیل کی کامل ذمہ داری لے لے تو میں تعزیہ داروں کو اس بات کے منظور کرنے کے لیے انشاء اللہ رضامند کر لوں گا۔ یا یہ کہ اس سال تعزیہ اسی راستہ سے گذرے اور آئندہ کے لیے تعزیہ دار اس راستہ کو ترک کر دیں۔ دونوں تحریروں میں سے جس پر معترضین متفق ہو جائیں یا جس کو معترضین منظور کر لیں۔ اور جانبین کے دستخط ہو جائیں۔ تو میں مسلمانوں کی طرف سے معاہدہ کی پابندی کا یقین دلاتا ہوں۔ وزیر اعظم صاحب نے میجر کوٹھاوالے کو فریق ثانی کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی ہدایت کی۔ اور ہم واپس سلطان پور چلے آئے۔ اسی دن یہاں مہندی نکالی جاتی ہے۔ علم کی طرح مہندی بھی بطور احتجاج نہ اٹھائی گئی۔ کوٹھاوالا نے تعزیہ داروں سے دریافت کر بھیجا۔ کہ اگر تمہیں سمجھوتہ کے لیے بلاؤں تو آ جاؤ گے۔ تعزیہ داروں نے جواب دیا کہ ہم ہر وقت آنے کو تیار ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ علم نکالنے کا وقت گیا۔ اور مہندی نکلنے کا وقت بھی گیا۔ اسی لیت و لعل میں تعزیوں اور ذوالجناح کا وقت نہ گزارا جائے۔ تعزیہ داروں نے میجر صاحب کے پیغام کا ۵ بجے تک انتظار کیا۔ لیکن ۵ بجے تک کوئی پیغام نہ آیا۔ مجھے میجر صاحب نے بتایا۔ کہ فریق ثانی اس تجویز کے متعلق کسی رضامندی کا اظہار نہیں کر رہے۔ ۵ بجے پھر تعزیہ دار اور دوسرے متعلقین جمع ہوئے۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ راستہ کے مطالبہ کے جواب تک تو سب متفق تھے۔ اور آئندہ طریق کار میں ضرور اختلاف رائے تھا۔ ایک فریق کی رائے تھی کہ تمام ریاست کے تعزیے تاوقتیکہ راستہ صاف نہ کیا جائے۔ نہ اٹھائے جائیں۔ میری بھی یہی رائے

تھی۔ ۶ بجے ایسی جماعتیں محلہ رنگریزوں میں سے نکلنی شروع ہوئیں پولیس نے بحکم مجسٹریٹ علاقہ انہیں گرفتار کرنا شروع کیا۔ دو گھنٹے کے اندر ۱۱۵ گرفتاریاں نہایت پُر امن طریق سے عمل میں آئیں۔ رات کو صبح تک کے لیے یہ سلسلہ ملتوی کر دیا گیا۔ ۸ محرم اور ۹ محرم کو ۳ بجے تک گرفتاریوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تقریباً ساڑھے چار سو گرفتاری بغیر کسی شور و شر کے عمل میں آئی۔ ۸ محرم کی صبح کو دیہات کے جو مسلمان وہاں موجود تھے۔ انہیں میں نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس طریق سے اختلاف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقت تک تعزیے نہ اٹھائے جائیں۔ جب تک راستہ صاف نہ ہو۔ آپ خود سوچ کر فیصلہ کر لیں۔ کہ کیا طریق اختیار کرنا ہے۔ ان میں سے بعض واپس لوٹ گئے۔ اور بعض محلہ رنگریزوں میں جا کر راستہ طلب جماعتوں میں شامل ہو گئے۔ ۹ محرم کو ۲ بجے میں نے پھر ایک بار کوشش کی کہ اس طریقہ کو ملتوی کر دیا جائے۔ تاکہ ایک بار پھر راستہ کی بندش کو دور کرنے کی سعی کا موقعہ ہاتھ آئے۔ ۱۰ محرم کو ۱۰ بجے تک ایسی جماعتوں کا بھیجنا ملتوی کر دیا گیا۔ میں ۸ بجے مع چودھری علی اکبر وزیر اعظم صاحب کے پاس کپورتھلہ آیا۔ سلطان پور سے روانہ ہونے سے قبل میں نے میجر کوٹھاوالا سے کہا۔ کہ آپ کے ملٹری افسر اور بعض سول آفیسر عوام کو مشتعل کرنے کی بہت کوشش کر رہے ہیں۔ جو معاملہ کے سلجھاؤ میں ایک روک ثابت ہو رہی ہے۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ کہ تشدد کے اسباب پیدا ہو جائیں۔ ان کی نیتوں میں فتور ہے۔ آپ کو کامل حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ لیکن میجر صاحب نے کچھ توجہ نہ فرمائی۔ جناب وزیر اعظم سے کپورتھلہ میں ۵ بجے شام کے میں نے کہا۔ کہ تعزیہ کو وہاں سے گزارنا اور شاخوں کا کاٹنا ہی مناسب ہے۔ مگر انہوں نے بڑ کی شاخوں کا کاٹنا منظور نہ کیا۔ میں نے ایک اور تجویز پیش کی اور وعدہ کیا کہ اگر اس پر عملدرآمد کیا جائے۔ تو مسلمانانِ سلطان پور کو میں رضامند کر لوں گا۔ وہ یہ کہ سردار بہادر بخشی پورن سنگھ سی۔ آئی۔ ای ریاست کے مفاد اور بحالی امن کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑ کی شاخیں کاٹ دیں۔ اور آپ تعزیہ کے ساتھ ہوں۔ اور تعزیہ آپ کے تجویز کردہ راستہ سے گذر جائے۔ تجویز کے پہلے حصہ کو بھی وزیر اعظم صاحب نے منظور نہ کیا۔ میں ۹ بجے کے بعد واپس سلطان پور پہنچا۔ ابھی اس قضیہ کے متعلق منتخبہ پنچایت کے ممبران کو پیغام بھیج ہی رہا تھا کہ اچانک دو رائفل فائر کی آواز سنائی دی۔ سرائے سلطان پور سے جو اس وقت بطور جیل استعمال ہو رہی تھی۔ چیخ و پکار اور فغاں کا شور اٹھا۔ میں سرائے کی طرف بھاگا۔ انسپکٹر جنرل پولیس کی اجازت

سے اندر داخل ہوا۔ رضاکاروں سے لڑا۔ بائیس آدمی زخمی اس وقت میں نے دیکھے۔ بعض کے خون بہہ رہا تھا اور
دو تین بے ہوش پڑے تھے۔ لفٹنٹ ڈاکٹر عباس علی اور ڈاکٹر کشمیرا سنگھ زخمیوں کو دیکھ رہے تھے۔ واقعہ کی
تحقیق شروع کی تو معلوم ہوا کہ روز اول سے ہی یعنی جس دن سے ملٹری یہاں پہنچی ہے۔ سکھ سپاہیوں اور افسروں نے
کھانا پکانے کے لیے اپنے چولھے مسجد کی دیوار کے ساتھ بنائے ہوئے ہیں، جن کے نشانات آج تک موقعہ پر موجود
ہیں۔ وہاں جھٹکا پکایا جاتا تھا۔ اور نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کے راستہ میں بھی اکثر فوجی سپاہی نمازیوں کے لیے
مزاحمت کا باعث ہوتے تھے۔ موجودہ ہنگامہ کی وجہ یہ ہوئی۔ کہ نماز عشاء کی اذان پر سکھ فوجیوں نے پہلے تو
مضحکہ اڑایا اور پھر جب لوگ نماز ادا کر رہے تھے۔ تو ایک سکھ فوجی ملازم نے خدا کی شان میں ایسے الفاظ کہے۔
جنہیں کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ اس پر رضاکاران معترض ہوئے اور کہا کہ گو ہم قیدی ہیں۔ لیکن ہم
اپنے مذہب کی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی۔ کہ بعض سکھ سپاہیوں نے چھت کا
منڈیرا اکھاڑ کر رضاکاروں پر خشت باری شروع کر دی۔ ان اکھڑی ہوئی اینٹوں کے نشانات میجر کوٹھا والا اور
مجسٹریٹ دونوں کو دکھا دیئے گئے تھے۔ رضاکاروں کا یہ بیان میری تحقیق کے مطابق صداقت پر مبنی ہے۔ میں
اس میں شک و شبہہ کی گنجائش محسوس نہیں کرتا۔ اس تحقیق کے بعد میں نے میجر کوٹھا والا کو حالات کی نزاکت کی
طرف پھر توجہ دلائی۔ اور کہا کہ جہاں جذبات کی یہ کیفیت ہو وہاں خیریت کی امید کیوں کر ہو سکتی ہے۔ میں نے
۲ بجے رات کپور تھلہ پہنچ کر چیف منسٹر کو تمام جھگڑے اور بنائے جھگڑا کی اطلاع دے دی۔ اور بتا دیا کہ اس
واقعہ کے باعث دیہات میں بھی اشتعال پیدا ہوگا۔ نہایت ضروری ہے کہ تعزیہ کے راستہ کی طرف خاص توجہ
دی جائے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ سکھ ملٹری سٹاف فائر کرنے کے بہانے کا ہی متلاشی ہے۔ معاملات اس
حد تک بگڑ چکے ہیں کہ مسلمان سپاہی بھی اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنے آپ کو مامون نہیں سمجھتے۔ میجر کوٹھا والا صاحب
کو میں بارہا مطلع کر چکا ہوں۔ لیکن ان کے نزدیک میری ہر آواز صدا بصحرا ہے۔ ۲½ بجے کے قریب میں واپس سلطان پور
آیا۔ ۱۰ محرم صبح ۹ بجے مسلمان میرے پاس آئے۔ اور شب گذشتہ کی کوشش کا نتیجہ طلب کیا۔ میں نے کہہ دیا
کہ وزیر صاحب اپنے تجویز کردہ راستہ سے خود تعزیہ لے جانے کو تیار ہیں۔ بجز اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔
بجز اس کے اور کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ قریباً ۱۰ بجے سپیشل مجسٹریٹ نے مجھے کہا کہ جو لوگ ٹونڈی اور

دیہات سے آئے ہیں۔ وہ تعزیہ متنازعہ راستہ سے نہ لے جائیں۔ میں معیت چودھری فضل محمد وکیل اور چودھری
فتح محمد جو ان تمام ایام میں میرے ساتھ ہر کوشش میں شامل رہے ہیں۔ مجمع کی طرف روانہ ہوا۔ اس مجمع میں سے
سربرآوردہ اشخاص کو بلا کر سمجھایا کہ تم رحمت والا تعزیہ متنازعہ راستہ سے نہ لے جاؤ۔ میں نے حد سے زیادہ اصرار کیا۔
چونکہ مجھے معلوم تھا کہ مجمع خواہ کتنا ہی پُر امن کیوں نہ ہو۔ اُن پر فائر ہو جائے گا۔ اور وہ بھی منتقمانہ جذبہ کے تابع ہوگا۔
فائر کرنے والے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے فائر نہیں کریں گے بلکہ قتلِ عام کا منظر دنیا کے سامنے ہوگا۔ چنانچہ ایسا
ہی ہوا۔ میں نے ان اشخاص سے درخواست کی کہ یا تو تعزیئے پڑے رہنے دو۔ اور جب تک راستہ متنازعہ صاف نہ
ہو جائے کوئی تعزیہ نہ اٹھایا جائے اور وہ اس پر رضامند تھے لیکن صرف اتنے پر رضامند نہ تھے اس لیے میں نے یہ رائے دی کہ جو طریق اہل
سلطان پور نے رضاکاروں کو قید کرانے کا آج سے تین روز پہلے اختیار کر رکھا ہے۔ اسی کے مطابق موقعہ پر جا کر
اپنے آپ کو گرفتار کرا دو۔ ان کا یہ جواب تھا کہ حکومت ہم پر کیوں گولی چلائے گی۔ اور کیوں تشدد بے جا کرے گی۔
نہ ہم کسی فریق سے لڑنے جا رہے ہیں۔ نہ زبردستی بڑ کاٹ رہے ہیں۔ نہ ہمارے پاس اسلحہ ہے۔ اور نہ ہماری دنگا فساد
کی نیت ہے۔ اہل سلطان پور کے پروگرام میں صرف اتنی ترمیم کریں گے۔ کہ تعزیہ راستے پر رکھ کر اپنے آپ کو گرفتاری
کے لیے پیش کریں گے۔ ہماری نیتیں صاف ہیں۔ اور ہم اسی بات کا اعلان کرتے ہیں۔ حکومت اگر چاہے تو ہمیں اسی
مقام پر گرفتار کر سکتی ہے۔

میں نے تعزیہ اٹھاتے وقت انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ تم پر آتش باری کی جائے گی۔ اور ان سب
سے وہی جواب پاتا رہا جو وہ پہلے دے چکے تھے۔ پسر و ہمشیرزادہ رحمت تعزیہ دار انہیں تعزیہ اٹھانے اور
راستہ متنازعہ پر چلنے کی نہ صرف ترغیب دیتا تھا بلکہ اس پر اصرار کرتا تھا۔ میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ کچھ وقت آرام
کرنے کے بعد مع چودھری فتح محمد مستری محمد یعقوب کے بالاخانہ کے چھت پر آ گیا۔ جہاں سے کہ بڑ متنازعہ تک
سب کچھ نظر آتا تھا۔ اور تعزیہ کے جلوس کی ہر حرکت میں دیکھتا۔ اور باتوں کی مجھے اطلاع ملتی تھی۔ منشی محمد حسن گرداور
اور کیپٹن عزیز احمد کو میں نے بارہا رہنمایانِ جلوس میں دیکھا۔ جلوس ایک ہی جگہ پر رک گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک گھنٹہ کا
وقفہ اس لیے قرار پایا ہے کہ ممبران کونسل و صاحب صدر موقعہ پر آ جائیں۔ تو خاطر خواہ تصفیہ کرا دیا جائے گا۔ اس ایک
گھنٹہ سے بیس پچیس منٹ زائد وقت بھی گزر گیا۔ مگر انتظامیہ کونسل موقعہ پر نہ پہنچی۔ ۴ اور ۴½ بجے کے درمیان ایک

بگل بجا۔ جو لوگ اس مکان کے قریب تھے جہاں میں موجود تھا۔ ان کی آواز میرے سننے میں آئی کہ لو کھٹی میاں صاحب آئے ہیں۔ اسی لیے بگل بجا ہے۔ بگل بجنے کے معاً بعد ٹومیں گن اور رائفل فائر شروع ہو گیا۔ فائر ہر مقام سے ہوا۔ گردوارہ ہٹ صاحب سے بھی فائر ہوتا تھا۔ تحصیل کے ایک بُرج سے بھی تین چار فائر ہوتے۔ تکیہ راجپوتاں میں اور ویٹرنری ہسپتال کے قریب جو لوگ شہید یا زخمی ہوئے وہ سب ہٹ صاحب کی گارد کے فائر سے ہوئے۔ ایک شخص شادی کمبوہ سکنہ الوپور چراغ شاہ کے مکان کے قریب گولی کا نشانہ بنا۔ اور وہیں جان بحق ہوا۔ فائر بند ہو جانے کے بعد بھی ہٹ صاحب سے تین فائر ہونے کے قریباً ۲۰ اور ۲۵ منٹ بعد میں جائے وقوع پر پہنچا۔ زخمی زیادہ تر موٹروں میں ہسپتال بھیجے جا چکے تھے۔ شہداء کی نعشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لاریوں میں لادا جاتا تھا۔ موقعہ پر صرف ایک ڈاکٹر تھا۔ نہ کوئی سٹریچر تھا اور نہ مرہم پٹی کا کوئی انتظام۔ یہاں تک کہ بعض زخمی شدت پیاس کے باعث بے تاب تھے پانی کے چند قطروں کے لیے ترستے ہوئے جان بحق ہوئے۔ ہٹ صاحب اور تحصیل کے برج کے علاوہ اس بلند مقام یعنی آوا سے بھی فائر ہوئے۔ جو اس مقام سے جہاں ٹومیں گن رکھی ہوئی تھی جنوب مشرقی گوشہ میں واقع ہے۔ مسلح سکھ اور مہابیر دَل کے والنٹیر کرپانوں، برچھیوں اور لاٹھیوں سے مسلح فوج کے پیچھے کثیر تعداد میں موجود تھے۔ جو دیکھنے والا ان کو میجر کوٹھاوالا کی ریزرو فورس ہی تصور کر سکتا ہے۔

چودھری عبدالرشید خاں مجسٹریٹ علاقہ میرے حقیقی بھائی ہیں کیپٹن عزیز احمد بھی میرے چھوٹے حقیقی بھائی ہیں۔ ٹومیں گن پر کام کرتے ہیں۔ میں نے ایک سکھ سپاہی کو دیکھا۔ ٹومیں گن کی آواز بھی بخوبی پہچان سکتا ہوں۔ شہداء کے زخموں کی کیفیت سے بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ زخم ٹومیں گن کی گولیوں سے واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً نبی بخش سقہ جس کے سینہ میں ۹ گولیاں تھیں اور پیرو ہمشیرہ زادہ رحمت تعزیہ دار جس کے پیٹ میں کئی گولیاں تھیں۔ ایک ہی نشان پر کئی گولیوں کا لگنا صرف ٹومیں گن ہی سے ہو سکتا ہے۔

س: اگر ایک ماہر نشانچی ٹھیک نشانہ پر کئی ایک بار رائفل سے فائر کرے۔ اور یہ سب گولیاں ایک ہی مقام پر لگیں۔ تو کیا ایسے ہی زخم پیدا نہیں ہو سکتے۔ جو نبی بخش اور پیرو کے آپ نے دیکھے اگر نہیں تو کیوں؟

ج: رائفل کا فائر اتنا تیز نہیں ہو سکتا جتنا کہ ٹومیں گن کا ہوتا ہے۔ رائفل کی پہلی گولی جس شخص کے لگے گی وہ لازماً اپنی پہلی پوزیشن سے حرکت کرے گا۔ اس لیے دوسری گولیاں اس نشانہ کے قریب نہیں لگ سکتیں۔ یہ ٹومیں گن

کے تیز فائر ہی سے ہو سکتا ہے کہ کئی ایک گولیاں ایک ہی نشانہ پر یا ایک ہی نشانہ کے قریب لگ سکیں۔

س: کیا واقعہ سلطان پور کا داخلی سیاسیات سے کچھ تعلق ہے یا یہ محض اتفاقی ہے؟

ج: میں اس فائرنگ کے متعلق پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ایسے حالات پیدا کرنے کی بعض ملازمین ریاست خود کوشش کر رہے تھے میں اسے محض اتفاقی حادثہ قرار نہیں دیتا۔

س: یہ کوششیں کیوں اور کب شروع ہوئیں۔ کیا آپ اس امر کا مفصّل بیان فرما سکتے ہیں؟

ج: ریاست کپورتھلہ میں سالہا سال سے مسلمان پسماندہ قوم کی حیثیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ باوجودیکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے قریباً ساٹھ فی صدی مسلمان آباد ہیں لیکن ریاست کے ہر محکمہ میں ملازمتوں کے اعتبار سے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسلمان اس وقت بھی تقریباً ساٹھ فی صدی مالیہ ادا کرتے ہیں۔ مگر وظائف اور اوقاف میں انہیں صرف آٹھ ہزار چار سو چالیس روپیہ ملتا ہے۔ برعکس اس کے غیر مسلموں کو ۸۳۳۸۷ روپیہ نقد ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مندروں اور دھرم شالاؤں کے نام معافیات ہیں۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمان کپورتھلہ میں نہایت کمتر درجہ میں رکھے گئے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں مسلمانوں نے حقوق طلبی کی پہلی ہلکی سی آواز بلند کی تھی۔ اور ساتھ ہی زمیندار جو آئے دن بے انصافی کا شکار ہوتے تھے ان کی اس تباہ حالی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے ایک زمیندارہ تحریک کی بنیاد ڈالی۔ چونکہ زمیندار اقوام میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ اس لیے ہندو ساہو کاروں نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی ہر امکانی کوشش کی۔ سکھ زمیندار بہت تھوڑی تعداد میں اس تحریک میں شامل ہوئے۔ کیونکہ وہ ایسے سکھ افسروں کے زیر اثر تھے۔ جو خود بڑے پیمانے کا ساہو کارہ کا کام کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں بیداری اور حقوق طلبی کے جذبہ کے وہ متحمل نہ ہو سکے اس لیے وہ تحریک خالص زمیندارہ تحریک تھی۔ جو ہندو ساہو کاروں کے علاوہ ریاست کے ذمہ دار اہل کاروں کو بھی ناگوار گزری۔ اور انہوں نے اپنے آوردوں اور پروردوں کے ذریعے اس تحریک کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اور اس تحریک کو کچلنے کے لیے مسلمان زمینداروں کو بے طرح تنگ کیا جاتا رہا۔ جنوری ۱۹۳۴ء کے پہلے ہفتہ میں قانون تحفظ اراضیات زمینداران کی ترمیم اس تحریک کا نتیجہ ہوئی۔ اس ترمیم کے بعد ہندوؤں نے سول نافرمانی کی تحریک بڑی شدومد سے جاری کی۔ اور منجملہ دیگر مطالبات ایک یہ

مطالبہ بھی پیش کیا۔ کہ نظامِ ریاست کی ذمہ داریاں ایک انتظامیہ کونسل کو سونپی جائیں۔ جس کو مہاراجہ صاحب نے منظور کرتے ہوئے اس طرح ترتیب دیا کہ ۷ ممبروں کی کونسل مرتب کی جس میں سے دو مسلمان تھے۔ مسلمانوں کو اس کے خلاف شکایت تھی۔ کہ کونسل میں ان کی نمائندگی ان کے تناسب آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ ہندوؤں کی اس تحریک کی کامیابی کے بعد ہر طبقہ کے مسلمان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے ریاست اپنے دیرینہ اصول کے مطابق مسلمانوں کے حقوق اور بھی زیادہ پامال کرے گی۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا۔ اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے احرار کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جو ۳ و ۴ اپریل ۱۹۳۴ء کو ہوئی۔ اس کانفرنس میں ذمہ دار اسمبلی مسلمانوں کے لیے۔ ملازمتیں بلحاظ تناسب آبادی اور چند دیگر اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا۔ مہاراجہ صاحب کی طرف سے کانفرنس کے پنڈال میں وزیر اعظم صاحب نے اعلان کرتے ہوئے یقین دلایا کہ سرکار کی واپسی یورپ پر مطلوبہ اسمبلی قائم کر دی جائے گی۔ اور مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ بھی یقین دلایا گیا۔ کہ جن محکمہ جات میں مسلمان کم ملازم ہیں۔ وہ کمی پوری کی جائے گی۔ انہی مطالبات میں جگت جیت انفنٹری اور محکمہ جنگی کی دوسری شاخوں میں جہاں مسلمان بہت کم تعداد میں ہیں۔ مسلمانوں کی کمی کو پورا کرنا بھی شامل تھا۔ اس کانفرنس کی کامیابی اور حکومت ریاست کا اعلان اور بالخصوص اس تیسرے مطالبہ نے ریاست کے اکثر غیر مسلم ذمہ دار افسروں کو اور بھی چراغ پا کر دیا۔ اور مسلمانوں کو کچلنے کے منصوبے گانٹھے جانے لگے۔ سلطان پور کا واقعہ ہر ذی فہم کے نزدیک انہی اسباب کا ایک نتیجہ تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری ان کے لیے جو ریاست کے ہر شعبہ پر قابض ہیں۔ اور ان کے معاونین کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس سیاسی بیداری اور حقوق طلبی کی سپرٹ کو ہمیشہ کے لیے فنا کرنے اور مسلمانوں کے شیرازے کو بکھیرنے کے لیے سلطان پور کا قتل عام ظہور میں آیا۔ ورنہ شارع عام پر ایک بڑ کے درخت کی چند شاخوں کے لیے جو میونسپلٹی کی زمین میں ہو مسلمانوں کا اس بے دردی سے خون بہایا جانا اور کیا معنی رکھتا ہے۔ میں اس امر کو اپنے بیان کے پہلے حصہ میں واضح کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کے اس مجمع سے نقضِ امن کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ جو کچھ ۱۰ محرم کو ہوا۔ ایک خاص سازش کا نتیجہ تھا۔ جس میں ریاست کے بڑے بڑے ذمہ دار افسروں کی شمولیت ہے۔

بے سمجھ قوم کے لیڈر کی مشکلات

لیڈری پیغمبری کا جزو اعظم ہے۔ لیڈر کی زندگی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہے۔ کرو تو اعتراض نہ کرو تو اعتراض۔ کسی کام سے منع کرو تو اعتراض نہ کرو تو اعتراض۔ کسی کام سے منع کرو تو شکوہ۔ کسی کام کے کرنے پر ابھارو تو شکایت۔ یہ زندگی پختہ سیرت کے بغیر بسر نہیں ہو سکتی۔ خدا پر پورا بھروسہ یا اپنے نصب العین پر اعتماد ہو۔ دونوں ہوں تو بہت بہتر کوئی نہ ہو تو زندگی تلخ۔ جوش و ہنگامے میں عقل کی بات کہنا اپنے گلے میں خود جوتوں کے ہار ڈالنا ہے۔

چودھری عبدالعزیز نے تعزیہ داروں کو تعزیہ اٹھانے سے باز رکھنا چاہا۔ لیڈری کی ہوا کا رخ بدل گیا۔ سرگوشیوں نے کانوں میں زہر ٹپکانا شروع کیا۔ کہ بک گئے۔ مل گئے۔ کس سے؟ وزیر اعظم سے۔ کھا گئے۔ کتنا؟ کچھ نہ پوچھو۔ غرض چودھری صاحب پریشان ہوئے۔ گھبرائے گھبرائے پھرے کہ نہیں بھیا یہ بدگمانی نہ کرو۔ بدگمانیاں ایکشن سے دور ہوتی ہیں۔ قربانی معترض کی زبان روکتی ہے۔ جوش کے وقت عقل کی بات کہہ کر وہ جس دلدل میں پھنسے تھے۔ اس سے نکلنے کی ایک ہی صورت تھی کہ جیل کی ہوا کھائیں۔ سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر قدرت کا تماشا دیکھیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے حالات سے گھبرا کر سلطان پور کے واقعہ کے متعلق ریاستی افسران پر شدید الزامات لگائے اور وزیر اعظم کو مفصل چٹھی لکھی۔ ریاستی نوکر شاہی کے ہاتھ بہانہ آ گیا۔ اور چودھری صاحب زیر دفعہ ۲۲ الجرم بغاوت دھر لیے گئے۔ اب زبان طعن رک گئی۔ اور محبت کے آنسو جاری ہو گئے۔ اب پھر ریاست کپورتھلہ کے طول و عرض میں "عبدالعزیز زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ میاں سر عبدالحمید وزیر اعظم کپورتھلہ بڑے جوڑ توڑ کے آدمی تھے۔ مسلمان ہونے کے باعث ان کے انتظام کے خلاف مسلمانوں میں مؤثر آواز پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ مسلمانوں کو مسلمان بن کر مارنا آسان ہے۔ پھر اگر مسلمان افسر ہوشیار بھی ہو تو مسلمان آبادی اپنے مفاد کے خلاف ایسے شخص کے دام میں گرفتار رہنے کو پسند کرتی ہے۔ سلطان پور میں گولی چلنے اور چودھری عبدالعزیز کو گرفتار کرنے سے میاں صاحب موصوف کی ہر دل عزیزی میں فرق آ گیا۔ یہ موزوں موقعہ تھا۔ سلطان پور کے واقعہ سے فائدہ اٹھا کر عوام کے لیے کسی مستقل رعایت حاصل کرنے کے لیے ہلچل شروع کی جائے۔ سلطان پور کے واقعات بجائے خود

کوئی مستقل تحریک نہیں بنے۔ ایسے ہنگامی حالات سے جو اشتعال انگیز ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے اربابِ ظلم کے خلاف کام لیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح ظالم افسران کی ہر دل عزیزی کم کر کے اقتصادی اور سیاسی تحریکات کو مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے سلطان پور فائرنگ اور چودھری عبد العزیز کی گرفتاری سے پورا فائدہ اٹھا کر زرعی مطالبات کو آگے لانے کی کوشش کی۔ ابتدا میں یہ فرقہ وار اور زرعی ملی جلی تحریک کے طور پر عوام کے سامنے آئی۔ ارادہ یہ تھا کہ ابتدا ایسی ہی رہے اور انتہا خالص زرعی تحریک رہ جائے۔ اور کسانوں میں جتھہ بندی مضبوط کی جائے۔ چنانچہ ان ملے جلے جذبات کو مسلمانوں میں ابھارا گیا۔ بیگووال کے غیر ملازم راجپوتوں نے ہمارا ہاتھ بٹایا چونکہ چودھری عبد العزیز خاں راجپوت تھے۔ اس لیے عصبیت کی بنا پر کچھ اور راجپوت گاؤں بھی متاثر ہوئے آہستہ آہستہ ریاست میں جلسے اور مظاہرے ہونے لگے۔ مجلس احرار جالندھر کے کارکن برابر ریاستی لوگوں کے ساتھ نامہ و پیام کرتے رہے۔ حکومت کی طرف سے تشدد اور لوگوں کی طرف سے سول نافرمانی شروع ہو گئی۔ جہاں جلسہ ہوتا وہاں پولیس جلسے کو منتشر کرتی تھی اور بڑی بے رحمی سے ڈنڈے برساتی۔ اس سے معاملہ ذرا آگے بڑھا۔ لوگوں نے جتھہ بند ہو کر شہر کپورتھلہ کے محلات کی طرف فریاد و فغاں کے ساتھ بڑھنا چاہا۔ اس تحریک کو روکنے کے لیے ریاست نے چوکی پہرے بٹھا دیئے۔ اور ڈنڈا پولیس نے کسانوں کے سر اور کمر کی پورے طور سے تواضع کرنا شروع کی۔ کئی دن تک کسانوں اور پولیس میں کشمکش جاری رہی۔ جالندھر کے احرار کے متعدد جتھے ریاست کی طرف بڑھتے ہوئے گرفتار ہوئے۔

خدا خوش رکھے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی عجب بزرگ ہیں۔ آپ جالندھر میں ان دنوں وارد ہوئے۔ جب تحریک بڑھ رہی تھی۔ آپ نے احرار کے سرخ پوشوں کی بجائے نیلی پوش بننے کی لوگوں کو تلقین کرنی شروع کی کچھ وکلاء کے گروہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مولانا کی سرکردگی میں کچھ وکلاء ہمیں ناکام بنانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ان تمام حالات پر غور کرنے کے لیے ہم نے جالندھر میں ورکنگ کمیٹی کا اعلان کیا۔ ادھر وکلاء کی جماعت نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنا کر اس کے نتائج کے بعد ایکشن یعنی تبلیغ شروع کی ہوئی تھی۔ جالندھر، سیالکوٹ نہ رہا تھا۔ کہ لوگ یک جان اور ہم خیال ہو کر ہماری رہنمائی قبول کرتے۔ لوگوں کے ذہن میں عجب انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ میاں سر عبد الحمید جالندھر کے رہنے والے ہیں۔ ان کے خاندان کا کافی اثر تھا۔ علاوہ ازیں سر موصوف خود بھی ملنسار ہیں۔

اس لیے جالندھر کے طبقۂ اعلیٰ میں احرار کے خلاف فضا زیادہ مسموم ہو گئی۔ میاں سر عبد الحمید نے اس نے پابندی لگا دی۔ کہ جالندھر میں احرار کا پورا اثر پیدا نہ ہونے پائے۔

تحریکات میں جنگ کی طرح خیال رکھنا چاہیئے کہ مضبوط Base یعنی مرکز کے بغیر جنگ کا محاذ کمزور ہو جاتا ہے۔ کشمیر کی تحریک کی کامیابی سیالکوٹ کے سر تھی۔ سیالکوٹ کے ایثار سے تمام ہندوستان کے مسلمان متاثر ہوئے تھے۔ اگر سیالکوٹ ریاست کے قرب کے باوجود احرار کا مخالف ہوتا تو احرار کی کشمیر کی یلغار کامیاب صورت اختیار نہ کرتی۔ جالندھر شہر میں امراء تو مخالف تھے ہی۔ ہمیں اس کی چنداں پروا نہ تھی۔ لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ امراء کا غریبوں پر باوجود لوٹ کھسوٹ اور انہیں غلام بنائے رکھنے کے اثر ہوتا ہے۔ یہ اثر جالندھر میں نمایاں تھا کسی غریب جماعت کی جیسی کہ احرار ہے۔ کامیابی یہ ہے کہ وہ غریبوں کو متاثر کر سکے۔ کہ وہ اوپر کے طبقے سے بے نیاز ہو جائیں۔ اور ان میں نہ صرف طبقاتی شعور پیدا ہو۔ بلکہ ہو سکے تو غریبوں کو جتھہ بند امراء کے خلاف کام میں لایا جائے۔ وحدت انسانی کے تصور اور انسانی برادری میں سب کے برابر ہونے کے خیال میں جو امر مانع ہے۔ وہ یہ ہے کہ غریب امیر کی بات سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اپنے مفاد کے خلاف اس کے جھانسے میں آیا رہتا ہے۔ امیر ذرا ہنس کے بلائے تو یہ لب ڈھیلے چھوڑ کر خوشامد پر آتا ہے۔ اس کا اشارہ پاتے ہی غریبوں ہی پر ظلم توڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ امراء کے اشارے پر غریبوں کا ایک معتد بہ حصہ ہمارے مخالف ہو چکا ہے۔ جالندھر کے مسلمانوں کو پامال مثل بنا کر کے میاں صاحب نے بے پناہ تشدد سے اندرون ریاست کی تحریک کو دبا لیا۔ ہماری ورکنگ کمیٹی کے لیے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ہم پہلے جالندھر کی فضا کو کسی طرح اپنے حق میں بنائیں۔ اور پھر کپورتھلہ کا رخ کریں۔ اگرچہ وکلاء کے ہاتھوں ہماری یہ شکست تھی۔ لیکن ہم نے حالات سے مجبور ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ ہم اس بنائی ہوئی کمیٹی کے ساتھ تعاون کریں گے۔ اور مسلمانوں کو انتشار سے بچائیں گے۔ ہم یہ جانتے تھے کہ یہ صرف ہمارے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے زبان سے کہتے ہیں۔ کہ ہم سول نافرمانی کریں گے۔ ورنہ وکلاء کی جماعت تو کبھی سول نافرمانی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

عوام کا قاعدہ ہے۔ کہ وہ کام کی حامی بھرنے والوں کی جان کا عذاب ہوتے ہیں۔ جو خاموش بیٹھ جائے اس کا پیچھا نہیں کرتے۔ اب ہمارے اعلان کے بعد یہ ہوا کہ سب لوگ کہنے لگے کہ "یہ وکیل لوگ کیا خاک سول نافرمانی

کریں گے۔ کم بختوں نے یوں ہی احرار سے پلیٹ فارم چھین لیا۔ سپاہیوں کے ہاتھ سے میدان لے کر بالتونی لوگ آگے آ گئے ہیں۔ اب کپورتھلہ کے مسلمانوں کا اللہ والی سمجھوتہ لڑائے عامہ بہت ہی مؤثر حربہ ہے۔ اسی حربے سے یہ لوگ ہمارے خلاف کام لینا چاہتے تھے۔ اب وہ خود رائے عامہ کا شکار ہو کر منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ ہمارے اس جالندھر میں ریزولیوشن پاس کر کے آنے کے چار روز بعد ایک وکیل صاحب جو سب سے زیادہ ہمارے مخالف تھا گھبرایا ہوا لاہور آیا۔ کہ تم نے سخت سیاسی چالبازی سے کام لیا ہے۔ اگر ہم مسلمانوں کو سول نافرمانی کا مشورہ دیتے ہیں۔ تو سب سے پہلے خود دھرے جاتے ہیں۔ اگر سول نافرمانی سے باز رکھتے ہیں۔ تو کہیں گے کہ ریاست کا روپیہ کھا کر ایسا کہتے ہیں۔ ہماری جان عذاب میں آ گئی ہے۔ میں نے کہا جان برادر تم نے ہماری حالت بھی تو چوروں کی سی کر دی تھی۔ تمہاری زبان پر جب سنو یہی تھا۔ کہ قومی کارکن سب خائن ہوتے ہیں۔ بھیّا! اب ہم نے تمہیں میدان دے دیا ہے۔ قوم کو خوب لوٹو۔ گر خود بھی سال دو سال کے لیے جیل دیکھ آؤ۔ تم کہا کرتے تھے کہ احرار کے لیے ایسا سودا مہنگا نہیں۔ اب ہم کہتے ہیں کہ یہ سستا سودا تم ہی خرید لو۔ یہ پچھتانے کا وقت نہیں۔ ہم ایک ہاتھ سے قوم کو لوٹتے تھے۔ تم وکیل ہو۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹو۔

ماسٹر تاج الدّین کی رہنمائی

ماسٹر تاج الدین ہماری جماعت میں بڑے جوڑ توڑ کے آدمی ہیں۔ وہ سوکھی مٹی سے محل تعمیر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مناسب یہی سمجھا گیا۔ کہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے اور مناسب اقدام کے لیے کپورتھلہ ایجی ٹیشن کا چارج ان کو دیا جائے۔ سب سے پہلے انہوں نے جالندھر میں بیٹھ کر روزنامہ جاری کیا۔ روزنامہ بجائے خود تحریک ہوتی ہے۔ وہ اہل تدبر ہی نہیں بلکہ اہلِ قلم بھی ہیں۔ قلم اور تدبّر نے ان عناصر کو جو ریاستی حکام کے تشدد سے دب گئے تھے پھر ابھر آنے کا موقع دیا۔ ہندو ساہوکاروں نے بھی اس دوران میں جلسے اور مظاہرے کرنے شروع کیے۔ اگرچہ یہ لوگ زیادہ تر شہروں میں رہتے ہیں۔ لیکن ریاستی کاروبار میں مؤثر آواز رکھتے ہیں۔ ماسٹر تاج الدین کی تدبیر یہ تھی۔ کہ ہندوؤں کے اس بااثر طبقے کے ایجی ٹیشن کو ہوا دی جائے۔ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ قومیں دیکھا دیکھی تیار ہوتی ہیں۔ ساہوکاروں کو دیکھ کر کاشت کاروں میں بھی جتھہ بندی کا شعور پیدا ہو گا۔ علاوہ ازیں جب کاشت کار اور ساہوکار دونوں مظاہرے کریں گے۔ تو ریاست کی پریشانیوں میں اور اضافہ ہو گا۔ یہ صورت ایک قوم کی سول نافرمانی سے بھی زیادہ مؤثر تھی۔ جب تک احرار اور ریاست کے مسلمان کاشت کار تحریک چلاتے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ کے افسر میاں سر عبدالحمید کے حق میں تھے۔ اور مجھ سے کونسل میں بے حد کھچے کھچے تھے۔ حتیٰ کہ چیف سکرٹری نے چودھری عبدالرحمن خاں ایم۔ ایل۔ سی کی معرفت مجھے ملنے کی خواہش کی۔ میں ملا تو مجھے دھمکانے لگے۔ ایسا سلوک اس افسر کی عادت تھی۔ میں جاگیردار یا خطاب یافتہ نہ تھا۔ میں نے بالکل اسی انداز میں گفتگو کی۔ اور کہا تم لوگ ہمیشہ حکومت کے غرور میں ظالم حکام کی طرفداری کر کے عوام کو کچلتے ہو۔ اس نے کہا کہ ہندو اور سکھ بالکل پُر امن ہیں۔ تم نے مسلمانوں کو بھڑکا یا ہوا ہے۔ اس کا جواب ماسٹر صاحب کی تدبیر تھی۔ اگرچہ اپنے خلاف ہندوؤں کے ایجی ٹیشن کو ہوا دینا ظاہر میں عقل کے لیے حیران کن تھا۔ لیکن سیاست سیدھی راہ نہیں کہ سرپٹ گھوڑا دوڑایا جائے۔ اس میں بہت پیچ و خم ہیں۔ یہاں تدبیر اور اسباب کی فراہمی سے تقدیر بنتی ہے۔ تیاریوں سے غافل اور عقل سے فارغ قوم کا خدا پر بھروسہ بے معنی ہے۔ خدا ہمیشہ باتدبیر اور ہوشیار رہ کر کام کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ ہماری تدبیروں کے دو عناصر تھے۔ ایک تو جالندھر کے مخالف امرار کے برادر و کلا کے گروہ کی پوری نگرانی۔ دوسرے ریاست کے ہر عنصر کو مشتعل کرنا خواہ وہ ہندو ہوں مسلمان۔ یا سکھ کاشتکار ہوں یا ساہوکار۔ جو بھی ریاست میں شور و شر کرے۔ وہ ہمارا اور ہم اُن کے ساتھی تھے۔ شور و شر عوام کی زندگی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ کیسا ہی شور و شر ہو۔ اس کو عوام کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بنابریں ہم متواتر ساہوکارہ ایجی ٹیشن کی حمایت کرتے رہے۔ اور ساتھ ہی میاں دیوان سر عبدالحمید کی حکومت پر ہر طرح زور دیتے رہے۔ کہ ہندو ایجی ٹیشن کو دبائے۔ سب سے مؤثر ذریعہ اخبار تھا۔ جو جالندھر سے ماسٹر جی نے جاری کروایا تھا۔ لوگوں کی زبان سے بات کہلوائی۔ کہ میاں صاحب ساہوکاروں کے دشمن اور صرف مسلمانوں پر شبیر ہیں۔ یہ بات میاں صاحب کو کھا گئی انہوں نے جھنجلا کر بھگواڑہ کے ساہوکاروں کو گرفتار کر لیا۔ اب کیا تھا۔ پنجاب کا تمام ہندو پریس جو میاں صاحب کی تعریف کرتا تھا۔ ان کے کارٹون شائع کرنے لگا۔ آرٹیکل پر آرٹیکل لکھے جانے لگے۔ اور ہندو حلقوں میں عام پکار ہونی کہ یہ شخص دوسرا اورنگ زیب ہے۔ ہندو پریس اور ہندو عوام نے احرار اور کاشت کار کی بڑی خدمت انجام دی۔ میاں صاحب کا مسلمان ہونا بھی ریاست میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا باعث ہوا ہے۔ اگر کوئی ایجی ٹیشن ہوتا تھا تو مسلمانوں میں غلط مذہبی جذبہ پیدا کر دیا جاتا کہ کیا تم ایک مسلمان وزیر کو برخاست کرا کر رہو گے؟

باوجود سلطان پور کے واقعہ ہائلہ کے تمام اسلامی پریس میاں صاحب کے ساتھ تھا۔ لیکن میاں صاحب کی گردش کے دن جو آئے تو "سیاست" اور "زمیندار" دونوں میں چل گئی۔ "سیاست" تو خیر اپنی مصلحت کی بنا پر میاں صاحب موصوف کا حامی تھا۔ لیکن "زمیندار" عوام کا حامی سمجھا جاتا تھا۔ "زمیندار" کے کم سن ایڈیٹر نے اخبار "سیاست" پر زرِ امداد ریاست سے حاصل کرنے کا الزام لگایا۔ "سیاست" نے چند دن کے بعد مولانا ظفر علی خاں کے صاحبزادے کی دستخطی رسید کا عکس شائع کر دیا جس کے ذریعے انہوں نے ایک رقم شکریہ کے ساتھ ریاست مذکور سے وصول پائی تھی۔ اب جو مسلمان اخبار میاں صاحب کی حمایت میں قلم اٹھاتا تھا۔ وہ ریاست کا اجیر سمجھا جاتا تھا۔ بغرض کسی گوشے سے میاں صاحب کے حق میں مؤثر آواز نہ اٹھتی تھی۔ اب پنجاب گورنمنٹ پریشان ہو گئی۔ وکلا، اور امرار کا وہ گروہ جو ہمیں خائن کہہ کر اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتا تھا۔ ان لوگوں نے ان پر الزام لگایا۔ کہ یہ دو لاکھ کی رشوت لے کر رپورٹ دبائے بیٹھے ہیں۔ جالندھر میں جس سے سنو یہی کہتا تھا۔ کہ بھائی احرار غریب تھے۔ کھاتے بھی تو دس بیس ہزار کھاتے یہ کمبخت دو لاکھ کھا گئے۔ ہاں بھئی بڑوں کی توند بھی بڑی ہوتی ہے۔

میاں صاحب حکومت ہند کی نظر میں بڑے محترم تھے۔ انگریزی تدبر کے وہ مؤثر ہتھیار تھے۔ مگر موجودہ حال میں وہ زیادہ دیر تک ان کو بچا نہ سکتے تھے۔ میاں صاحب نے ہندو مل کو خوش کرنے کے لیے چودھری عبدالعزیز کو پانچ سال کی سزا دے دی۔ مسلمانوں میں ان کی اور بھی حمایت کم ہوئی۔ عوام مرلی کے ستائے ہونے کے باوجود ان کو تکلیف میں دیکھ کر آنسو بہانے لگے۔ اور ان جیسا غریب پاس ہی مر جاتے اس کی موت سے بھی متاثر نہیں ہوتے۔ چودھری عبدالعزیز جیسا میں پہلے بتا چکا ہوں ریاست کے امتیازی خاندانوں میں سے ایک کے فرد ہیں۔ وہ قید ہوئے تو ہر ریاستی غریب مسلمان کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ مہاراج کپورتھلہ تمام راجوں مہاراجوں سے مختلف ڈھب کے آدمی ہیں۔ وہ ریاست کے نظم و نسق میں کم حصہ لیتے ہیں۔ وہ سیر سپاٹے کے شائق مرنجاں مرنج سے آدمی ہیں۔ سیر یورپ سے واپس لوٹے تو یہاں لٹیا ڈوبی ہوئی نظر آئی۔ اگرچہ میاں صاحب پر ان کو بڑا اعتماد تھا۔ مگر ان کو سیاسی مصلحت پر قربان کرنا پڑا۔ چودھری عبدالعزیز کی اپیل ریاست کی عدالت عالیہ کے پاس کی گئی۔ میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر نے نہایت قابلیت سے مقدمہ مفت لڑا۔ عدالت کو مقدمہ میں سزا بحال رکھنے کی کوئی گنجائش نظر نہ آئی۔ آخر چودھری عبدالعزیز کو مہاراجہ صاحب نے رہا کر دیا۔ اور میاں صاحب وزارت سے الگ کیے گئے۔ احرار کے نظریے سے

ہمدردی ظاہر کی۔ اور اس اسمبلی کی نوعیت اور حیثیت پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی کے تقرر کا اعلان ہوا جس کے ممبر چودھری عبدالعزیز بھی بنائے گئے۔ اب مناسب یہ سمجھا گیا کہ قدرے انتظار کیا جائے۔ اور اس کمیٹی کی سفارشات کو دیکھا جائے آیا اس کے ذریعے کوئی حقیقی قوت ملتی ہے یا نہیں؟

خدا نے ہمارے کارکنوں میں اخلاص کے ساتھ بے پناہ عزم دیا ہے۔ میں نے ماسٹر تاج الدین کو کام کے لحاظ سے محنتی چیونٹی۔ تدبر کے لحاظ سے دشمن کو تاروں میں الجھا مارنے والی مکڑی پایا۔ اے کاش! سب احرار کارکن بے مصرف زندگی سے باز رہیں۔ باتیں بنانے کو گناہ سمجھیں۔ محنت کو زندگی کا جوہر سمجھیں۔ دست و بازو سے روزی کمائیں۔ باقی وقت قوم کی تعمیر میں صرف کریں۔ ہم کیسے مسلمان رہ گئے ہیں؟ دنیا کا تختہ الٹنے اور کائنات کا نقشہ بدلنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ غلام ہیں اور دوسروں سے ڈرنا ہمارا کام ہے۔ ایک صاحب تدبر اور صاحب عزم اگر ریاست کپورتھلہ کا حلیہ درست کر سکتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سب کی مشترکہ قوت اور محنت ہندوستان کی تقدیر کو نہ بدل دے۔ اور یہاں غریب عوام کی حکومت نہ قائم کر دے۔ کیسی قابل شرم بات ہے۔ کہ اس انقلابی دور میں ہم اپنے ہمسایہ سے مرعوب ہو رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ ہماری غفلت کی زندگی تھی۔ جو ہم نے بسر کی۔ غافل قوموں کو انقلابات میں ان کی غفلت کی اور عدم تیاری کی سزا ملتی ہے۔ فرانسیسی قوم وہی سزا بھگت رہی ہے۔ آج مسلمان بھی کہتے ہیں کہ فلاں قوم کے پاس بڑا اسلحہ ہے۔ کیا ہو گا ضرور کچھ ہو گا اور وہی ہو گا۔ جو غافل قوموں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ مسلمان نوجوان سن لیں کہ غافل قوم کی سزا اٹل ہے۔ جنہیں سمجھنے اور سوچنے کی قابلیت دی گئی ہے وہ خوب جان لیں۔ قیامت کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔ غفلت کی سزا رسوائی کی موت ہے۔ ہندوستان کی جماعتوں نے دعووں کے مطابق کام نہیں کیا۔ ہندوستان کے مسلمان سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ لوگوں کی زندگی محض تخریبی اعتراضات کی زندگی ہے۔ وہ بھی قوم کے ساتھ سزا بھگتیں گے۔ وہ احرار کارکن جو دفتروں اور گھروں میں میٹھے بلند خیالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ان تھک کارکن کی بے تاب روح جسم میں نہیں رکھتے۔ یہاں تو قوم کے ساتھ مل کر سزا اٹھائیں گے ہی۔ مگر آخرت میں بھی رسوا ہوں گے۔ قوم کے خیالات کو سمجھ کر ایک منٹ غافل بیٹھ جانے والا آخرت کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ میں مانتا ہوں کہ بیس ۲۰ برس سے ہم احرار غربت کی چکی میں پیسے جا رہے ہیں۔ باوجود اس کے میں مسلمانوں کی عدم تیاری میں اپنی جماعت کو مورد الزام ٹھیراتا ہوں۔ بے شک ہمیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تاہم یہ

مشکلات ایسی زیادہ نہیں جن سے احرار کارکن عہدہ برآنہ ہوسکیں۔ جن پر مشکلات کم ہیں۔ میں ان ہی کو زیادہ غافل دیکھتا ہوں۔ ایک ماسٹر تاج الدین نہیں ہزاروں ماسٹر تاج الدین جماعت میں موجود ہیں۔ ان کی تھوڑی سی غفلت نے مسلمانوں کے بڑے کام بگاڑے ہوئے ہیں۔ ہماری بے ہمتی نے ہماری تحریکات کو شہروں میں محدود کر رکھا ہے۔ اور شہروں کے عوام کے دلوں پر بھی پورا قبضہ نہیں۔ اس پر بھی ہم اپنے کام سے مطمئن ہیں۔ چھوڑو اور جماعتوں اور لوگوں کو۔ وہ جماعتیں اوپر کے طبقے کی نمائندہ ہیں۔ ان کی سرگرمی کا حلقہ محدود ہے۔ مگر احرار ۹۹ فی صدی غریب لوگوں پر مشتمل اسلامی آبادی کے نمائندہ ہیں۔ انہوں نے ابھی ایک فی صدی غرباء تک بھی اپنا پیغام نہیں پہنچایا۔ امراء ہمارے خالص اسلامی نصب العین سے بیزار ہیں۔ وہ لوگ جتنا ہم سے بیزار ہوں ہم پر خدا کی رحمت۔ لیکن کیا غریب احرار دوستو! اتنا سوچو گے کہ سب غریبوں تک پہنچنا ان کو زندگی۔ نئی زندگی اور سچی زندگی کا پیغام دینا کیا تمہارا کام نہیں؟ تم تو اس قیامت کی گھڑی میں کچھ غافل سے ہو۔ کس اونچے مقام پر چڑھ کر تمہیں پکارا جائے کہ تم سُن کے بے تاب ہو جاؤ اور آتش بجاں مجاہد کی طرح مستعد ہو کر کام کے لیے میدان میں نکلو؟

کشمیر اور کپورتھلہ

کشمیر کی تحریک میں اگرچہ ہم نصب العین کے حصول میں ناکام رہے۔ لیکن اس نصب العین کو مدنظر رکھ کر کام کرنے والی جماعت وہاں موجود ہے۔ لیکن کپورتھلہ میں ہمارا کام برباد ہو چکا ہے۔ ہم نے بڑی غلطی کھائی جو چودھری عبدالعزیز کو ریاستی کمیٹی میں شمولیت کی اجازت دے دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے تعاون اور اعتماد کی سپرٹ پیدا ہو گئی۔ یہ سپرٹ کمزوروں کے لیے مرض مہلک ہے۔ جب زبردست ہوں تو زبردست سے گلوخلاصی کرانے کے لیے جدوجہد جاری رکھنا ہی دانشمندی ہے۔ اگر بین الاقوامی مطلع تیرہ و تار نہ ہوتا۔ اور اس سے بلاخیز بجلیاں تڑپتی نظر نہ آتیں۔ تو شاید احرار کو اس ادھورے کام کو پورا کرنے میں جلدی کرنا ہوتا۔

لیڈر، سینما ستاروں کی طرح تب تک ہر دل عزیز رہتے ہیں جب تک وہ لوگوں کی نظروں میں آتے رہیں۔ جہاں فلم پرانا ہوا۔ اور نئی فلموں میں نئے ایکٹر آ گئے۔ پہلے فلم سٹاروں کا ستارہ غروب ہوا۔ کبھی کوئی بھولے سے بھی یاد نہیں کرتا۔ سیاسیات میں آ کر گھر بار کی ساری مصروفیتیں چھوڑنا پڑتی ہیں۔ ورنہ سارا کیا برباد ہو جاتا ہے۔ اگر ایک آدھ سال لوگوں کی

نظروں سے اوجھل ہو جائے تو لوگ لیڈر کو بھول جاتے ہیں۔ اس لیے جو سیاسیات میں آئے۔ اور پالیٹکس کو اوڑھنا بچھونا بنائے۔ اگر ساتھ گھر کی مصروفیتیں بھی لگی رہیں۔ تو یہ امراء کا پالیٹکس ہے یا غریب احرار مزدوروں کی مجبوری جس کو ذرا گنجائش حاصل ہے اس کی کام سے ایک لمحہ علیحدگی جماعت کی ہر دل عزیزی میں کمی کرنے کے برابر ہے۔ ہم سب نے اور چودھری عبدالعزیز نے اپنی مصروفیتوں اور ریاست کی آئینی کمیٹی میں شمولیت کے باعث ریاست کپورتھلہ کے کام کو نظر انداز کر کے بڑی بھاری ذمہ داری اپنے سر لی۔ جالندھر کی مجلس احرار کو اپنے ضلع اور ریاست دونوں کی تنظیم کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔

ریاست کے عوام کا بھی اس میں کچھ قصور ہے۔ مہاراج بہادر خواہ کتنے شریف کیوں نہ ہوں، وہ ریاست کے سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی حقیقی تبدیلی تب تک نہیں کر سکتے۔ جب تک عوام میں جان نہ آئے اور جب تک مضبوط جتھہ بندی کر کے حکومت کے افسروں کے تشدد کا مقابلہ نہ کریں۔ رئیس تو خود ان عمّال کے دست نگر ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی رئیس کی شخصی عزت کے علاوہ اگر لوگوں کے دل میں زیادہ جذبہ عقیدت ہوگا۔ تو یہ اُن کے اپنے مفاد کے خلاف بات جائے گی۔

جب مہاراج نے چودھری عبدالعزیز کو رہا کر کے میاں صاحب کو چلتا کیا۔ تو ریاستی عوام کی عقیدت بڑھ گئی۔ یہی عقیدت ان کو پھر غافل کرنے کا باعث ہوئی۔ یہی حکمران کی ساحری ہے جو جاگنے والوں کو سلا دیتی ہے۔ اور لوگوں کو آقا کا غلام بنائے رکھتی ہے۔

بہرحال اب تو زمانہ وہ آ گیا ہے۔ جب ایجی ٹیشن یا تحریکوں کا سوال کم ہے۔ نظام مضبوط کر کے آگے آنے کا وقت ہے غافل قومیں ماری جائیں گی۔ ہوشیار محنتی اور اسباب فراہم کرنے والی قومیں دنیا میں زندہ رہیں گی۔ جو بزدل جان بچائے گا یا کام سے جی چرائے گا وہ اپنی ماں بہنوں کی عزت پر ہاتھ ڈالے گا۔

بابِ چہارم

فتنۂ قادیان

لوگ بجا طور پر پوچھتے ہیں۔ کہ احرار کو کیا ہو گیا۔ کہ مذہب کی دَل دَل میں پھنس گئے۔ یہاں پھنس کر کون نکلا ہے جو یہ نکلیں گے؟ مگر یہ کون لوگ ہیں؟ وہی جن کا دل غریبوں کی مصیبتوں سے خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ مذہب اسلام سے بھی بیزار ہیں۔ اس لیے کہ اس کی ساری تاریخ شہنشاہیت اور جاگیرداری کی دردناک کہانی ہے۔ کسی کو کیا پڑی کہ وہ شہنشاہیت کے خس و خاشاک کے ڈھیر کی چھان بین کر کے اسلام کی سوئی کو ڈھونڈے تاکہ انسانیت کی چاک دامانی کا رفو کر سکے؟ اس کے پاس کارل مارکس کے سائنٹی فک سوشلزم کا ہتھیار موجود ہے۔ وہ اس کے ذریعے سے امراء اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے اسلام کی اتنی لمبی تاریخ میں سے چند سال کے اوراق کو ڈھونڈ کر اپنی زندگی کے پروگرام بنانے کی فرصت کہاں؟ سرمایہ داروں نے ان برسوں کی تاریخ کے واقعات کو سرمایہ داری کے رنگ میں رنگا اور مساواتِ انسانی کی تحریک جس کو اسلام کہتے ہیں۔ مذہبی لحاظ سے عوام کی تاریخ نہ رہی۔ اور نہ اس میں کوئی انقلابی سپرٹ باقی رہی۔ عامۃ المسلمین، امیروں، جاگیرداروں کے ہاتھ میں موم کی ناک بن کر رہ گئے۔ ہندوستان میں اس وقت بھی وہ سب سے زیادہ مفلوک الحال مگر حال مست ہیں۔ انہیں اپنے حال کو بدلنے کا کوئی احساس نہیں یہ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ خود علمائے مذہب انقلابی سپرٹ سے ناآشنا ہیں اور وہ اب تک مذہب کی اُموی اور عباسی عقائد

کے مطابق تشریح کر رہے ہیں۔

تاہم کسی کی بے خبری یا کسی گروہ کا تعصّب واقعات کو نہیں بدل سکتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دور کے انقلابی تھے۔ درانتی اور کلہاڑا تو اب مزدوروں کی نشانی بنا۔ لیکن جس نے سرمایہ داری پر پہلے کلہاڑا چلایا۔ اور قومی امتیاز کے ان ریشوں کو کاٹ کر رکھ دیا جس نے انسان کو انسان سے علیحدہ کر دیا تھا۔ صرف سرمایہ ہی طبقات پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ انسانوں میں گروہ بندی کرنے والے اور بھی محرکات ہیں۔ ان سب سے بڑا ذریعہ مختلف نبیوں پر ایمان ہے۔ قومیں خدا پر ایمان کے نزاع پر مختلف نہیں بلکہ مختلف نبیوں پر ایمان لانے کے باعث الگ الگ ہیں پہلے آمد و رفت کے وسائل کی کمی کی وجہ سے ہر ملک ایک الگ دنیا تھی۔ الگ الگ پیغمبروں کے ذریعے ہر ملک کی روحانی تربیت ضروری تھی۔ ایک ملک میں بیٹھ کر سب ملکوں میں پیغام پہنچایا جا سکتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہوا۔ آپ نے لَانَبِیَّ بَعْدِیْ (میرے بعد کوئی نبی نہیں) کا اعلان کر کے دنیا کو اتحاد کا مژدہ سنایا۔ کہ آئندہ نبیوں کی بنا پر قوموں کی تربیت ختم ہو گئی۔ آؤ ایک محکم دین کی طرف آؤ یہ سب کے حالات کے مطابق ہے۔ اسلام تمہارے سارے عوارض کا مکمل نسخہ ہے۔ زمانے نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بتدریج دُور دُور کے ملک آمد و رفت کے سلسلوں میں آسانیوں کے باعث نزدیک تر ہوتے گئے۔ اب تو دور دراز ملک ایک شہر کے محلوں سے بھی قریب معلوم ہونے لگے ہیں۔ اس لیے ملک ملک کے لیے علیحدہ پیغامبر کی ضرورت نہ رہی تھی۔

اب انسانی دماغ کافی نشو و نما پا چکا تھا۔ لوگ اپنا بھلا برا خود سمجھنے لگے۔ اب ایک سچائی پیش کرنا کافی ہے۔ باقی معاملہ لوگوں کی سمجھ پر چھوڑ نا کفایت کرتا ہے۔ مذہب کی سچائی اب سمجھ سے بالا نہیں۔ بلکہ تعصب کے باعث اسے قبول کرنے میں دقت ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آتے ہی اہلِ دنیا کی عقل اور علم نے حیرت انگیز ترقی کی۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے معنی یہ تھے کہ اب انسانیت سنِ شعور کو پہنچ چکی ہے۔ اب کسی سکول ماسٹر کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ دنیا کے حالات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ سچی اور جھوٹی بات میں فرق کر کے وہ صحیح راہ تلاش کر سکتے ہیں۔ اب مکمل سچائی یعنی اسلام ہم تک پہنچ گیا۔ اب کسی نبی کی ضرورت نہ رہی۔ اگر ہم نبوت کا سلسلہ ابھی تک جاری مان لیں تو پھر مختلف نبیوں پر ایمان کے باعث قوموں، ملکوں پر اور انسانیت میں تقسیم در تقسیم

کا عمل جاری رہے گا۔ پہلے تو ملک ملک ایک الگ دنیا تھی۔ الگ الگ نبیوں کی ضرورت تھی۔ اب جب دنیا سمٹ کر ایک کنبہ میں رہتی ہے۔ تو نبوت کے مختلف دعویداروں کا آنا دنیا کو تقسیم بلا ضرورت کرنے سے کم نہ تھا۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا لا نبی بعدی کا ارشاد دنیا کے لیے رحمت کا پیغام اور انسانیت کے لیے خوش خبری تھی۔

ہندوستان کی سرزمین عجیب ہے۔ قادیان میں مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ ۳۰، ۴۰ برس مسلمانوں کی توجہ تعمیری کاموں کی بجائے اس مُتنبّی کی طرف لگی رہی۔ ایک حصہ کٹ کے الگ ہو گیا۔ انگریزی حکومت کے زیر سایہ جہاں چھوٹے بڑے راجے نواب پرورش پا کر سرکار کے گن گاتے ہیں اسی طرح حکومت کو اعتراض نہ تھا۔ اگر متعدد نبی اور کئی ایک سرکاری ولی پیدا ہو کر ان کے دعا گو بنے رہیں۔ انہیں امور سلطنت میں سہولت درکار تھی۔ مسلمانوں کو قابو میں رکھنے کی تدبیروں میں سے یہ بھی حکومت انگریزی کی کارگر تدبیر تھی کہ روحانی اداروں پر ان کے ہوا خواہ قابض ہوں۔ اور یوں سرکار انگریزی کی وفاداری مسلمانوں کا جزو مذہب بن جائے۔ پنجاب اور سندھ میں ہر پیرخانہ سرکاری تعلق داری اور وظیفہ خواری پہ پرورش پا رہا ہے۔ یہ تو پیر تھے۔ مگر حکومت کو قادیان کا پیغمبر ہوا خواہی کے لیے مل گیا۔ مسلمان سیاسی اور مذہبی طور پر انگریزی غلامی پر مطمئن ہو گئے۔ مسلمانوں کی موجودہ مدہوشی کی بڑی وجہ انگریز کی یہ کامیاب تدبیر ہے۔ پھر تو ساری اسلامی آبادی حکومت کی منقولہ جائداد بن کے رہ گئی تھی۔ جہاں سے اٹھائیں جہاں ڈالیں۔ مخالفت کی ایک آواز نکالنا مشکل تھی۔ انگریزی حکومت کی سب سے زیادہ حمایت قادیان کی جماعت کو حاصل تھی۔ یہ تائید اتنی زیادہ تھی۔ کہ اکثر سرکاری محکموں میں وہ بہت اثر و رسوخ کے مالک ہو گئے۔ بعض جگہ تو سارے کا سارا ضلع ان کے اثر و رسوخ میں آ گیا۔ لوگ حکومت کی تائید حاصل کرنے کے لیے قادیانی کی تائید حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی تو الگ رہا قادیانی مرزائی حکومت کو تفصیلی خبریں پہنچاتے تھے۔ حکومت وقت کے خلاف آزادی کی ہر آواز کو دبانے کے لیے اس جماعت کے افراد سب سے پیش پیش تھے۔ اسی لیے لوگ قادیانی آوازہ کو حکومت کی آواز کی صدائے باز گشت سمجھتے تھے اور بے حد خائف تھے۔ یہ لوگ معمولی آئینی ایجی ٹیشن کو بڑھا چڑھا کر سرکار کے دربار میں بیان کرتے تھے۔ انتخابات میں حال یہ تھا۔ کہ ہر امیدوار قادیان کی حمایت حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ جسے یہ تائید حاصل ہو گئی اسے گویا سرکاری تائید حاصل ہو گئی۔ پس قادیانی تحریک کی مخالفت سیاسی اور مذہبی دونوں وجوہات کی بنا پر تھی۔ جس اسلامی جماعت نے مسلمانوں کو آزاد اور توانا قوم دیکھنے کا ارادہ کیا ہو۔ اسے سب سے پہلے اس جماعت سے

ٹکرانا ناگزیر تھا۔ اس جماعت کے اثر و رسوخ کو کم کیے بغیر آزادی کا تصور کرنا ممکن نہ تھا۔ شاید ہماری آئندہ نسلیں قادیانیوں کے خلاف ہماری جدوجہد کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں اس طرح کی غلطی کھائیں جس طرح مذہب سے بیزار اور اشتراکیت کا ابتدائی کھا رہا ہے۔ تعجب ہے کہ اقتصادی مساوات کے حامی لوگ صرف ہمارے مذہبی رجحانات کو دیکھتے ہیں۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ احرار سرمایہ داری کے مضبوط قلعے پہ حملہ آور ہیں۔

خدا سے انکار بھی مذہب کی شاخ ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان کا مذہب آشنا طبقہ احرار کی قادیان کے خلاف جدوجہد کو استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہاں ایک طبقہ ہمیں مذہبی دیوانہ اور خود کو فرزانہ قیاس کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ مذہب افیون ہے۔ اس سے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اور زندگی کے اصل مسائل کو سمجھنے کی قابلیتیں اور کامیاب جدوجہد کی فرصتیں کم ہو جاتی ہیں۔ مگر مذہب کیا ہے؟ خدا کے متعلق ایک خاص تصور اور عقیدہ۔ کوئی گروہ اس کا اقرار کر کے مذہبی ہے کوئی انکار کر کے۔ منکر خدا بھی تو خدا کے متعلق سوچتا ہے وہ خدا کے اقراری کے خلاف ایسے ہی جذبات رکھتا ہے جیسے منکر خدا کے متعلق خدا کو ماننے والے۔ پس نفی و اثبات کی عملی دنیا میں بحث فضول ہے کیونکہ ذہنی اعتبار سے دونوں کے خیالات کا مرجع و مرکز خدا ہی ہے سب اسی کے متعلق نفی اور اثبات میں سوچتے ہیں۔ اس لیے ہمیں مذہبی دیوانہ کہنے والے خود بھی اسی طرح خطاب کیے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن عمل کی دنیا میں جو کمزور ہے وہ بے شک اپنے مذہب میں کمزور ہے۔ پس احرار اسلام کو دنیا و آخرت کی سیدھی راہ سمجھتے ہیں۔ مذہبی دیوانہ ہونا ہمارے لیے کچھ چڑ نہیں بشرطیکہ عمل کی دنیا میں ہم مبارک سپاہی ثابت ہوں۔ اگر ہم کام چور اور بے ہمت ہیں تو بے شک مذہب اسلام کے افیونی ہونے کا ہم ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔ احرار پختہ عمل مذہب کے دیوانے ہیں۔ وہ ہم جانتے ہیں کہ سرکاری نبی اور سرکاری ولی اس دور میں کیوں پیدا ہو رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ مسلمانوں میں ذہنی انتشار اور نئے نئے گروہ پیدا کرنے کا باعث ہوں اور کہیں مسلمانوں کی قوت ایک مرکز پہ جمع نہ ہونے پائے۔

نئی نبوت کے دعوے کے ساتھ مسلمانوں کا ایک حصہ مستقل طور پر کٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ مرزائیوں کا کیا حال ہے؟ وہ سب مسلمان کہلانے والوں کو کافر کہتے ہیں۔ اور ہر دم ان کی بیخ کنی کے درپے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو کافی نہیں سمجھتے جو مرزا صاحب پر ایمان نہ لائے۔ ان کے لیے وہ مسلمان بھی یہودی اور عیسائی کی طرح ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو قریبی دشمن سمجھتے ہیں جس کو سب سے پہلے نیچا دکھانا وہ اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری قیاس کرتے ہیں۔ اگر ان کے مسلمانوں کے ساتھ باہم روابط ہیں تو وہ اس لیے کہ سیاسی طور سے مسلمانوں کا جزو بنے رہنا ان کو بے حد مفید ہے۔ اگر مسلمانوں سے علیحدہ رہیں تو ہندوستان میں انہیں کوئی دو کوڑی کو نہ پوچھے۔ اب وہ اکثر سرکاری محکموں میں نمایاں حیثیتوں میں نظر آتے ہیں۔ مرزائی ہم مسلمانوں سے سیاسی اتحاد رکھنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی ملازمتوں اور ریاست پر قبضہ رہے۔ اور ان کی جڑ کاٹنے میں بھی آسانی ہو۔ عیسائی گو اہل کتاب ہیں۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کے باعث ہم ان کو مذہبی لحاظ سے مخالف گروہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مرزائیوں کا ہمارے متعلق قیاس ہے۔

اس زمانے میں ہر قوم یہ حق سمجھتی ہے کہ اپنے اندر ففتھ کالم سے خبردار رہے اور ان کی سازشوں سے بچے ان کی میٹھی میٹھی باتوں اور ان کی ہمدردیوں سے دھوکہ نہ کھائے کھلے دشمن کا مقابلہ آسان ہے مگر بغلی گھونسوں کا کوئی علاج نہیں بجز اس کے کہ انسان ہر وقت چوکس رہے۔ ہم مرزائیوں کے بحیثیت انسان مخالف نہیں نہ ان کی عزت و آبرو کے دشمن ہیں۔ البتہ ان کی مضرّت سے بچنا اپنا قدرتی حق سمجھتے ہیں۔

مرزائیت میں اگر فاش خامیاں نہ بھی ہوتیں اور وہ غلط دعووں کا عبرت انگیز مرقع نہ بھی ہوتی تو بھی نبوّت کا دعویٰ بجائے خود اسلام پر ضرب کاری اور مسلمانوں میں انتشار عظیم پیدا کرنے کا سبب ہے۔ اس دعوے کے ساتھ ہی یہ گروہ مسلمانوں کی کڑی نگرانی کا سزاوار ہو جاتا ہے پس ہم نے دیکھا کہ مرزائی لوگ

۱۔ برٹش امپیریلزم کے کھلے ایجنٹ ہیں۔

۲۔ وہ اعلیٰ طبقہ کا ذہن رکھتے ہیں۔ ارد گرد کی غریب آبادی کا بائیکاٹ کرنا اور دوسرے ذریعوں سے انہیں مرعوب کرنا ان کا دھندا ہے۔

۳۔ وہ مسلمانوں میں ایک نئی گروہ بندی کے طلب گار ہیں۔ جو مسلمانوں کی جمعیت کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ دے گی۔

۴۔ وہ مسلمانوں میں بطور ففتھ کالم کام کرتے ہیں۔

اکثریت کے ارادے مخفی نہیں ہوتے۔ مگر کمزور اقلیتوں کے لیے جو اکثریت کے خلاف محاذ بنانا چاہیں ضروری ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو مخفی رکھیں۔ ان احتمالات کے پیش نظر خیال آتا تھا کہ ان مخالفین اسلام کی نگرانی ضروری ہے۔ قادیان میں مسلمان پر مظالم کی دل خراش داستان متواتر ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ مرزائی لوگ باہر سے آکر دھڑا دھڑ وہاں آباد ہو رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے اور غریب ہونے کے باعث مسلمانوں پر باہر سے آتے ہوئے سرمایہ دار مرزائی عرصۂ حیات تنگ کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ قادیانی خلیفہ کے ایما پر ہو رہا تھا۔ تمام ہندوستان کے علماء فتویٰ بازی تو کرتے تھے۔ مگر مقابلے کی جان نہ تھی۔ بٹالہ ضلع گورداسپور میں درد دل رکھنے والے مسلمانوں نے "شبّان المسلمین" نام کی ایک جماعت بنائی۔ علماء کو اکٹھا کرتے رہے۔ سالانہ اجلاس کے اختتام پر قادیان بھی ایک دن گئے۔ ان علماء کا قادیان جانا سرکاری نبوت کے حاملوں کو ایک آنکھ نہ بھایا دوسرے سال انہوں نے مار پیٹ کی پوری تیاری کر لی۔ چنانچہ مرزائی نوجوان بوڑھے علماء پر ٹوٹ پڑے لاٹھیوں کا مینہ برسایا۔ ان کا بند بند توڑا۔ کس کی رپٹ کہاں کی رپورٹ، تھانہ مرزائیوں کا دبیل تھا۔ داد رسی کی کیا توقع تھی، یہ بیچارے جوں توں کر کے بٹالہ پہنچے۔ جو قیامت ان پر گذری تھی اس کی داستان درد لوگوں کو سنائی پھر کئی سال کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ کوئی عالم دین قادیان مارچ کرے۔

احرار کا قادیان میں داخلہ

اکتوبر ۱۹۳۴ء

جس طرح بے کسی کشمیر کی غریب آبادی کی مصیبتوں کو دیکھ کر فریاد و فغاں کر رہی تھی۔ اور ہم اس کے دردناک نالوں کو سن کر اٹھے۔ اسی طرح ہم نے قادیان کے تباہ حال اور ستائے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی پکار کو سن کر کان کھڑے کیے۔ قادیان کے مرزائی سرمایہ داروں کو یقین تھا۔ کہ زمین کے دردناک نالے آسمان کے خداوند تک نہیں پہنچتے۔ انہیں دنیا کے خداوندوں کا سہارا تھا اور وہ من مانی کارروائیاں اسی لیے کرتے تھے کہ حکام تک ان کی رسائی تھی۔ لیکن دیکھو یوں معلوم ہوا کہ گویا آسمان کے خداوند نے کہا کہ اے ارباب غرور یہ تمہاری

متشددانہ زندگی کی انجیل کے اوراق اب بند ہو جانے چاہئیں۔ پس اس نے جھوٹے مسیحا اور اس کے حواریوں کے مظالم کو روکنے کے لیے ایک خاک نشینوں کی جماعت کے دل میں تحریک کی جس نے چند نوجوان والنٹیروں کو قادیان میں بھیجا تاکہ مسلمانوں کی مساجد میں جا کر نماز ادا کریں۔ لیکن ایسا نہ کرنا کہ کہیں مرزائیوں کی مسجد میں جا گھسو اور مرزائیوں کو تم پر تشدد کا معقول بہانہ مل جائے۔ لیکن قادیانی مرزائیوں کو مسلمانوں کی مسجد میں آوازہ اذان کی برداشت کہاں تھی۔ مسلمانوں پر ان کا لاٹھی کا ہاتھ رواں تھا ہی آنے اور لاٹھی کے جوہر دکھانے لگے۔ بے دردوں نے لاٹھیوں سے احرار والنٹیروں کو اس قدر پیٹا کہ پناہ بخدا۔ بزدل دشمن قابو پا کر ایسے ہی غیر شریفانہ مظاہرے کرتا ہے۔ والنٹیر جان سے بچ گئے مگر مدت تک ہسپتال میں پڑے رہے۔ اس کے بعد احرار نے بٹالہ میں کانفرنس کر کے حکومت اور قادیانی ارباب اقتدار کو للکارا۔ مرزائیوں اور سرکار نے سمجھا کہ احرار کی خاک میں شعلے کہاں۔ پر وہ آنک نہ کی کسی مرزائی کی گرفتاری عمل میں نہ آئی۔ لیکن اتنا ہوا کہ رپورٹروں نے حکام اور مرزائی صاحبان سے کہہ دیا کہ "احرار کی کشمیر کی یلغار کو سامنے رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ گڑھ میں سوار نکل آئیں۔ احرار جس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، پھر پیچھا نہیں چھوڑتے اور ہموار کر کے دم لیتے ہیں۔" مار کھا کے چپکے بیٹھ جانا شریفوں کا شیوہ نہیں۔ اس لیے جولائی ۱۹۳۵ء میں امرتسر میں ورکنگ کمیٹی ہوئی۔ فیصلہ ہوا کہ جو ہو سو ہو۔ احرار کا قادیان میں مستقل دفتر کھولنا چاہیے۔ معلوم کیا کہ ہم میں کون ہے جو علم میں پورا اور عمل میں پختہ ہے۔ جو موت کی مطلق پروا نہ کرے۔ اور اللہ کا نام لے کر کفر کے غلبے کو مٹانے کے عزم سے اس جگہ اقامت اختیار کرے اور مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں کی نگرانی کرے۔ خدا نے مولانا عنایت اللہ کو توفیق دی۔ وہ شادی شدہ نہ تھے۔ اس لیے جماعت کو یہ غم نہ تھا۔ کہ ان کی شہادت کے بعد کنبہ کا بوجھ اٹھانا ہے اور بچوں کی پرورش کا سامان کرنا ہے۔

مولانا عنایت اللہ

غرض خطرات کے ہجوم میں مولانا کو دفاع مرزائیت کا کام سپرد کیا گیا۔ دارالکفر میں اسلام کا جھنڈا گاڑنا معمولی سی اولوالعزمی نہیں تھی۔ افسوس مسلمانوں نے دنیا کے لیے زندہ رہنا سیکھ لیا ہے۔ اور ان کے سارے تبلیغی ولولے سرد پڑ گئے ہیں۔ اب جب کہ فتنہ مرزائیت نے سر اٹھا لیا تو انہوں نے کوئی مصلحت اختیار کی۔

باوجودیکہ مرزائی مسلمانوں کو صریح کافر کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جنازہ تک پڑھنے کے روادار نہ تھے۔ لیکن لوگ انہیں انگریز کا بچہ کر منہ نہ آتے تھے۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے تو حد کر دی تھی۔ وہ اس خانہ برانداز قوم کا تعاون حاصل کرنے کو حصول ملازمت کا ضروری مرحلہ خیال کرتے تھے۔ بہت ہیں جنہوں نے دنیا حاصل کرنے کے لیے دین کو فروخت کر دیا۔ دین فروشوں کا گروہ ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ قوموں کے زوال میں اس گروہ کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مرزائی لوگ انسانی فطرت کی اس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھاتے رہے۔ ضلع گورداسپور کے سارے حکام ان کا اس وجہ سے پانی بھرتے تھے کہ قادیانی گمراہوں کی رسائی انگریزی سرکار تک ہے۔ ضلع کے حکام کے ذریعہ عوام کو مرعوب کرنا۔ سرکار کا وفادار فریق بنا کر تعلیم یافتہ لوگوں کو ملازمتوں کے سبز باغ دکھانا ان کا کام تھا۔ انگریزی سلطنت کی مضبوطی کو دیکھ کر اور سرکار سے مرزائیوں کا گٹھ جوڑ دیکھ کر کسی تبلیغی جماعت کا حوصلہ نہ تھا کہ وہ خم ٹھونک کر میدان مقابلہ میں نکلتی۔ اللہ نے احرار کو توفیق دی کہ وہ حق کا علم لے کر کفر کے مقابلے میں نکلے۔ مرزائی متعدد قتل کر چکے تھے۔ قادیان میں انہیں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ مولانا عنایت اللہ کو دفتر لے دیا گیا۔ قادیان میں احرار کا جھنڈا لہرانے لگا۔ سرخ جھنڈے کو دیکھ کر مرزائی روسیاہ ہو گئے۔ آہ ان کے سینوں کو توڑتی نکل گئی۔ یہ ان کی آرزوؤں کی پامالی کا دن تھا۔ مرزائیوں نے اپنی امیدوں کا جنازہ نکلتے دیکھا۔ تو سر پیٹنے لگے۔ سرکار کی دہلیز پر سر دھر کر پکارے۔ حضور قادیان مرزائیوں کی مقدس جگہ ہے۔ احرار کے وجود سے یہ سرزمین پاک کر دی جائے! جب مرزائیت نصرانیت کا آسرا ڈھونڈھنے نکلی تو ہم نصرانیوں اور قادیانیوں کے اتحاد سے ڈرے ضرور مگر خدا کو حامی و ناصر سمجھ کر اس کے تدارک میں لگ گئے۔ ڈرنا اور ہمت ہار دینا عیب ہے۔ ڈرنا اور پہلے سے زیادہ چوکنے ہو کر مقابلہ کرنا بڑی خوبی ہے۔ بساط سیاست پر نزدیک کو بڑھا کر اس کو تنہا چھوڑنا غلطی ہوتی ہے۔ ہم نے اول ان احباب کی فہرست تیار کر لی جو مولانا عنایت اللہ کی شہادت کے بعد یکے بعد دیگرے یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹے کے اندر قادیان پہنچ جائیں۔ کیونکہ مرزائیوں نے قادیان کو قانونی دسترس سے پرے ایک دنیا بنا رکھا تھا۔ جہاں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں پر بلا خطا مظالم توڑے جاتے تھے۔ قتل ہوتے تھے مگر مقدمات عدالت تک نہ جا سکتے تھے۔ دوسرے ہم نے فوراً مولوی عنایت اللہ کے نام قادیان میں مکان خرید دیا تاکہ مرزائیوں اور حکام کا یہ عذر بھی جاتا رہے کہ مولوی صاحب موصوف ایک اجنبی ہیں۔ اور ان کا قادیان سے کوئی تعلق نہیں۔ تیسرے قادیان کی تقدیس کے دعوے کو باطل کرنے کے لیے ہم نے "احرار تبلیغ کانفرنس"

کی سیاہی مرزائیت کے لیے قدرت کا انتقام بن کر کاغذ پر پھیلی۔ اور مرزائیت کے چہرے پر نہ مٹنے والے داغ چھوڑ گئی۔ ہر چند انہوں نے ہائی کورٹ میں سرسٹیپر جیسے مقنّن کی معرفت چارہ جوئی کی تاکہ مسٹر کھوسلے کے فیصلے کا داغ دھویا جائے۔ مگر انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ مرزائی آج تک یہی سمجھتے تھے کہ قدرت ظلم تارہ اکا انتقام لینے سے قاصر ہے۔ مگر اس فیصلہ نے ثابت کر دیا کہ خدا کے حضور میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

اس فیصلہ کو تاریخ احرار میں خاص اہمیت حاصل رہے گی۔ در اصل یہ فیصلہ مرزائیت کی موت ثابت ہوا۔ جس غیر جانب دار نے اس کو پڑھا وہ مرزائیت کے نقش ونگار کو دیکھ کر اس سے نفرت کرنے لگا۔ علامہ سر اقبال اور مرزا امیر ظفر علی کے بیانات نے بھی تعلیم یافتہ طبقے کے رجحانِ خیال کو بدل دیا۔ الیاس برنی نے قادیانی مذہب لکھ کر مرزائیت کے مقابلے میں اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ مسٹر کھوسلہ نے جو مرزائیت کے قلعے پر بم پھینکا۔ اس نے کفر کے اس قلعے کی بنیادیں ہلا دیں۔ ان قلعہ بندیوں کو مسمار کرنے میں آسانی ہو گئی۔ جہاں چار مرزائی بیٹھے ہوں۔ ان میں مسٹر کھوسلہ کا فیصلہ پھینک دو۔ یہ بم پھینکنے کے برابر ہوگا۔ وہ سراسیمہ ہو کر بھاگ جائیں گے۔

مسٹر کھوسلے کا فیصلہ

مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب کے تاریخی مقدمہ میں ان کی اپیل پر مسٹر کھوسلہ سیشن جج گورداسپور نے بزبان انگریزی جو فیصلہ صادر کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے

مرافعہ گزار سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ الف کے ماتحت مجرم قرار دیتے ہوئے اس تقریر کی پاداش میں جو انہوں نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو تبلیغ کانفرنس قادیان کے موقعہ پر کی چھ ماہ کی قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔

"مرزا اور مرزائیت"

مرافعہ گزار کے خلاف جو الزام عاید کیا گیا ہے۔ اس پر غور وخوض کرنے کے قبل چند ایسے حقائق و واقعات بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا تعلق امور زیر بحث سے ہے۔ آج سے تقریباً پچاس سال قبل قادیان

قادیان کا اعلان کیا اس پر تو گویا قادیانی ایوان میں زلزلہ آ گیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مرزائی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور سر حکّام کے پاؤں پر رکھ دیا۔ کہ تمہاری خیر ہو ہماری خبر لو کہ خانہ خراب ہوا جاتا ہے۔ ہم سے کہا گیا کہ کانفرنس سے باز رہو۔ قادیان میں مرزائیوں کی اکثریت ہے۔ اقلیت کا حق نہیں کہ ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے۔ ہم نے حکّام کو جواب دیا۔ سوائے قادیان کے مرزائیوں کی اکثریت کہاں ہے۔ سوائے قادیان کے سب جگہ ان کی تبلیغ بند کر دی جائے۔ اس جواب معقول سے وہ لاجواب ہو گئے مگر رخنہ اندازیوں میں برابر مصروف رہے۔ مگر اٹھایا ہوا قدم واپس نہ ہو سکتا تھا۔ حکومت نے سراسر ناانصافی سے بچنے کے لیے کہا کہ کانفرنس کرو لیکن مسلّح ہو کر قادیان میں داخل نہ ہو اس میں ہمیں عذر کیا تھا۔ کانفرنس کی کامیابی نے دوست اور دشمن کو حیران کر دیا۔ مرزائی تو جل گئے۔ اور جلدی جلدی حکّام کے پاس پہنچے کہ لو سرکار! بخاری نے دل کا بخار نکالا۔ بڑے مرزا صاحب کی توہین کی چھوٹے مرزا کے الگ بخیے ادھیڑے اگر اب مدد نہ کی تو کب کام آؤ گے؟ سرکار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بخاری صاحب کو گرفتار کر کے عدالت میں لا کھڑا کیا۔

خدا کی حکمت گناہ گاروں کی عقل پر مسکراتی ہے۔ مرزائی تو احرار کو مرعوب کرنے کے لیے عطاء اللہ شاہ صاحب پر مقدمہ چلا رہے تھے۔ لیکن قدرت مرزائیت کے ڈھول کا پول کھولنے کے لیے بے تاب تھی خدا کی مہربانی سے مرزائیت کے خلاف وہ ثبوت بہم پہنچے کہ کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ہم میں ایسے ثبوت مہیا کرنے کی صلاحیت ہے۔ ہم نے اس مقدمہ میں مرزائیت کے مذہب و اعتقاد پر بحث نہیں کی بلکہ مرزائیت کے اور اعمال کو پیش کیا۔ جس سے ابتدائی عدالت بھی متاثر ہوئی۔ اگرچہ اس نے سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب کو چھ ماہ کی سزا دے دی۔ تاہم سننے والی پبلک پر گہرا اثر ہوا۔ سب کو یقین تھا کہ شہادت صفائی ایسی مضبوط ہے کہ یہ سزا بحال نہیں رہ سکتی۔ لیکن مرزائی ہیں کہ شاہ صاحب کی سزایابی پر پھولے نہ سماتے تھے۔ ان کے گھر میں گھی کے چراغ جلائے گئے لیکن سیشن جج مسٹر کھوسلہ نے مرزائیوں کی خوشیوں کو اپنے فیصلہ اپیل میں ماتم سے بدل دیا۔ اس نے وہ تاریخی فیصلہ لکھا جس سے اسے شہرت دوام حاصل ہو گئی۔ اس فیصلہ کا ہر حرف مرزائیت کی رگ جان کے لیے نشتر ہے۔

اس فیصلہ میں مسٹر کھوسلہ نے چند سطروں میں مرزائیت کی ساری اخلاقی تاریخ لکھ ڈالی۔ اس کے فیصلے کا ہر لفظ دریائے معانی ہے۔ اس کی ہر سطر مرزائیت کی سیاہ کاریوں اور ریاکاریوں کی پوری تفسیر ہے۔ مسٹر کھوسلہ کے قلم

کے ایک باشندے مسمّیٰ غلام احمد نے دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا کہ میں مسیح موعود ہوں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی اس نے اُسقفِ[1] اعظم کی حیثیت بھی اختیار کر لی اور ایک نئے فرقہ کی بنا ڈالی جس کے ارکان اگرچہ مسلمان ہونے کے مدعی تھے۔ لیکن ان کے بعض عقاید و اصول عام عقائد اسلامی سے بالکل متبائن تھے اس فرقہ میں شامل ہونے والے لوگ قادیانی یا مرزائی یا احمدی کہلاتے ہیں۔ اور ان کا ما بہ الامتیاز یہ ہے کہ یہ لوگ فرقہ مرزائیہ کے بانی (مرزا غلام احمد) کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

"قادیانیت کی تاریخ"

بتدریج یہ تحریک ترقی کرنے لگی۔ اور اس کے مقلدین کی تعداد چند ہزار تک پہنچ گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے مخالفت ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی اکثریت نے مرزا کے دعاوی بلند بانگ خصوصاً اس کے دعاوی تفوقِ دینی پر بہت ناک منہ چڑھایا۔ اور مرزا نے ان لوگوں پر کفر کا جو الزام لگایا۔ اس کے جواب میں ان لوگوں نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا۔ مگر قادیانی حصار میں رہنے والے اس بیرونی تنقید سے کچھ بھی متاثر نہ ہوئے اور اپنے مستقر یعنی قادیان میں مزے سے ڈٹے رہے۔

"قادیانیوں کا تمرّد اور شورہ پشتی"

قادیانی مقابلتاً محفوظ تھے۔ اس حالت نے ان میں متمرّدانہ غرور پیدا کر دیا۔ انہوں نے اپنے دلائل دوسروں سے منوانے اور اپنی جماعت کو ترقی دینے کے لیے ایسے حربوں کا استعمال شروع کیا جنہیں ناپسندیدہ کہا جائے گا۔ جن لوگوں نے قادیانیوں کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ انہیں مقاطعہ، قادیان سے اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی کروہ تر مصائب کی دھمکیاں دے کر دہشت انگیزی کی فضا پیدا کی۔ بلکہ بسا اوقات انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنی جماعت کے استحکام کی کوشش کی۔ قادیان میں رضاکاروں کا ایک دستہ (والنٹیر کور) مرتب ہوا۔ اور اس کی ترتیب کا مقصد غالباً یہ تھا کہ قادیان میں "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ" کا نعرہ بلند کرنے کے لیے طاقت پیدا کی جائے۔ انہوں نے عدالتی اختیارات بھی اپنے ہاتھ میں لے لیے،

[1] لاٹ پادری

دیوانی اور فوجداری مقدمات، کی سماعت کی۔ دیوانی مقدمات میں ڈگریاں صادر کیں۔ اور ان کی تعمیل کرائی گئی۔ کئی اشخاص کو قادیان سے نکالا گیا۔ یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ قادیانیوں کے خلاف کھلے ہوتے طور پر الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے مکانوں کو تباہ کیا۔ جلایا اور قتل تک کے مرتکب ہوئے۔ اس خیال سے کہ کہیں ان الزامات کو احرار کے تخیل ہی کا نتیجہ نہ سمجھ لیا جائے میں چند ایسی مثالیں بیان کر دینا چاہتا ہوں جو مقدمہ کی مسل میں درج ہیں۔

سزائے اِخراج

کم از کم دو اشخاص کو قادیان سے اخراج کی سزا دی گئی۔ اس لیے کہ ان کے عقاید مرزا کے عقاید سے متفاوت تھے۔ وہ اشخاص حبیب الرحمٰن گواہ صفائی نمبر ۲۸ اور مسمّیٰ اسمٰعیل ہیں۔ مسل میں ایک چٹھی (ڈی۔ زیڈ ۳۳) موجود ہے۔ جو موجودہ مرزا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور جس میں یہ حکم درج ہے کہ حبیب الرحمٰن (گواہ نمبر ۲۸) کو قادیان میں آنے کی اجازت نہیں۔ مرزا بشیر الدین گواہ صفائی نمبر ۳۷ نے اس چٹھی کو تسلیم کر لیا ہے۔ کئی اور گواہوں نے قادیانیوں کے تشدد و ظلم کی عجیب و غریب داستانیں بیان کی ہیں۔ بھگت سنگھ گواہ صفائی نے بیان کیا ہے کہ قادیانیوں نے اس پر حملہ کیا۔ ایک شخص مسمّیٰ غریب شاہ کو قادیانیوں نے زدوکوب کیا لیکن جب اس نے عدالت میں استغاثہ کرنا چاہا۔ تو کوئی اس کی شہادت دینے کے لیے سامنے نہ آیا۔ قادیانی ججوں کے فیصلہ کردہ مقدمات کی مسلیں پیش کی گئی ہیں (جو شامل مسل ہذا ہیں) مرزا بشیر الدین محمود نے تسلیم کیا ہے۔ کہ قادیان میں عدالتی اختیارات استعمال ہوتے ہیں۔ اور میری عدالت سب سے آخری عدالتِ اپیل ہے۔ عدالت کی ڈگریوں کا اجراء عمل میں آتا ہے اور ایک واقعہ سے تو ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ایک ڈگری کے اجراء میں ایک مکان فروخت کر دیا گیا۔ اسٹامپ کے کاغذ قادیانیوں نے خود بنا رکھے ہیں جو ان درخواستوں اور عرضیوں پر لگائے جاتے ہیں۔ جو قادیانی عدالتوں میں دائر ہوتی ہیں۔ قادیان میں ایک والنٹیر کور کے موجود ہونے کی شہادت گواہ نمبر ۲ مرزا شریف احمد نے دی ہے۔

عبدالکریم کی مظلومی اور محمد حسین کا قتل ۱۹۲۹ء

سب سے سنگین معاملہ عبدالکریم (ایڈیٹر مُباہلہ) کا ہے جس کی داستان دامنِ ذرد ہے۔ یہ شخص مرزا کے

مقلدین میں شامل ہوا۔ اور قادیان میں جاکر مقیم ہوگیا۔ وہاں اس کے دل میں مرزائیت کی صداقت کے متعلق شکوک پیدا ہوئے۔ اور وہ مرزائیت سے تائب ہوگیا۔ اس کے بعد اس پر ظلم وستم شروع ہوا۔ اس نے قادیانی معتقدات پر تبصرہ وتنقید کرنے کے لیے "مباہلہ" نامی اخبار جاری کیا۔ مرزا بشیر الدین محمود نے ایک تقریر میں جو دستاویز ڈی۔ زیڈ۔ ۱ الفضل مورخہ یکم اپریل ۱۹۳۰ء میں درج ہے (مباہلہ شائع کرنے والوں کی موت کی پیش گوئی کی ہے۔ اس تقریر میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جو مذہب کے لیے ارتکاب قتل پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اس تقریر کے بعد جلد ہی عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ لیکن وہ بچ گیا۔ ایک شخص محمد حسین جو اس کا معاون تھا۔ اور ایک فوجداری مقدمہ میں جو عبدالکریم کے خلاف چل رہا تھا۔ اس کا ضامن بھی تھا۔ اس پر حملہ ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ قاتل پر مقدمہ چلا اور اسے پھانسی کی سزا کا حکم ملا۔

محمد حسین کے قاتل کا رتبہ مرزائیوں کی نظر میں

پھانسی کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور اس کے بعد قاتل کی لاش قادیان میں لائی گئی۔ اور اسے نہایت عزت و احترام سے بہشتی مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ مرزائی اخبار "الفضل" میں قاتل کی مدح سرائی کی گئی۔ قتل کو سراہا گیا اور یہاں تک لکھا گیا کہ قاتل مجرم نہ تھا۔ پھانسی کی سزا سے پہلے ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہوگئی۔ اور اس طرح وہ پھانسی کی ذلت انگیز سزا سے بچ گیا۔ خدائے عادل نے یہ مناسب سمجھا کہ پھانسی سے پہلے ہی اس کی جان قبض کر لے۔

مرزا محمود کی دروغ گوئی

عدالت میں مرزا محمود نے اس کے متعلق بالکل مختلف داستان بیان کی۔ اور کہا کہ محمد حسین کے قاتل کی عزت افزائی اس لیے کی گئی۔ کہ اس نے اپنے جرم پر تأسف و ندامت کا اظہار کیا تھا اور اس طرح وہ گناہ سے پاک ہوچکا تھا۔ لیکن دستاویز ڈی۔ زیڈ۔ ۱ اس کی تردید کرتی ہے جس سے مرزا کی دلی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

عدالتِ عالیہ کی توہین

میں یہاں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس دستاویز کے مضمون سے عدالت عالیہ لاہور کی توہین کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

محمد امین کا قتل

محمد امین ایک مرزائی تھا۔ اور جماعت مرزائیہ کا مبلغ تھا۔ اس کو تبلیغ مذہب کے لیے بخارا بھیجا گیا۔ لیکن کسی وجہ سے بعد میں اسے اس خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس کی موت کلہاڑی کی ایک ضرب سے ہوئی۔ جو چوہدری فتح محمد گواہ صفائی نمبر ۱۲ نے لگائی۔ عدالت ماتحت نے اس معاملہ پر سرسری نگاہ ڈالی ہے لیکن یہ زیادہ غور و توجہ کا محتاج ہے۔ محمد امین پر مرزا کا عتاب نازل ہوچکا تھا۔ اور وہ اب مرزائیوں کی نظر میں وہ موقر و معتقد نہیں رہا تھا۔ اس کی موت کے واقعات خواہ کچھ ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ محمد امین تشدد کا شکار ہوا اور کلہاڑی کی ضرب سے قتل کیا گیا۔ پولیس میں وقوعہ کی اطلاع پہنچی۔ لیکن کوئی کارروائی عمل میں نہ آئی۔ اس بات پر زور دینا فضول ہے کہ قاتل نے حفاظتِ خود اختیاری میں محمد امین کو کلہاڑی کی ضرب لگائی۔ اور یہ فیصلہ کرنا اس عدالت کا کام ہے جو مقدمہ قتل کی سماعت کرے۔ چوہدری فتح محمد کا عدالت میں بہ اقرار صالح یہ بیان کرنا تعجب انگیز ہے۔ کہ اس نے محمد امین کو قتل کیا۔ گر پولیس اس معاملہ میں کچھ نہ کر سکی جس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے۔ کہ مرزائیوں کی طاقت اس حد تک بڑھ گئی تھی۔ کہ گواہ سامنے آکر سچ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے سامنے عبدالکریم کے مکان کا واقعہ بھی ہے۔ کہ عبدالکریم کو قادیان سے خارج کرنے کے بعد اس کا مکان نذر آتش کر دیا گیا۔ اور قادیان کی سمال ٹاؤن کمیٹی سے حکم حاصل کرکے نیم قانونی طریق پر اسے گرانے کی کوشش کی گئی۔

قادیان کی صورتِ حالات اور مرزا کی دشنام طرازی

یہ افسوس ناک واقعات اس بات کی منہ بولتی شہادت ہیں۔ کہ قادیان میں قانون کا احترام بالکل اٹھ گیا تھا۔

آتش زنی اور قتل تک کے واقعات ہوتے تھے۔ مرزا نے کروڑوں مسلمانوں کو جو اس کے ہم عقیدہ نہ تھے۔ شدید دشنام طرازی کا نشانہ بنایا۔ اس کی تصانیف ایک اُسقفِ اعظم کے اخلاق کا انوکھا مظاہرہ ہیں۔ جو صرف نبوت کا مدعی نہ تھا۔ بلکہ خدا کا برگزیدہ انسان اور مسیح ثانی ہونے کا مدعی بھی تھا۔

"حکومت مفلوج ہو چکی تھی"

معلوم ہوتا ہے کہ قادیانیت کے مقابلہ میں احکام غیر معمولی حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ دینی و دنیوی معاملات میں مرزا کے حکم کے خلاف کبھی آواز بلند نہیں ہوئی۔ مقامی افسروں کے پاس کئی مرتبہ شکایات پیش ہوئیں لیکن وہ اس کے انسداد سے قاصر رہے مسل پر کچھ اور شکایات بھی ہیں۔ لیکن یہاں ان کے مضمون کا حوالہ دینا غیر ضروری ہے۔ اس مقدمہ کے سلسلہ میں صرف یہ بیان کر دینا کافی ہے۔ کہ قادیان میں جور ستم رانی کا دور دورہ ہونے کے متعلق نہایت واضح الزامات عاید کیے گئے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قطعاً کوئی توجہ نہ ہوئی۔

"تبلیغ کانفرنس کا مقصد"

ان کارروائیوں کے سدّباب کے لیے اور مسلمانوں میں زندگی کی روح پیدا کرنے کے لیے تبلیغ کانفرنس منعقد کی گئی۔ قادیانیوں نے اس کے انعقاد کو بہ نظر ناپسندیدگی دیکھا۔ اور اسے روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے ایک شخص ایشر سنگھ نامی کی زمین حاصل کی گئی تھی۔ قادیانیوں نے اس پر قبضہ کر کے دیوار کھینچ دی۔ اور اس طرح احرار اس قطعہ زمین سے بھی محروم ہو گئے۔ جو قادیان میں انہیں مل سکتا تھا۔ مجبوراً انھوں نے قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر اپنا اجلاس منعقد کیا۔ دیوار کا کھینچا جانا اس حقیقت پر مُشیر ہے۔ کہ اس وقت فریقین کے تعلقات میں کتنی کشیدگی تھی۔ اور قادیانیوں کی شورہ پُشتی کس حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ کہ وہ اپنی دست درازی کے قانونی نتائج سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ خیال کرتے تھے۔

مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا مقناطیسی جذب

بہر حال کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت کے لیے اپیلانٹ سے کہا گیا۔ وہ بلند پایہ خطیب ہے۔ اور اس کی تقریر میں بھی جذبِ مقناطیسی موجود ہے۔ اس نے اس اجلاس میں ایک جوش انگیز خطبہ دیا۔ اس کی تقریر کئی گھنٹوں تک جاری رہی بتایا گیا ہے حاضرین تقریر کے دوران میں بالکل مسحور تھے۔ اپیلانٹ نے اس تقریر میں اپنے خیالات ذرا وضاحت سے بیان کیے۔ اور اس کے دل میں مرزا اور اس کے معتقدین کے خلاف جو نفرت کے جذبات موجزن تھے ان پر پردہ ڈالنے کی اس نے کوئی کوشش نہ کی۔ تقریر پر اخبارات میں اعتراض ہوا۔ معاملہ حکومت پنجاب کے سامنے پیش ہوا جس نے عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف مقدمہ چلانے کی اجازت دے دی۔

"تقریر پر اعتراض"

اپیلانٹ کے خلاف جو الزام ہے۔ اس کے ضمن میں اس تقریر کے سات اقتباسات درج ہیں جنہیں قابل گرفت ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ اقتباسات یہ ہیں۔

۱۔ فرعونی تخت الٹا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ یہ تخت نہیں رہے گا۔

۲۔ وہ نبی کا بیٹا ہے۔ میں نبی کا نواسہ ہوں۔ وہ آئے تم سب چپ بیٹھ جاؤ۔ وہ مجھ سے اردو۔ پنجابی فارسی میں ہر معاملہ میں بحث کرے۔ یہ جھگڑا آج ہی ختم ہو جائے گا وہ پردہ سے باہر آئے۔ نقاب اٹھائے۔ کشتی لڑے۔ مولا علی کے جوہر دیکھے۔ وہ ہر رنگ میں آئے۔ وہ موٹر میں بیٹھ کر آئے میں ننگے پاؤں آؤں۔ وہ ریشم پہن کر آئے میں گاندھی جی کی کھدڑی کھدر شریف۔ وہ مزعفر کباب۔ یاقوتیاں اور پلومر کی ٹانک وائن اپنے ابا کی سنت کے مطابق کھا کر آئے اور میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کر آؤں۔

۳۔ یہ ہمارا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ برطانیہ کے دُم کٹے کتے ہیں۔ وہ خوشامد اور برطانیہ کے بوٹ کی ٹو صاف کرتا ہے۔ میں تکبر سے نہیں کہتا۔ بلکہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھ کو اکیلا چھوڑ دو پھر میرے اور بشیر کے ہاتھ دیکھو کیا کروں فقط تبلیغ نے ہمیں مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ یہ اجتماع سیاسی اجتماع نہیں ہے۔ اور مرزائیو! اگر بالیں ڈھیلی

ہوتیں۔ میں کہتا ہوں، اب بھی ہوش میں آؤ۔ تمہاری طاقت اتنی بھی نہیں۔ جتنی پیشاب کی جھاگ ہوتی ہے۔

۴۔ جو پانچویں جماعت میں فیل ہوتے ہیں۔ وہ نبی بن جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک مثال موجود ہے۔ کہ جو فیل ہوا وہ نبی بن گیا۔

۵۔ او مسیح کی بھیڑو! تم سے کسی کا ٹکراؤ نہیں ہوا جس سے اب سابقہ ہوا ہے۔ یہ **مجلس احرار** ہے۔ اس نے تم کو ٹکڑے کر دیا ہے۔

۶۔ او مرزائیو! اپنی نبوت کا نقشہ دیکھو۔ اگر تم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو نبوت کی شان تو رکھتے۔

۷۔ اگر تم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ تو انگریزوں کے کتے تو نہ بنتے۔

مرافعہ گذار نے عدالت ماتحت میں بیان کیا۔ کہ اس کی تقریر درست طور پر قلم بند نہیں کی گئی۔ جملہ ۵ کے متعلق اس نے بصراحت کہا ہے۔ وہ اس کی زبان سے نہیں نکلا۔ اور اگرچہ اس نے تسلیم کیا کہ باقی جملوں کا مضمون میرا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے یہ کہا ہے کہ عبارت غلط ہے۔ عدالت ماتحت نے قرار دیا ہے۔ کہ ایک جملہ کی رپورٹ غلط ہے۔ اور اس کے سلسلہ میں مرافعہ گزار کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا مرافعہ گزار کی سزایابی کا مدار دوسرے فقروں پر ہے۔ مرافعہ گزار کے وکیل نے تسلیم کیا کہ فقرات ۱۔۴۔۶۔۷ مرافعہ گزار نے کہے۔ اب میرے سامنے یہ امر فیصلہ طلب ہے۔ کہ کیا یہ جملے جو مرافعہ گزار نے کہے۔ ۱۵۳ الف کے ماتحت قابل گرفت ہیں۔ اور یہ کہ یہ الفاظ کہنے سے مرافعہ گزار کس جرم کا مرتکب ہوا ہے؟

عدالت کا استدلال

میں نے اس سے قبل وہ حالات و واقعات بہ تفصیل بیان کر دیئے ہیں۔ جن کے ماتحت تبلیغ کانفرنس منعقد ہوئی۔ مرافعہ گزار نے بہت سی تحریری شہادتوں کی بنا پر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مرزا اور اس کے مقلدین کے ظلم و ستم پر جائز اور واجبی تنقید کرنے کے سوا اس کا کچھ مقصد نہ تھا۔ اس کا بیان ہے۔ کہ اس کی تقریر کا مدعا سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگانا اور مرزائیوں کے افعال ذمیمہ کا بھانڈا پھوڑنا تھا۔ اس نے اپنی تقریر میں جا بجا مرزا (محمود) کے ظلم و تشدد پر روشنی ڈالی ہے۔ اور مطالبہ کیا ہے۔ کہ جو مسلمان مرزا کی نبوت سے انکار

کرنے اور اس کے خانہ ساز اقتدار کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے مُوردِ آفات و بلیات ہیں۔ ان کی شکایات رفع کی جائیں۔

میں نے قادیان کے حالات کی روشنی میں مرافعہ گزار کی تقریر پر غور کیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے۔ کہ یہ تقریر مسلمانوں کی طرف سے صلح کا پیغام تھی۔ لیکن اس تقریر کے سرسری مطالعہ سے ہر معقول شخص اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ اعلان صلح کے بجائے یہ دعوتِ ستیزہ آزمائی ہے۔ ممکن ہے کہ مرافعہ گزار نے قانون کی حدود کے اندر رہنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن جوش فصاحت و طلاقت میں وہ ان امتناعی حدود سے آگے نکل گیا ہے۔ اور ایسی باتیں کہہ گیا ہے، جو سامعین کے دلوں میں مرزائیوں کے خلاف نفرت کے جذبہ کے سوا اور کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ رومانکے مارک انٹونی کی طرح مرافعہ گزار نے یہ اعلان تو کر دیا کہ وہ احمدیوں سے طرحِ آویزش نہیں ڈالنا چاہتا۔ لیکن صلح کا یہ پیغام ایسی گالیوں سے پُر ہے۔ جن کا مقصد سامعین کے دلوں میں احمدیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

تنقید کے جائز حُدود

اس میں کلام نہیں کہ مرافعہ گزار کی تقریر کے بعض حصے مرزا کے افعال کی جائز اور واجبی تنقید پر مشتمل ہیں۔ غریب شاہ کو زدوکوب کرنے کا واقعہ، محمد حسین اور محمد امین کے واقعات قتل اور مرزا کے جبر و تشدد کے بعض دوسرے واقعات جن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ایسے ہیں جن پر تنقید کرنے کا ہر سچے مسلمان کو حق ہے۔ نیز اس تقریر کے دوران میں ان توہین آمیز الفاظ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جو قادیانی پیغمبر اسلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں استعمال کرتے رہتے ہیں اور جو مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔

مرزائی اور مُسلمان

مسلمانوں کے نزدیک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم المرسلین ہیں۔ لیکن مرزائیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد بھی کئی نبی مبعوث ہو سکتے ہیں۔ اور وہ سب مہبطِ وحی ہو سکتے ہیں، نیز یہ کہ مرزا غلام احمد نبی اور مسیح ثانی تھا۔ اس حد تک مرافعہ گزار کی تقریر قانون کی زد سے باہر ہے۔ لیکن جب وہ دشنام طرازی پر آتا ہے اور مرزائیوں کو ایسے ایسے ناموں سے پکارتا ہے جنہیں سننا بھی کوئی آدمی گوارا نہیں کر سکتا۔ تو وہ جائز حدود سے

تجاوز کر جاتا ہے۔ اور خواہ اس نے یہ باتیں جوش فصاحت میں کہیں، یا دیدہ دانستہ کہیں۔ قانون انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

تقریر کے اثرات

مرافعہ گزار کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ اس کے سامعین میں اکثریت جاہل دیہاتیوں کی تھی۔ نیز یہ کہ اس قسم کی تقریر ان کے دلوں میں نفرت و عناد کے جذبات پیدا کرے گی۔ واقعات مُظہر ہیں۔ کہ تقریر نے سامعین پر ایسا ہی اثر ڈالا۔ اور مقرر کی لسّانی [illegible] سے متاثر ہو کر انہوں نے کئی بار جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ سامعین نے اس وقت کیوں مرزائیوں کے خلاف کوئی متشددانہ اقدام نہ کیا۔ اگرچہ فریقین کے تعلقات عرصے سے اچھے نہ تھے۔ مگر اس تقریر نے راکھ میں دبے ہوئے شعلوں کو مواد دے کر بھڑکایا۔

تقریر کی قابلِ اعتراض نوعیت

فرد جرم میں جن سات فقروں کو قابل گرفت قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے تیسرا اور ساتواں سب سے زیادہ قابل اعتراض ہیں۔ ان میں اپیلانٹ نے مرزائیوں کو برطانیہ کے دُم کٹے کتے کہا ہے۔ میرے نزدیک دوسرے حصّے دفعہ ۱۵۳-الف تعزیرات ہند کے ماتحت قابل گرفت نہیں ہیں۔ پہلا حصّہ یعنی فرعونی تخت اُلٹا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک قابل اعتراض نہیں۔ دوسرے حصّے کا تعلق مرزا کی خوراک اور غذا سے ہے۔ اس کے متعلق یہ امر قابل ذکر ہے کہ مرزائے اوّل نے اپنے مریدوں میں سے ایک کے نام چٹھی لکھی تھی جس میں ان کی خوراک کی یہ تمام تفصیلات درج تھیں۔ یہ خطوط کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ اور ان کے مجموعہ کا ایک مطبوعہ نسخہ اس مثل میں بھی شامل ہے۔

شراب اور مرزا

معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا ایک ٹانک استعمال کرتا تھا جس کا نام پلومر کی شراب تھا۔ ایک موقعہ پر اس نے

اپنے مریدوں میں سے ایک کو لکھا کہ پلومر کی شراب لاہور سے خرید کر مجھے بھیجو۔ پھر دوسرے خطوط میں یاقوتی کا تذکرہ ہے۔ مرزا محمود نے خود اعتراف کیا ہے، کہ اس کے باپ نے ایک دفعہ پلومر کی شراب دواءً استعمال کی۔ چنانچہ میرے نزدیک یہ حصّہ بھی قابل اعتراض نہیں۔ چوتھے حصّہ میں مرزا غلام احمد کے امتحان میں ناکام ہونے کا تذکرہ ہے۔ چھٹے حصہ میں مرزا پر لابہ گوئی اور کاسہ لیسی کا الزام لگایا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چاپلوسی اور لابہ گوئی پیغمبر کی شان کے خلاف ہے۔

عدالت کا تبصرہ

میری رائے میں تیسرے اور ساتویں حصّہ کے سوا اور کوئی حصّہ تقریر کا قابل گرفت نہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مرافعہ گزار کی تمام تقریر میں صرف وہ حصّے قابل اعتراض ہیں۔ تقریر کے انداز سے معلوم ہوا کہ جہاں مرافعہ گزار مرزائیوں کے افعال شنیعہ کی دھجیاں بکھیرنا چاہتا تھا۔ وہاں وہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت بھی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ یہ امر کہ سامعین اس کی تقریر سے متاثر ہو کر امن شکنی پر کیوں نہ اُتر آئے؟ اس کے جرم کو ہلکا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

مجھے اس میں کلام نہیں کہ اپیلانٹ مرزائیوں پر تنقید کرنے میں حق بجانب تھا۔ لیکن وہ اس حق کو استعمال کرنے میں جائز حدود سے تجاوز کر گیا۔ اور تقریر کے قانونی نتائج بھگتنے کا سزاوار بن گیا۔ مرافعہ گزار کے اس فعل کی مدح و ثنا کرنا آسان ہے۔ لیکن ایسے حالات میں جہاں جذبات میں پہلے ہی سے ہیجان و اشتعال ہو۔ اس قسم کی تقریر کرنا جلتی پر تیل ڈالنے کے مُرادِف ہے۔ اور اگرچہ مرافعہ گزار نے صرف ایک اصطلاحی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ لیکن قانون کی ہمہ گیری کا احترام از قبیلِ لوازم ہے۔

فیصلہ د نومبر ۱۹۳۵ء

مقدمہ کے تمام پہلوؤں پر نظر غائر ڈالنے اور سامعین پر مرافعہ گزار کی تقریر کے اثرات کا اندازہ کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ مرافعہ گزار تعزیرات ہند دفعہ ۱۵۳ا کے ماتحت جرم کا مرتکب ہوا ہے اور اس

کی سزا قائم رہنی چاہیئے۔ مگر سزا کی سختی و نرمی کا اندازہ کرتے وقت ان واقعات کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ جو قادیان میں رونما ہوئے۔ نیز یہ بات نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں۔ کہ مرزا نے خود مسلمانوں کو کافر، سؤر، اور ان کی عورتوں کو کتیوں کا خطاب دے کر ان کے جذبات کو بھڑکایا۔ میرا خیال یہی ہے کہ اپیلانٹ کا جرم محض اصطلاحی تھا چنانچہ میں اس کی سزا کو کم کر کے اسے تا اختتام عدالت قید محض کی سزا دیتا ہوں ؛

دستخط

جی۔ ڈی۔ کھوسلہ	گورداسپور
سیشن جج	۶ جون ۱۹۳۵ء

یہ فیصلہ مسلمانوں کی دینی حس اور فطرتی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا باعث ہوا گویا ایسی بہار آئی کہ دلوں کے کنول کھل گئے۔ اہل حق نے اس فتنے کو اصلی رنگ میں دیکھ لیا۔ اور دوسروں کو خبردار کرنے لگے۔ "علامہ سر محمد اقبال ذہنی طور سے احرار تھے۔" انہیں مرزائیوں کے عزائم میں اسلام کے لئے خطرہ نظر آتا تھا۔ وہ مرزائیوں کی اسلام دشمنی کے اوّل سے قائل تھے۔ اور کبھی آنکھوں میں جگہ نہ دیتے تھے۔ کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین تھے۔ وہ ضرور ممبر ہو گئے تھے لیکن یہ کیفیت اضطراری تھی۔ وہ فوراً سنبھل کر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں لگ گئے۔ اور احرار کی تنظیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ عرف عام میں ان کے مرزائی شکن بیانات نے تعلیم یافتہ طبقے پر گہرا اثر کیا۔ اور ہوا کا رخ بالکل ادھر سے اُدھر پھر گیا۔ مرزا سر ظفر علی سابق جج پنجاب ہائی کورٹ معاملات دین میں پڑے تھے۔ انہوں نے اپنے اعلان میں خدا لگتی بات کہی کہ مومنوں کی بنا پر قومیں الگ الگ شمار ہوتی ہیں۔ جب مرزائیوں نے اپنا نیا نبی مان لیا۔ تو وہ لازمی طور سے مسلمانوں سے الگ ہو گئے۔ غرض مرزائیوں کے لیے دنیا تنگ ہو گئی۔ مولانا ثناء اللہ اور مولانا ظفر علی خان نے مرزائیت کے خلاف ضرور محاذ قائم کیا۔ ان کا سب کو ممنون ہونا چاہیئے۔ مگر وہ "سو سنار کی تھیں۔ اب" لوہار کی پڑنے لگیں تو مرزائی بوکھلا گئے "ملاں کی دوڑ مسجد تک" اور "مرزائیوں کی دوڑ انگریزی سرکار تک"۔ جوں جوں عوام کی ہمدردیاں احرار سے زیادہ ہوتی جاتی تھیں توں توں سرکار اور احرار کے تعلقات کشیدہ ہوتے جاتے تھے۔

جناب الیاس برنی کی مرزائی قلعے پر گولہ باری کے سلسلے میں خدمات کا اعتراف نہ کرنا ناشکر گزاری ہوگی انہوں نے "قادیانی مذہب" شائع کر کے قادیانی مرزائیوں کے بدنما چہرہ سے ریاکاری

کا نقاب بالکل ہی الٹ دیا ہے۔ کتاب کی ترتیب میں اپنی رائے سے متاثر کرنے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کی گئی، بلکہ مرزائیوں کی مستند کتابوں کے حوالہ جات ہی کو اس طرح ترتیب دیا ہے۔ کہ کتاب رد مرزائیت کا کارگر نسخہ بن گئی ہے۔ جو طرز اس کتاب میں برنی صاحب نے اختیار کیا وہ بالکل اچھوتا ہے اور ایسا دل نشین ہے۔ کہ ہزاروں مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کا باعث ہوا۔ غرض مرزائیت کی بیخ کنی کے بہت سے اسباب فراہم ہو گئے من جملہ ان کے مولانا عبدالکریم مباہلہ کی احرار میں شمولیت تھی۔ یہ کفر کے آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ قادیانیوں کے جرائم سے مسلمانوں کو محفوظ کرنے کے کام آ رہا تھا۔ مولوی عبدالکریم راز دار خلافت تھا خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کی بدعنوانیوں کو دیکھ کر قادیانی مذہب سے برگشتہ ہوا۔ قادیان سے جان بچا کر بھاگا اس بھاگ دوڑ میں حاجی محمد حسین صاحب ساکن بٹالہ مرزا بشیر الدین کے ایک مرید کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ اور مولانا عبدالکریم بچ نکلے مولانا موصوف نے عدالت میں حلفی بیان دیا کہ وہ خود آخر تک مخلص تھے۔ لیکن بعض دوسرے لوگوں سے الزامات انہوں نے سنے اور تحقیق کر کے انہیں سچا پایا۔ اس وجہ سے الگ ہو گئے۔ مولانا کے سارے خاندان نے قادیانیوں کے ہاتھوں سخت تکالیف اٹھائیں۔ اخبار مباہلہ بند کرنا پڑا جیل بھگتی۔ مگر مرزائیوں کا ناطقہ بند کر کے چھوڑا۔ شاید ہی کسی نے کسی سے ایسا کامیاب انتقام لیا ہو جیسا کہ مباہلہ والوں نے لیا۔ آج ان کی آنکھوں کے سامنے مرزائیت بے توقیر ہے۔ آج مرزائیوں پر بے بھاؤ کی پڑ رہی ہیں۔ علماء ہی نہیں بلکہ مسلمان عوام بھی مرزائیوں کے نام سے بیزار ہیں ؛

شہید گنج کی گونج

ہاں یہ سچ ہے کہ مرزائیوں کی نامقبولیت کا ذمہ دار انگریزی سرکار نے احرار کو ٹھہرایا اور بقول مرزا غلام احمد احمدیت برٹش حکومت کا خود کاشتہ پودا تھی۔ اس کو خشک ہوتے دیکھ کر حکومت کا خون خشک ہوتا تھا۔ چنانچہ سوچ بچار کے بعد یہ اعلان کیا۔ کہ قادیان میں نماز جمعہ پڑھانے باہر سے کوئی عالم نہ آئے۔ خیال یہ تھا کہ کہیں علاقے سے قادیانی اثر و رسوخ کم نہ ہو جائے۔ ایک ہی فریق کی تبلیغ کے دروازے کھولنا اور دوسروں پر یہ دروازے بند رکھنا انصاف نہ تھا۔ مگر محبت میں انصاف کے تقاضوں کو کون پورا کرتا ہے لیکن ایسے احکام کھلے طور پر احرار کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ

کی دلیل تھی۔ درمیان میں ایک واقعہ ایسا بھی رونما ہوا جس سے حکومت کے حواس اور پراگندہ سے ہو گئے۔ مجلس احرار نے ایک نو مسلم بیرسٹر خالد لطیف گابا کو جو سابق وزیر لالہ ہرکشن لعل کا فرزند تھا۔ اپنی طرف سے امیدوار کھڑا کیا۔ مسلمانوں کے سرکار پسند اعلیٰ طبقے نے خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب سابق سیشن جج کو مقابلے کے لیے کھڑا کیا۔ مگر انہیں ناکامی ہوئی۔ اس انتخابی شکست سے حکومت کو احرار کی طاقت سے بجا طور پر خوف معلوم ہوا۔ پنجاب کو ہندوستان کی سیاسیات میں خاص درجہ حاصل ہے۔ حکومت کے اپنے عزائم اور منصوبے اسی ایک خطّے سے وابستہ تھے۔ حکومت نہ چاہتی تھی کہ احرار برسر اقتدار آ جائیں۔ اور انگریزی سرکار کو بیچ بازار للکاریں۔ اور آڑے وقت میں اڑیل ٹٹو بن جائیں۔ ان بے جا احتمالات کے پیشِ نظر حکومت کا احرار کے مٹانے پر کمربستہ ہو جانا دلیل دانائی تھی۔

اسی زمانے میں احرار نے میاں سر فضل حسین کو جو بساطِ سیاست کے کامیاب کھلاڑی تھے۔ جن کی چالیں بے حد گہری اور جن کی تدبیریں بہت مؤثر ہوتی تھیں۔ ناراض کر لیا۔ بلکہ اس کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ سر ظفر اللہ کو میاں سر فضل حسین نے یہاں تک نوازا کہ اس کی سفارش حکومت ہند تک کی۔ حکومت ہند گویا اس سفارش کی منتظر ہی تھی۔ مرزائیت کا حکومت انگریزی سے جو تعلق ہے۔ اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں حکومت ہند کے ایگزیکٹو کونسلر کے عہدہ پر ایک مرزائی ظفر اللہ کا تقرر تو درحقیقت انگریز کے خود کاشتہ پودے کی آبیاری تھی۔ مگر احرار کو صدمہ یہ تھا کہ میاں صاحب جیسے بالغ النظر شخص نے دیکھ کر قادیانی مکھی کیسے نگلی ہے؟ ادھر میاں صاحب کی مجبوری یہ تھی کہ سر سکندر حیات خاں کے تیور بے حد بگڑے نظر آتے تھے۔ وہ سر سکندر حیات کے گروپ کے مقابلے میں اپنے ونگ کو مضبوط کرنے میں مصروف تھے ایسی مصروفیتوں میں بعض اوقات غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ یہ فاش غلطی ہو گئی۔ اب وہ غلط قدم واپس کیا لیتے؟ پھر انہوں نے اسے اپنے وقار کا سوال بنا لیا۔ مرزائیوں کی مخالفت احرار کی تبلیغ کا اہم جزو تھا۔ انہوں نے میاں صاحب کو للکارا۔ اس طرح احرار نے ہندوستان کے مضبوط ترین مدبر کو اپنا بیری بنا لیا۔ لیکن اس زمانے میں احرار کا بول بالا تھا۔ کسی مخالف کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ مگر سب گھات میں تھے کہ موقعہ پائیں تو ——— چاروں شانے چت گرائیں۔ احرار کا جتنا نام تھا۔ اسی نسبت سے مخالف خار کھا رہے تھے۔

ہمارے دوستوں کا وہ طبقہ جسے ہم نے اوائل باب میں طبقہ اولیٰ قرار دیا تھا۔ جو اپنی امیدیں کانگرس سے وابستہ سمجھے ہوئے تھے۔ کباب سیخ ہو رہا تھا۔ راولپنڈی میں کچھ بحث دیر تک ہوئی۔ مولانا ظفر علی خاں ان کے سرگروہ

چنے گئے۔ مولانا لائل پور احرار کانفرنس پر آئے۔ تو خلاف توقع قادیانیوں کے خلاف احرار کے محاذ بنانے پر برسے جس نے سنا تعجب کیا۔ کہ مولانا کی عمر بھر کی خدمات اسلامی کا طول و عرض تو یہی مرزائیت کی مخالفت ہے۔ یہ اب احرار پر اچانک حملہ آور کیوں ہوئے؟ اس پر کسی نے تقریر میں اسی خیال کا اظہار کیا۔ اس پر مولانا بگڑے اور کانفرنس سے ناراض۔۔ چلے آئے۔

ابھی ہم لائل پور میں تھے کہ دوسرے دن لاہور سے اطلاع ملی کہ سکھوں نے شہید گنج کو گرانا شروع کر دیا ہے۔ مولانا مظہر علی صاحب لاہور میں تھے۔ ان سے معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ حالات پر قابو پا لیا گیا ہے۔ اور مولانا نے مسلمانوں کو مناسب ہدایات دی ہیں۔ غرض احرار مطمئن سے ہو گئے۔

میں اور مولانا مظہر علی شملے کونسل کی ایک سب کمیٹی میں شامل ہونے چلے گئے۔ یک بیک ہمیں شملے میں معلوم ہوا کہ لاہور میں حالات بگڑ گئے ہیں۔ ہم دونوں لاہور پہنچے۔ حالات اشتعال انگیز تھے۔ مگر پولیس کے چوکی پہرے لگے ہوئے تھے۔ کیوں کہ رات مسجد شہید گنج شہید کر دی گئی تھی۔ آتے ہی حالات معلوم کیے۔ تو پتہ چلا کہ ہر خیال کے مسلمانوں کی مجلس میاں عبد العزیز بیرسٹر کے مکان پر بلائی جا چکی ہے اور بڑے بڑے مفتی اور صاحب اثر حضرات اس میں شامل ہیں۔ مسجد کا معاملہ سب مسلمانوں کا مشترکہ تھا۔ اسے پارٹی کا سوال بنانا خلافِ دانش تھا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایک مضبوط جماعت اس کام کو سر انجام دینے کے لیے بنائی جا چکی ہو۔ لیکن اندر ہی اندر ہمارے خلاف زہر پھیلانی شروع کر دی گئی۔ حالانکہ اس عرصہ میں مولانا ظفر علی خاں صاحب سے فاش غلطیاں ہوئیں۔ انہوں نے جلسہ عام میں عدالتی طور پر انہدام مسجد کے سلسلے میں حکم امتناعی حاصل کرنے کا مسلمانوں کی طرف سے اختیار حاصل کیا۔ لیکن عدالت کا دروازہ نہ کھٹکھٹایا۔ بلکہ ڈپٹی کمشنر کے وعدے پر اعتماد کر لیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کو قانونی طاقت سے محروم کر دیا۔ مسلمانوں کو قانونی طور پر بے بس کر کے شرارت پسند سکھوں اور ان کی امداد کرنے والی قوتوں کو مسجد کے شہید کرنے کا موقعہ مہیا کر دیا۔ پھر سکھ لیڈر مسلمانوں سے مسجد کے معاملہ میں باعزت سمجھوتے کے خواہاں تھے۔ مگر مولانا ظفر علی خاں نے اسلام کے مفاد کے خلاف صاف انکار کر دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو مسجد انہدام سے بچ جاتی۔ لیکن ان کے ذہن میں بھی بات ان کے دوستوں نے ڈالی تھی کہ کوئی کارنامہ ایسا کر کے دکھاؤ کہ احرار مات کھا جائیں۔ وہ ان کے پیشِ نظر مسجد کو بچانا نہ تھا بلکہ احرار کو گرانا تھا۔ اس لیے سرکاری درباری لوگوں نے بھی مولانا کی ہر قدم پر حوصلہ افزائی کی۔ کیوں کہ احرار کا عروج ان کی موت تھا۔ اپنی زندگی کے لیے وہ احرار کو مارنا ضروری سمجھتے تھے۔ سرمایہ دار جماعتوں کا عروج

سرمایہ دار برداشت کر لیتے ہیں لیکن غریبوں کا اقبال سرمایہ داری کا خاتمہ ہے۔ یہ دنیادار ایمان بیچ کر مفلسوں کا خون نچوڑ کر دولت جمع کرتے ہیں۔ اور اس کے ذریعے لوگوں میں اثر و رسوخ بڑھاتے ہیں۔

مسجد شہید اور حکّام

حکّام جو صوبے کے امن کے ذمہ دار تھے۔ اُن کی پوزیشن اور بھی مضحکہ خیز تھی۔ اگر وہ صاف طور پر ارادہ کرتے تو مسجد کو انہدام سے بچا سکتے تھے۔ کیا کوئی قوم حکومت کے اقتدار سے باہر تھی؟ حکومت انگریزی کو اپنے اثر اور طاقت پر ناز رہا ہے۔ حکومت نے نہ صرف متکبّرانہ لاپروائی برتی بلکہ شرارت پسندوں کو مواقع اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔ کیا حکومت خود مسجد کو پولیس اور فوج کے ذریعے محفوظ نہ کر سکتی تھی؟ کیا یہ واقعہ نہ تھا کہ باوجود سکھ ڈیپوٹیشن کے گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن کو یقین دلانے کے کہ ان کا ارادہ مسجد گرانے کا نہیں پھر بھی مسجد کو محفوظ نہ کیا گیا؟ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی گورنر سے کیے گئے وعدہ کی تصدیق کرنے کے لیے جمع ہوئی تھی۔ کہ انہیں اطلاع ملی کہ مسجد راتوں رات منہدم ہو گئی۔ پربندھک کمیٹی نے پھر بھی منہدم کرنے والوں کو باز رکھنے کے لیے سردار منگل سنگھ ایم۔ ایل۔ اے کو بھیجا۔ مگر حکّام نے انہیں مسجد شہید تک جانے سے روک دیا۔ تاآنکہ مسجد ہموار کر دی گئی۔

اب سُوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی مضبوط عمارت رات بھر میں کیسے شہید کر دی گئی؟ کہا گیا کہ سرکاری کرین استعمال ہوئی۔ پھر حکومت نے سوچا کہ ہم تو پھنس گئے۔ پھر کہا گیا کہ کرین نہیں ونچ استعمال ہوئی۔ اور یہ ونچ گوجرانوالے کے فلاں سکھ ٹھیکیدار کی تھی۔ تعجب ہے کہ اُس ٹھیکیدار نے اعلان کر دیا کہ مجھے ناحق بدنام کیا جا رہا ہے۔ نہ میری ونچ استعمال ہوئی۔ نہ میں ان دنوں لاہور گیا۔ نہ انہدام میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔ غرض حکومت کا کیس ایسا کمزور تھا۔ کہ اگر مسلمان بروئے انصاف ساری ذمہ داری حکومت پر ڈالتے۔ تو وہ دو قوموں میں باعزّت سمجھوتہ کرا دیتی لیکن حکومت کے لگے بندھوں کو حکومت کا پریشانی میں ڈالنا منظور نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کا قانون سکھوں کا طرف دار ہو گیا۔ اعلیٰ طبقہ بلوں میں گھس گیا۔

طبقۂ اُولیٰ کی شرارت

مولانا ظفر علی خان ہندوستان کی سیاست میں متلوّن مزاجی اور بے سود ہنگامہ آرائی کا مظہر رہا ہے۔ اس کے

اس وقت کے ساتھی وہی طبقۂ اُولیٰ تھا۔ یعنی مولانا عبدالقادر قصوری، ڈاکٹر محمد عالم وغیرہ جانتے تھے۔ کہ یہ ہنگامہ قوم کی رسوائی ہے۔ مگر میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر کے مکان پر اکٹھے ہوتے بولے احرار کو کچھ کرنا چاہیے۔ تمام حالات پر بحث کر کے وہ یہ بات مان گئے کہ صورت حال ایسی نہیں جس کا آسانی سے فیصلہ ہو سکے۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ کسی اور تاریخ پر اکابرین قوم کو جمع کر کے استصواب کیا جائے۔ کیوں کہ یہ مسئلہ سِوِل وار تک لے جانے والا ہے۔

اسی جگہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ دوسرے دن جو جلسۂ عام ہونے والا ہے اس میں احرار شریک نہ ہوں۔ اسے مولینا ظفر علی خان اور ان کے ساتھی بھگتا لیں۔ اب تک بھی ہم اس گروہ کے عزائم سے ناآشنا تھے لیکن اس گفتگو میں مَیں مولانا عبدالقادر صاحب کے طرزِ عمل سے بڑا پریشان ہوا۔ وہ خود رہنمائی نہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر احرار پر زور دیتے تھے کہ وہ کچھ کریں۔ اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ احرار کا اقدام قوم کے لیے خطرات کا باعث ہو گا۔ بہر حال ہم اس پُرپیچ مسئلے کو ایک بڑے اجتماع کی رائے کے مطابق حل کرنے پر مطمئن تھے۔ دوسرے روز عام جلسہ تھا۔ یک بیک مولانا ظفر علی خاں کو دفعہ آیا کہ جلسہ میں نہ جائیے اتنے میں مولانا سیّد حبیب۔ جو ان دنوں مولانا ظفر علی خان کے زیر ہدایت کام کر رہے تھے۔ آئے اور انہوں نے مولانا اختر علی خاں کے خلاف سخت بے اعتمادی کا اظہار کیا۔ وہ چلے گئے۔ تو ہم ایسی بداعتمادی کی فضا میں کام کرنے کی مشکلات پر غور کر رہے تھے۔ کہ معلوم ہوا کہ ملک لعل خاں صاحب نے جلسہ میں نیا گُل کھلایا۔ لوگوں کو ہمارے خلاف جھوٹ بھڑکایا۔ اس واقعہ کے بعد تو گویا ہمارے خلاف منظم جھوٹ کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ کبھی کہا گیا کہ احرار مسجد کو سکھوں سے لینے کے حق میں نہیں ہیں۔ کبھی کہا گیا کہ وہ گورنمنٹ کے ہتھے چڑھ گئے۔ عوام کو اندر ہی اندر بھڑکایا گیا۔ بالآخر حکومت نے مولانا ظفر علی، ملک لعل خاں، سیّد حبیب وغیرہ کو نظر بند کر لیا۔ پھر تو اخبار ”زمیندار“ نے نت نیا جھوٹ تصنیف کرنے کا معمول کر لیا۔ سرکاری فریق نے اندر ہی اندر مسلمانوں کو ابھارا کہ اگر کوئی اقدام کرو تو مسجد ضرور مل جائے گی۔ اِن علانیہ اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلی دروازہ کے باہر گولی سے کئی ایک مسلمان شہید ہوئے۔ یہ ساری داستان درد مولانا مظہر علی صاحب نے ”خوفناک سازش“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی ہے۔ اس لیے سارے واقعات کی تفصیل اس کتاب سے معلوم ہو سکتی ہے۔ ہم نے ہر چند چاہا کہ مسلمان صورت حال کا صحیح جائزہ لیں۔ اور ایسے اقدامات سے بچ جائیں۔ جس کا نتیجہ کچھ نہ ہو۔ جتنا ہم نے روکنا چاہا اتنا ہی

غلط فہمیوں کا شکار بنائے گئے۔

مرزائیوں کی شرارت

احرار پر ایسا ابتلا کا زمانہ آیا کہ شاید ہی کسی جماعت پر آیا ہو۔ مسلمانوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے کا اہم کام مرزائیوں نے سرانجام دیا۔ روپے کو پانی کی طرح بہایا۔ اخبارات کو مالی مدد پہنچائی گئی۔ افراد کو وظائف دیئے گئے۔ اور سات سو کے قریب مرزائی قادیان سے لاہور امرتسر اور بڑے بڑے مقامات پر خاص ہدایات دے کر بھیجے گئے۔ تاکہ احرار کے دشمنِ اسلام اور ملت کے غدار ہونے کا پروپیگنڈہ کریں۔ اتنی کثیر تعداد میں ہمارے خلاف اشتہارات شائع کیے گئے کہ شاید ہی ہندوستان میں کسی جماعت کے خلاف اتنی اشتہار بازی ہوئی ہو۔ اس طوفانی مخالفت کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ خصوصاً جبکہ سرکاری درباری لوگوں کا اثر و رسوخ اس سارے پروپیگنڈہ کی پشتیبانی کر رہا ہو۔ ضرورت کے مطابق پیشین گوئی کرنا موجودہ خلیفہ نے باپ سے سیکھا ہے۔ احرار کے خلاف بڑے زور سے جھوٹی پیشین گوئیاں شائع کی گئیں۔ اور مرزا بشیر الدین نے احرار کو تباہ کرنے کے لیے اتنا روپیہ خرچ کر دیا جس سے جماعت مرزائیہ تڑپ اٹھی۔ قادیان میں کانا پھوسی شروع ہوگئی۔ اور اس کے خلاف جماعت میں ہی محاذ بن گیا۔ اس لیے اپنے اس خرچ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے بہت کچھ تسلیم کرنا پڑا۔ ہر مرزائی کو سمجھایا گیا تھا کہ ہندوستان میں بھی ایک جماعت مرزائیت کے راستے میں کارگر رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ احرار کو مار لو تو میدان مارا ہوا سمجھو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسی فرقہ ضالہ کے ہر فرد نے احرار پر زخم لگانے کی پوری سعی کی۔ اسلام اور کفر کے مقابلے میں احرار اسلام مرزائی کافروں سے نیکی کی امید نہیں رکھ سکتے۔

مخالفوں کے پروپیگنڈے میں خامی

ہمارا ہر مخالف سچائی کو اپنے دل میں نہ پاتا تھا۔ اصل مسئلے کے متعلق وہ جانتا تھا کہ احرار اس میں حق بجانب ہیں۔ انہوں نے محض ہماری مخالفت کے لیے جھوٹ کی بنیاد پر عمارت کھڑی کرنا چاہی۔ سب جانتے تھے کہ مقدمہ کرنے کے بعد بھی کوئی کامیابی نہیں۔ یہی مسجد تھی انجمن اسلامیہ اگر چاہتی تو کوڑیوں کے بھاؤ خرید سکتی تھی۔

مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ اسی ایجی ٹیشن سے پہلے اسی مسجد کے متعلق دعویٰ دائر کر کے پوری پیروی تک نہ کی۔ اب جب ہم نے درست راہنمائی کر کے کہا کہ صبر و سکون سے کام لو تو یہی نصیحت ہمارا جرم ہو گیا۔ ہمارے مخالفوں کا مقصد عوام کو بھڑکاتا تھا۔ خود کوئی قربانی کرنا نہ تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نظر بند ہوتے اپنا وظیفہ بڑھانے میں لگ گئے۔ پیر سید جماعت علی شاہ صاحب کو امیر ملت بنایا گیا۔ وہ قید و بند کو کیا جانیں؟ ہمارا ہر مخالف اپنی جان بچا کر دوسروں کو قربان کرنا چاہتا تھا۔ یہ ہماری اور ملت اسلامیہ کی خوش قسمتی تھی کہ تحریک شہید گنج کے علم بردار متذبذب اور بزدل تھے۔ انہیں کامل یقین تھا کہ وہ محض اغراض پرستی کے لیے احرار کی مخالفت کر رہے ہیں۔ رہ رہ کے اُن کا ضمیر انہیں ملامت کرتا تھا۔ کہ ایک جماعت کو فنا کرنے کے لیے ہم یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ مخالفت جس میں سچائی نہ ہو کمزور ہو جاتی ہے لیکن افراد اگر حوصلہ مند ہوں تو جھوٹ کو بھی فروغ دے دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے نہ مرزائیوں میں حوصلہ تھا اور نہ ہمارے دوسرے مخالفوں میں دلیری تھی۔ اگر وہ جھوٹ کے لیے بھی بہادری دکھلاتے تو ہماری مصیبتوں میں اور اضافہ کر سکتے تھے۔

احرار سیسہ پلائی ہوئی دیوار

دنیا میں تھوڑے ہی بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں جو اچھے ناموں سے پکارے جائیں اور وہ اسم بامسمیٰ نکلیں۔ احرار کی ہندوستان میں خوش قسمتی ہے جس کا نام اور کام باہم مناسبت اور مطابقت رکھتے ہیں۔ آزادی کی طلب اور شرافت کا مسلک احرار کی گھٹی ہے۔ شہید گنج کے واقعہ ہائلہ نے جماعت کو بہت جلد دشواریوں میں ڈال کر اس کے نام کے مطابق اس کے کام کا جائزہ لیا۔ سیاسیات میں شرافت کا ثبوت یہی ہے کہ جماعت خود مٹ جائے مگر قوم پر آنچ نہ آنے۔ غلط کاروں کی ہاؤ ہو سے ڈر کر قوم کے بچوں کو ایسی بھینٹ نہ چڑھائے جس بھینٹ کا نتیجہ کچھ نہ ہو۔ ہمارے مخالفوں کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ اُن کی سعی بے نتیجہ ہے۔ پھر بھی وہ قوم کو بے سود عمل پر ابھارتے تھے۔ اور ساتھ ہی انہیں احرار کی دیانت داری پر یقین تھا۔ کہ احرار کبھی قوم کو بے سود خطرے میں نہ ڈالیں گے۔ بس یہی شرانگیز دانائی ہمارے مخالفوں کو بلند بانگ کر رہی تھی۔ لیکن قدرت کو ہم سے جیل خانوں سے سخت تر امتحان لینا منظور تھا۔ مقصد مخالفوں کی نتیجے کے اعتبار سے فضول مگر طوفانی مخالفت اٹھانے کے لحاظ سے

بے حد مؤثر غوغا آرائی نے بے شک ہمارا ناطقہ بند کر دیا۔ اور خدا کی زمین ہم پر تنگ کر دی گئی۔ لیکن ابتلا کے اس زمانے میں جماعت کے ایک والنٹیر کے منہ سے بھی مخالفانہ آواز تو سنائی نہ دی۔ ہمارا ہر شخص جانتا تھا کہ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار نے ۱۹۲۵ء میں مسجد شہید گنج کی بازیابی کی آواز ہی کو شرانگیز قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عالم مسجد شہید کی تقدیس کے قائل نہ تھے کہ اس کے لیے قربانی پر آمادہ ہوتے ہمارے ہر کارکن کے ضمیر کی آواز اور عقل کی رہنمائی اسی طرف تھی کہ یہ تحریک محض احرار کی مخالفت کے لیے اٹھائی گئی ہے۔ اُس کی محرک سچائی اور صداقت نہیں بلکہ احرار کو انتخابات میں پچھاڑ کر خود اسمبلی میں پہنچنا ہے اسی بنا پر سب احرار اغراض پرستوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔ ایک ایک نوجوان مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا۔ طوفان کا سمندر اُمڈ اُمڈ آتا تھا اور سر ٹکرا کر لوٹ جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرد مجاہد سمندروں کے بگڑے تیوروں کو دیکھ کر خوف و ہراس کے بجائے بے پروائی سے کھڑا مسکراتا ہے۔ ہماری آنے والی نسلیں نہ اس ابتلا کا اندازہ کر سکتی ہیں، نہ اس استقلال کا صحیح تصور کر سکتی ہیں جو جماعت کے ہر فرد نے دکھایا۔ نہ دوسری قوموں اور جماعتوں نے ہماری عظیم الشان خدمات کا اعتراف کیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر جماعت ہماری موت پر خوش تھی۔ کانگریس کے اکابر یہ سمجھتے تھے کہ ہم مسلمانوں کو کانگریس کی شمولیت سے روکے ہوئے ہیں۔ سکھ سمجھتے تھے کہ یہی مسلمانوں میں انقلابی جماعت ہے جو ایثار اور قربانی کی بنا پر ان کے عزائم میں حائل ہے۔ مسلمان امرا۔ اس امر سے پریشان تھے کہ یہ غریب جماعت موری کی اینٹ چوبارے میں لگنے کی آرزو مند ہے۔ اور حکومت پر چھا جانے کی امیدیں لگائے بیٹھی ہے۔ ہو نہ ہو یہ کل جماعت نذر طوفان ہو۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا عبدالقادر۔ ڈاکٹر عالم وغیرہ حضرات یہ قیاس کرتے تھے کہ احرار ہی کباب میں ہڈی ہیں۔ انہیں نکال دیا جائے تو مزے ہی مزے ہیں۔ احرار سب میں گھرے کھڑے تھے انہیں چومکھی لڑائی لڑنی پڑ رہی تھی۔ احرار لیڈروں کی برملا بے عزتی کی جاتی تھی۔ ان پر قاتلانہ حملے شروع ہو گئے تھے۔ صبر و سکون کی ہدایت کی جاتی تھی تا آنکہ پانی سر سے گزرنے لگا۔ ہمارے مخالفوں نے شرافت کے سارے آئین کو بالائے طاق رکھ دیا۔ آخر ہمیں معلوم ہوا کہ جبر، جبر کی حد سے بڑھ گیا ہے اب ترکی بہ ترکی جواب دینے کے سوا چارہ نہیں۔ ہم مدافعانہ جنگ میں پسپا ہوتے ہوئے اس مدافعتی خط پر پہنچ گئے جہاں مزید پسپائی کی گنجائش نہ تھی۔ ہمارے خلاف ہر روز نیا جھوٹ تراشا جاتا تھا۔ کبھی کہا جاتا تھا کہ دہلی دروازے کے شہدا کو کتے کی موت مرنے والا کہا گیا۔ ہمارے مخالف جانتے تھے کہ شہدا کے متعلق یہ ناقابل برداشت فقرہ ہے۔ جب ہم تردید کرنا

چاہتے تھے۔ تو اخباروں میں ہماری تردید کوئی شائع نہ کرتا تھا۔

ایک تائیدی آواز پھر بزن

مخالفت کے نقار خانے میں جہاں دشمنوں کے شور میں ہماری آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پنجاب کے سوشلسٹوں کی آواز تھی جو گاہے ماہے قوم کو خانہ جنگی سے متنبہ کرتی تھی۔ اور عملاً احرار کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ اور جو واضح طور پر اس رائے کی تھی کہ مسجد شہید گنج کی شہادت خوفناک سازش ہے اور اس کی ساری ذمہ داری حکومت پر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ آواز کسی حد تک بعض لوگوں کی توجہ کا مستحق بنی۔ لیکن سوشلسٹوں کے لیڈر جلد ہی دھر لیے گئے اور انہیں سخت سزائیں دی گئیں۔ پھر حق و صداقت کے لیے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ ہماری حالت یہ تھی کہ ہم مسلمانوں میں خوں ریزی اور سر پھٹول کے خوف سے جلسہ نہ کرتے تھے۔ مخالفوں نے غلط اندازہ لگایا کہ ہم مخالفت کے خوف سے معتکف ہیں۔ آخر میں ہمیں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ ہم شبیر کی طرح مخالفت کے بہاؤ میں سیدھے تیریں۔ اور خم ٹھونک کر میدان میں نکلیں۔ چنانچہ بعض احتمالات کے پیش نظر لاہور میں یک روزہ کانفرنس کی گئی تاکہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ مولانا ظفر علی اور ان کے ساتھیوں نے خود پس پردہ بیٹھ کر اپنے ہم خیال نوجوانوں کے مضبوط جتھے کو دہلی دروازے کے باہر بھیجا کہ احرار کو جلسہ نہ کرنے دیا جائے۔ ہم نے ہر چند چاہا کہ ہم پر امن جلسہ کریں۔ ان نوجوانوں کو یقین دلایا کہ ہم آپ کو زیادہ سے زیادہ وقت دے سکتے ہیں۔ مگر انہوں نے کوئی دلیل اپیل نہ سنی۔ اپنی سی کہتے رہے۔ کہ احرار کو ہرگز جلسہ کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے سٹیج پر قبضہ کر لیا اور غنڈہ گردی شروع کر دی۔ جب ہمارے لیے باعزت بھاگنے کی بھی راہ نہ رہی تو احرار والنٹیروں کے سالار نے بھی بزن کا حکم دے دیا۔ احرار کے والنٹیر دست بدست لڑائیوں میں زیادہ سلجھے ہوئے تھے۔ ان کا ہاتھ دوسروں کی نسبت زیادہ رواں تھا۔ آدھ گھنٹہ کی دھینگا مشتی اور لٹھم لٹھا کے بعد مولانا ظفر علی کی فوج ظفر موج اس طرح پسپا ہوئی کہ جوتے پگڑیاں وہیں چھوڑ گئی۔ زمیندار۔ احسان۔ انقلاب وغیرہ تمام مخالف اخباروں نے خطرناک سرخیاں دے کر خبریں شائع کیں۔ اس طرح کونے کونے کے احرار کو خبر پہنچ گئی کہ اب مرکز کی پالیسی یہ ہے کہ مخالفوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ غریبوں میں

زخم کھانے اور زخم لگانے کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارے مخالفوں کو جلدی ہی معلوم ہو گیا۔ کہ زُود خُورد کے معاملہ میں بھی احرار کے مقابلہ کو مدت چاہیئے۔ دو ہی ماہ کے عرصے میں تمام مخالف ہتھیار ڈال کر دور جا کھڑے ہوئے۔ اب صرف اخباروں کے کالموں میں جھوٹ کے پلندے باندھ باندھ کر ہمیں ڈرانے لگے۔

احرار اور عدم تشدد

مجلس احرار بے شک سیاسیات میں عدم تشدد کی قائل ہے یعنی حکومت کے تشدد کو جبر سے برداشت کیا جائے۔ اسی اصول سیاست کو ہم نے کئی ماہ شہید گنج کے ایجی ٹیشن میں بھی استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مولانا ظفر علی خان اور ان کے رفقاء نے ہمارے خلاف غنڈہ گردی کی انتہا کر دی کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ ہم پر تیزاب ڈالے گئے۔ ہمارے صبر نے ہمارے مخالفوں کا حوصلہ بہت بڑھا دیا۔ لیکن جب اس غنڈہ گردی کا انتظام اور انتظام کے ساتھ مقابلہ کیا تو دو ماہ کے اندر اندر مخالفت کے بادل چھٹ گئے اور صرف تحریر تک معاملہ محدود ہو گیا۔ ہم نے اپنا روزنامہ "مجاہد" نکال رکھا تھا۔ وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہا۔ پھر ہمارا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ بالآخر حکومت نے اس کی ضمانت طلب کر لی۔ غریبوں کا یہ اخبار کسی بڑے مالی نقصان کو برداشت کرنے کے قابل نہ تھا لاچار اسے بند کرنا پڑا۔ اب پھر مخالفوں کے لیے میدان صاف ہو گیا۔ پھر ہمارے خلاف جھوٹ کا طوفان اٹھایا گیا۔ ہمارے عدم تشدد کی پھبتیاں اڑانے لگے۔ احرار کے لیے عدم تشدد سیاسی پالیسی ہے مذہب نہیں۔ جب جان اور آبرو پر بن آئے تو ہر ہتھیار کا اٹھانا جائز ہے۔

جھوٹ کی دیوار گرنا شروع ہو گئی

"مجلس اتحاد ملت" آخر کیا ہے؟ اس میں وہ تمام عناصر شامل تھے جنہیں احرار کی مخالفت منظور تھی۔ مگر ان میں کوئی ذہنی اتحاد نہ تھا۔ زیادہ تر وہ اصحاب شامل تھے۔ جو خالص کانگریسی ذہن رکھتے تھے اور مسلمانوں کی کسی اور جماعت کا عُروج دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ خُصوصاً مجلس احرار کی سی غریبوں کی جماعت سے انہیں اسی لیے بیر تھا۔ وہ غریبوں کو منظم اور طاقتور دیکھ کر کچلے ہوئے سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتے تھے۔ ظاہر

ہے کوئی جماعت کسی اور جماعت کی مخالفت پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا اپنا پروگرام ہونا چاہیئے۔ مگر شہید گنج کے حامیوں کا تو کسی مسجد کی تقدیس پر ہی اتفاق نہ تھا کہاں ڈاکٹر عالم اور کہاں مسجد شہید گنج؟ وہ تو الیکشن جیتنے کے لیے مسجد کی آڑ لے رہے تھے۔ مجلس احرار کے ساتھ غریب جماعت ہونے کے باعث انہیں تعاون سے گھن آتی تھی۔ اس لیے اکثر واقعی ان میں جوتا چلا۔ رپٹ رپورٹ تک بھی نوبت پہنچی۔ اتحاد ملت میں ایسے لیڈر پیدا ہو گئے جو کسی سیاسی اخلاق کے مالک نہ تھے۔ ہر روز کے رگڑے جھگڑے سے مولانا ظفر علی خاں کی اتحاد ملت کا وقار کم ہونے لگا۔ سیاست اسلامی کے اس شاطر کامل یعنی میاں سر فضل حسین کی عُقابی نظر نے ڈلہوزی کی بلندیوں سے دیکھا کہ کیا کرایا کام بگڑ رہا ہے۔ اس لیے مولانا ظفر علی خاں کو جو، اب سرکاری مُہرے کے طور پر کام کر رہے تھے پہاڑ پہ بلایا۔ میاں سر فضل حسین کا خیال تھا کہ احرار کا اثر و رسوخ زیادہ تر ان کی اپنی تنظیم اور بہادری پر قائم ہے۔ کچھ اثر مرزائیت کی مخالفت کے باعث بھی ہے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ مرزائیت کو نقصان پہنچائے بغیر تردید مرزائیت کا کام مولوی ظفر علی کے ہاتھ میں دیا جائے۔ اس طرح پبلک کی رہی سہی توجہ احرار سے ہٹا کر اتحاد ملت اور مولانا ظفر علی خاں کی طرف کر دی جائے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا۔ کہ احرار کو اس منصوبے کی خبر ایک ایسے شخص نے دی جس کو میاں صاحب اپنا بڑا معتمد سمجھتے تھے۔ لیکن وہ دل سے میاں صاحب کے عروج کا مخالف تھا۔ اس نے اپنے خاص آدمی کی معرفت پیغام بھیجا کہ تجویز یوں ہوئی ہے کہ مرزائیوں کے خلاف مقدمہ دائر کر کے انہیں خارج از اسلام قرار دلایا جائے۔ مطلب یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کی توجہ فضول مقدمہ بازی کی طرف مبذول ہو جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انگریزی عدالت بالآخر مرزائیوں کے حق میں فیصلہ دے گی۔ مرزائیوں کا اسلام بھی ثابت ہو جائے گا اور کئی سال تک مذہبی رجحان رکھنے والے مسلمانوں کی ہمدردی بھی احرار سے کم ہو جائے گی۔ جوں ہی معتبر ذریعہ سے یہ رپورٹ ہمیں پہنچی۔ ہم نے اسے اخبارات میں شائع کر دیا۔ اور اسی اشاعت میں اخبار "زمیندار" نے میاں سر فضل حسین کی تجویز کو اپنی تجویز ظاہر کر کے شائع کیا۔ ہماری اطلاع بہت پہلے صبح ہی اخبارات میں پہنچ چکی تھی۔ تمام اخبارات اور پبلک کو یقین آ گیا۔ کہ مولانا فریب افرنگ میں آ گئے ہیں۔ مولانا نے خود بھی محسوس کیا کہ گویا وہ گناہ کبیرہ کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ تجویز کا بھانڈا پھوٹ جانے پر مولانا نے ایسی چپ سادھی کہ پھر کچھ نہیں بولے۔ مولانا صاحب اور میاں صاحب کی

رلی بھگت کا شہرہ ہر طرف پھیلا۔ اس سے ان کے مداحوں میں اور مایوسی پھیلی۔ لوگوں نے سمجھ لیا۔ کہ مولانا سستے داموں بک گئے ؛

داخلۂ اسمبلی کا ریزولیوشن

مجلس اتحاد ملت جو مولانا ظفر علی کی واحد ملکیت تھی۔ اس میں ڈاکٹر محمد عالم کے اصرار پر اسمبلی میں داخل ہو کر شہید گنج کو حاصل کرنے کا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ یہ ریزولیوشن اتحاد ملت کے تابوت میں آخری میخ ثابت ہوا سب نے سمجھ لیا کہ جو احرار نے کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ اتحاد ملت کا تو عملاً خاتمہ ہو گیا۔ البتہ ڈاکٹر عالم اور ملک لعل خاں کو اسمبلی میں امیدوار کھڑے ہونے کے لیے ایک مردہ جماعت کا نام مل گیا۔ یہ ساری خون ریزی یہ سارا ایجی ٹیشن گویا اس لیے تھا کہ دو دوستوں کو اسمبلی میں جانے کا موقعہ مہیا کیا جائے۔ سعید روحوں نے اس جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ چند کرایہ کے ٹٹو رہ گئے۔ جو الیکشنوں میں تھوڑی بہت مالی امداد کی امید پر اتحاد ملت کی ٹوٹی کشتی سے چمٹے رہے۔ اب پھر احرار کا بول بالا ہونے لگا۔ ہم مستعد ہو کر ان زہریلے اثرات کو دور کرنے میں لگ گئے۔ کسی کے خلاف بدظنی پھیلانا کیسا آسان ہے، مگر اس کا ازالہ کرنا کیسا دشوار ہے۔ بدظنی باز کی طرح تیز رفتار ہوتی ہے۔ حسن ظن چیونٹی کی طرح سست رَو ہوتا ہے۔ ہم نے بہت محنت کی۔ شہروں میں تو سوائے ابدی نامرادوں کے سب ہمارے ہم خیال ہو گئے البتہ دور دراز مقامات میں ہم نہ پہنچے۔ وہاں ہمارے خلاف تعصب موجود رہا؛

احرار کی سول نافرمانی

اسلام اگر ایک طرف کفر کا سر نیچا کرتا ہے تو یہ دوسری طرف سر جا نکالتا ہے۔ مرزائیت یوں تو ہر گوشہ ملک میں نامراد و ناکام ہو چکی تھی۔ لیکن شہید گنج کے ایجی ٹیشن میں احرار کی کمزوری اور اس کی توجہ مدافعانہ کارروائیوں کی طرف دیکھ کر اسے اپنی زندگی کی امید پیدا ہو گئی۔ اور مرزائیوں نے اسی عرصہ میں تمام علاقے گورداسپور کو اپنے زیر اثر لانے کی سعی کی۔ حکومت کی مہربانی سے احرار کا داخلہ سارے ضلع میں بند کر دیا گیا تھا۔ اب ہمارے

لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کہ ہم قربانی کر کے ضلع بھر کے مسلمانوں کو یقین دلائیں۔ کہ ہم کسی مصیبت میں بھی مرزائیت کی اسلام دشمنی کو بھولے نہیں اور احرار ہر حال میں تمہارے ساتھ ہیں۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ صاحب باوجود امتناعی احکامات کے قادیان میں جمعہ پڑھانے چلے گئے۔ اور گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے۔ اسی طرح یو۔پی سے مولانا محمد قاسم اور پنجاب سے قاضی احسان احمد اور ہیں سرکاری احکامات کی خلاف ورزی کر کے گرفتار ہوئے۔ پھر ہمارے مہربانوں نے انگریزی سرکار کو سمجھایا کہ یہ تو تم نے مردہ جماعت کو زندہ کر دیا۔ مرزائیوں نے بھی محسوس کیا کہ یہ تو الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ سرحد اور علاقہ غیر میں اس سول نافرمانی کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ آخر حکومت کو اپنا تھوکا چاٹنا پڑا اور حکم امتناعی واپس لے کر عام ہیجان کو روکنے کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا۔

مسلم لیگ سے ہمارا تعاون

ایک مدت سے مسلمانوں کے آئین پسند طبقے میں میاں سر فضل حسین اور مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) رہنمائی کے دعویدار تھے۔ ان دونوں کا ڈکٹیٹرانہ دل و دماغ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے حق میں شمشیر برہنہ تھے۔ اور کوئی شخص ان کے مزاج میں دخیل نہ تھا اور وہ [illegible] سنتے تھے۔ اس لیے کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ کہ ہمت کر کے ان کو کہتا کہ جنگ سے صلح بہتر ہے۔ دونوں میں میاں فضل حسین زیادہ باتدبیر تھے۔ میں نے ہندوستان میں ان سے زیادہ کایاں شخص کوئی نہیں دیکھا۔ وہ سیدھی بات کرنے کے قائل نہ تھے۔ ہوشیار سے ہوشیار آدمی کا آسانی سے شکار کھیل لیتے تھے۔ کوّے کا شکار کرنا ہو تو بندوق کی نالی دوسری سمت رکھ کر کندھوں کے برابر اٹھانا چاہیئے۔ پھر اچانک رُخ کوّے کی طرف کر کے نشانہ باندھنا چاہیئے تاکہ زیرک جانور شکاری کی چال سے بے خبر رہے اور اڑنے کا موقعہ نہ پائے۔ ایسی ہی میاں صاحب کی تدبیریں ہوتی تھیں۔ وہ بڑے مزاج شناس تھے۔ اسی انداز سے بات کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ پُرپیچ راستوں سے گزر کر مخالف کی پشت پر آنکلتے تھے۔ خاتمہ کر کے بھی دشمن کی موت کا الزام سر نہ لیتے تھے۔ برخلاف اس کے مسٹر جناح سیدھی راہ سامنے سے آکر چوٹ کرتے تھے۔ دشمن کو ہوشیار اور خبردار کر کے وار کرنا مشکلات میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی لیے مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی

کے مقابلے میں کانگریس سے پٹ کر نکلے اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ میں میاں صاحب کے جیتے جی معقول جگہ حاصل نہ کر سکے۔ حکومت ہند کی نظر میں مسٹر محمد علی جناح، میاں سر فضل حسین کے سامنے ایک بے اثر شخصیت رہی۔ اب جب الیکشن کی گہما گہمی ہوئی تو قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے دوڑ گھوم کر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنا چاہا۔ وہ لاہور آ کر میاں صاحب پر ڈورے ڈالنے لگے۔ مگر میاں صاحب کچی گولیاں نہ کھیلے تھے۔ انہوں نے صاف جواب دیا کہ خالص اسلامی جماعت کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنا عملی سیاسیات میں مفید نہیں کیوں کہ اسلامی صوبوں میں مشترکہ حکومت کے سوا کوئی اور صورت نہیں۔ ہندوستان کی سیاسیات میں ایک بڑی الجھن یہ ہے کہ ہندو مسلمان عملاً دو دشمن قومیں ہندوستان میں آباد ہیں۔ مسلمان چونکہ محسوس کرتا ہے کہ ہندو اسے بطور اچھوت کے سلوک کرتا ہے۔ اس لیے عام حالات میں کسی قسم کے تعاون کے لیے تیار نہ تھے۔

دنیا کی سیاسیات کے دو رُخ ہیں۔ اصلاح پسند لیڈر نیکی اور اخلاق کا بیج بو جانے پر پُر اطمینان زندگی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ فوری کامیابی کو کامیاب زندگی کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ مسٹر جناح اور میاں سر فضل حسین دونوں آخری خیال کے علم بردار ہیں۔ ان کے سیاسی جوڑ توڑ فوری کامیابی کے کفیل ہوتے ہیں۔ وہ دونوں سرمایہ دارانہ نظام کی موجودہ صورت سے فائدہ اٹھانے کے قائل ہیں۔ اس نظام میں تبدیلی کی سر دردی مول لینا پسند نہیں کرتے۔ اگر میاں سر فضل حسین اور مسٹر جناح میں فرق ہے تو یہ کہ میاں صاحب حکومت کی مشین کا پرزہ بن کر زندہ رہے اپنے مفاد اور قومی مفاد دونوں کے پلڑے برابر رکھے۔ یعنی شخصی نشان کو برقرار رکھ کر اپنی صواب دید کے مطابق قومی خدمت کو جاری رکھا۔ مسٹر جناح کامیاب بیرسٹر تھے۔ اس لیے حکومت کی مشینری سے بے نیاز تھے لیکن اپنی شخصیت کو نمایاں رکھنے کے لیے کسی سے کم بے تاب نہ تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ میاں صاحب اور مسٹر جناح اسلامی سیاسیات کی نیام میں دو تلواروں کی طرح گنجائش نہ پا کر ہمیشہ الگ الگ اور برسرِ پیکار رہے۔ تاہم میاں صاحب بڑے ہوشیار تھے۔ مسٹر جناح نے ان کے مقابلے میں ہمیشہ خاک چاٹی۔ میاں صاحب کی کامیاب چالوں نے تو مسٹر جناح کو قطعی مایوس کر دیا تھا۔ لیکن نئی اصلاحات کی گرماگرمی نے پھر مسٹر جناح کی عروق میں خون دوڑا دیا۔ انہوں نے پھر پھریری لی اور میاں صاحب کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ میاں صاحب کی عام سیاسیات سے احرار کو بھی اتفاق نہ ہوا۔ ہاں مسلمانوں کے حقوق حاصل کرنے میں ہم نے کبھی کوتاہی نہیں برتی۔ اگر میاں صاحب سے اتفاق کرنا پڑا تو اس سے گریز نہیں کیا۔ لیکن آزادیٔ ہند کے مسئلہ میں وہ زیادہ لینے تاب نہ تھے۔ اس لیے ہماری ہمدردیاں مسٹر جناح کے ساتھ رہی ہیں۔ لیکن یہ قیاس نہ کیا جائے کہ ہم مسٹر جناح کو انقلابی شخص سمجھتے تھے۔ نہیں۔ بلکہ میاں صاحب کی نسبت مسٹر جناح کو اپنی سیاسیات کے قدرے قریب سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ جب کانگریس اور جمعیت العلماء نے بھی لیگ کے ساتھ تعاون کا اعلان کر دیا۔ تو ہمیں اپنی جگہ سوچنا پڑا کہ کانگریس نے بطور ملکی جماعت اور جمعیت نے بطور مذہبی جماعت لیگ کو قبول کر لیا تو ہمیں تعاون میں کیا عذر ہے؟ اس لیے اسلامی سیاسیات کی صورت یہ تھی کہ ملک کا رجعت پسند طبقہ زیرِ سایہ برطانیہ منظم ہو رہا تھا تاکہ آزاد خیال افراد کا مقابلہ کرے۔ لیگ اور احرار کا باہمی تعاون ناگزیر تھا۔ اس لیے ہم نے لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہونا قبول کر لیا۔

لیگ کا سرمایہ دارانہ نظام

اگرچہ عقل کا تقاضا یہ تھا مگر تجربے کی تلخی نے عمل میں اور رنگ پیدا کر دیا۔ جوں ہی ہم نے لیگ میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ امراء کے ایوان میں زلزلہ آ گیا۔ امراء نے سوچا کہ مفلسی ہمارے گھر میں کیسے گھس آئی؟ کوئی تدبیر لڑاؤ کہ احرار مکھن سے بال کی طرح نکال دیئے جائیں۔ سرمایہ دار بے حد ہوشیار تھا۔ احرار کا اخلاص تدبیر سے لاپرواہ رہا۔ مگر تدبیر کیا کرتے جہاں سرمایہ کا سوال ہو وہاں اخلاص کو ہتھیار ڈال دینے ہوتے ہیں۔ پہلے لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے ۵۰ روپے کی رقم مقرر تھی۔ اب احرار کو لیگ کے ٹکٹ کا خریدار دیکھ کر اربابِ لیگ نے بھاؤ بڑھا کر ۵۰۰ روپے کر دیا۔ تاکہ غریب احرار کا کوئی امیدوار اتنی رقم دے کر ٹکٹ نہ حاصل کر سکے۔ ہم نے ہزار چاہا کہ یہ رقم ۲۵۰ ہی ہو جائے تو مشکل آسان ہو۔ مگر اس میں کامیابی بہت دور دکھائی دی۔ ناچار احرار نے اپنے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ جب امرائے لیگ نے سمجھا کہ اب خطرہ ٹل گیا۔ کھل کھیلے اب پھر وہی ۵۰ روپے شرح ٹکٹ ٹھہری۔ غریبوں کا امیروں کے نظام میں گھس آنا آسان نہیں۔ جو اسے کھیل سمجھتے ہیں تجربے کی تلخی سے بالآخر متاثر ہوتے ہیں۔ جمہوری ادارے جن پر سرمایہ دار قابض ہوں ان میں داخل ہونا بڑا کٹھن کام ہے۔ پھر ان پر قابض ہو کر عوام کے مفید مطلب کام چلانا کھیل نہیں۔

جو پچے کھیلیں۔ بابو سبھاش چندر بوس کی کوششوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ کانگریس کے سرمایہ دارانہ نظام پر فائق ہونے چلا تھا۔ آخر روپوش ہونا پڑا۔ سوشلسٹ بھی نیشنل فرنٹ بنا کر کانگریس میں افتدار پیدا کرنے گئے۔ اپنی جماعتی انفرادیت بھی کھو بیٹھے اور کانِ نمک میں نمک ہو کر رہ گئے۔

جب بھی احرار کو ایسا مرحلہ درپیش ہو۔ انہیں اپنے موجودہ تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ خوب سوچ بچار کر اور پوری تیاری سے کسی سرمایہ دارانہ نظام میں داخل ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ منہ کی کھا کر واپس لوٹنا پڑے۔

سر سکندر حیات اور احرار

سر سکندر حیات خاں کی سیاسیات نے اگرچہ میاں سر فضل حسین کے زیرِ سایہ پرورش پائی۔ مگر انہوں نے میاں صاحب کی امیدوں کو مایوسیوں میں بدل دیا۔ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ میاں صاحب سر فضل حسین ہندوؤں کی نظر میں اورنگ زیب کا بُروز تھے۔ سر سکندر نے بڑھ کر امید دلائی کہ ہندوؤں کے لیے وہ اکبر ثابت ہوں گے۔ اس طرح وہ ہندوؤں کا سہارا پا کر وہ اُبھرے خاندانی خدمات کے باعث انگریزوں نے اُن کا ہاتھ تھاما۔ یہ گمنامی کی سطح سے اونچے اٹھے۔ پہلی دفعہ پولیس کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ پھر سائمن کمیشن کی تعاونی کمیٹی کے صدر بنے۔ اس صدارت میں راجہ نریندر ناتھ لیڈر ہندو پارٹی کے اثر و رسوخ نے بڑا کام کیا۔ پنجاب کے ہندوؤں کو میاں صاحب کے مقابلے میں مہرہ درکار تھا۔ سر سکندر بھی انہیں پوری پوری امید اور حوصلہ دیتے رہے۔ ہندو ان سے خوش یہ ہندوؤں سے راضی راضی خوشی دونوں آنے والے دور کے دن گننے لگے۔ وہ انگریز کو تسلی اسی خوبی کے باعث بنائے گئے کہ برخلاف میاں صاحب کے ہندو پارٹی کو آپ پر اعتماد تھا۔ سر سکندر کی یہی خوبی ان کی گورنری کا باعث ہوئی۔

میاں سر فضل حسین اگرچہ انگریزی سیاسیات کی کَل کا بہترین پرزہ تھے۔ لیکن انہیں اپنی لیاقت اور کامیاب سیاسی چالوں پر اتنا ناز تھا کہ وہ انگریز افسران کی ناز برداری کے بجائے اُن سے خوشامد

کی توقع رکھتے تھے۔ انگریز اعلیٰ افسران سے ان کا رات دن کا رگڑا جھگڑا تھا۔ اور ہر مرحلے پر من مانی منوانے تھے۔ اور خود کسی کی نہ مانتے تھے۔ اس لیے انگریز حکّام جہاں ان کے کانگریس کے مقابلے میں کامیاب سیاسی ہتھکنڈوں کے معترف تھے وہاں ان کی تحکمانہ دراز دستیوں کے شاکی تھے۔ میاں صاحب کئی انگریز اعلیٰ افسروں کو ذلیل کر کے نکال چکے تھے۔ جس کو ذرا سرکش پاتے تھے اس کی سرکوبی پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ میاں صاحب کی یہ ادا انگریز کو نہ بھاتی تھی۔ برخلاف اس کے سر سکندر حیات خاں انگریزوں کے معاملہ میں ایسی مُروّت برتتے تھے کہ حاکم ہو کر محکوم نظر آتے تھے۔ انگریزی حیثیات کے احترام میں وہ ہندوستانی یا اسلامی حقوق کے لیے بلند بانگ نہ تھے۔ مطالبات کے بجائے عرضداشتوں کے قائل تھے۔ مبادا انگریز کا مزاج برہم ہو جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

ظاہر ہے کہ میاں صاحب کے مقابلے میں احرار کو سر سکندر حیات سے کوئی دل بستگی نہ تھی۔ مگر مصیبت یہ آئی کہ میاں صاحب نے سر سکندر حیات کے مقابلہ میں مرکزی حکومت میں اپنا اقتدار رکھنے کے لیے ظفر اللہ خاں قادیانی کو بڑھایا اور مسلمانوں کے جذبات کو پامال کر کے سیاسیات میں اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہا۔ انہوں نے اس مسئلے کی اہمیت کو نہ سمجھا اور نہ احرار کی قوت کا ابتدا میں پورا اندازہ کیا۔ لیکن جب طوفانِ مخالفت بڑھ گیا۔ تو احرار کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لیے اور کامیاب تدبیریں کیں۔ بے شک ان تدبیروں سے احرار کمزور ہو گئے۔ لیکن میاں صاحب کے اثر و رسوخ کو بھی ایسا دھکّا لگا کہ وہ پھر سنبھل نہ سکے۔ اور ان کا اپنے ہی غلط عمل سے دل ٹوٹ گیا۔ جب میاں صاحب فوت ہوئے تو سر سکندر کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ پہلے تو وہ لوگ سے وابستہ اس لیے ہو گئے تھے۔ کہ مسلمانوں میں میاں صاحب کا کامیاب مقابلہ ہو سکے۔ ان دونوں احرار سے دل بستگی کی بظاہر وجہ یہی تھی۔ لیکن اب انہیں آئینی کامیابی کے لیے میدان صاف نظر آیا اور مسٹر جناح کو دُھتّا دیا اور احرار کو بھی ٹھینگا دکھایا۔

لیگ میں صرف شہری سرمایہ دار تھے۔ دیہات کی جامد آبادی کے سردار زمیندار انگریز افسروں کی ٹھوکر میں ہیں۔ دیہات میں کون زمیندار ہے جو سرکار کے اشارے کو سمجھ کر سرتابی کرے؟ اسمبلی میں ممبروں کی بڑی اکثریت دیہات سے آئی ہے۔ اس لیے سر سکندر کو لیگ کی چنداں پروا نہ تھی۔ معرکہ صرف احرار اور

سر سکندر حیات کی یونینسٹ پارٹی سے تھا۔ کیوں کہ بعض دیہاتی حلقوں میں احرار کا باوجود شہید گنج گرانے کی کامیاب چال کے اب بھی کافی اثر و رسوخ تھا۔ احرار اگرچہ آزادیِ ہند کے ان تھک سپاہی ہیں مگر ہندو سرمایہ داروں کو اس کی پروا نہیں وہ ہر حال میں مسلمان سرمایہ داروں کے ساتھ ہیں۔ احرار سے دونوں خائف تھے۔ اس لیے ہندوؤں کے اونچے طبقے کی ہمدردی سر سکندر کے ساتھ تھی ؛

جعلی اشتہار بازی

جس طرح لیبر پارٹی کو گذشتہ الیکشن انگلستان کی انتخابی مہم میں تارے دیکھنے پڑے تھے۔ کیوں کہ لیبر پارٹی پر بولشویکوں سے سازباز کا افسانہ تراش کر اس کی اشاعت کی گئی تھی۔ اس طرح ہمارے خلاف شہید گنج کے سلسلہ میں مولانا مظہر علی کا میرے نام فرضی خط اشتہارات کی صورت میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کیا گیا۔ اس سارے کام میں مرزائیوں کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ ان دنوں ہمارے خلاف قادیانی جماعت نے اخبارات کو خاص امداد دی۔ یہ اشتہار الیکشن کے عین ایک دن قبل شائع کیا گیا۔ جہاں احرار امیدوار کھڑے تھے۔ یہ اشتہار خاص طور پر تقسیم ہوا۔

میرا حلقہ انتخاب سر سکندر اور اس کے ساتھیوں کی توجہ کا مرکز رہا۔ ہمارا سب سے زیادہ زور ان حلقوں میں رہا جہاں مرزائی اور مرزائی نواز امیدوار کھڑے تھے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ موجودہ اسمبلیوں سے پہلے جب صوبہ جات میں دوعملی تھی۔ اس وقت کی کونسلوں کے ابتدائی برسوں کے انتخابات میں گھوڑا گاڑی کا خرچ ناجائز تھا۔ اس لیے بعض غریب اور درمیانے طبقے کے لوگ بھی کامیاب ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کونسلوں میں انتہا پسندوں کا زور ہو گیا۔ حکومت نے فوراً معاملہ کو بھانپ لیا اور غریب طبقے کو غریبوں کی نمائندگی سے محروم کرنے کے لیے انہوں نے موٹروں اور موٹر کاروں کی عام اجازت دے دی تاکہ ووٹر پیدل نہ آئیں۔ اس ایک حکم غریب امیدواروں کا کامیاب ہونا مشکل بنا دیا۔ پھر تو کونسلیں اور اسمبلیوں کے انتخابات صرف سرمایہ داری کے کرتب رہ گئے۔ اب صرف کانگریس اور لیگ کے امراء کے لیے کامیابی ہے۔ غریب عوام کا اسمبلیوں میں عمل دخل ممکن نہیں ؛

میری شکست

میرے حلقہ انتخاب میں سرگرمی زیادہ رہی۔ میرے علاقہ کے امراء غیر راجپوت مجھ سے زیادہ خوش نہ تھے۔ انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ راجپوت قوم کا پہلے ہی زیادہ اثر ہے۔ اگر اس دفعہ یہ کامیاب ہو گیا تو شاید حکومت پر قبضہ جما بیٹھے۔ اس لیے راجپوتوں کا اقتدار اور بڑھ جائے گا۔ یہ قطعی غیر اسلامی تصور تھا۔ مگر ہندوستان کا مسلمان اسلامی اسپرٹ سے ناآشنا ہے۔ کہ وہ ہر جگہ چند امراء کے زیر اثر ہے۔ امراء کے ایمان کی کائنات اس اعتقاد سے خالی ہوتی ہے کہ مسلمان سب بھائی ہیں۔ اسی لیے عوام بھی ان ہی کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں علاقہ مالی لحاظ سے کمزور اور تعلیم زیادہ ہے۔ لازمی طور سے ہر نوجوان کی زندگی کی اُمید سرکاری ملازمت ہے۔ میں زندگی بھر حکومت کا مخالف رہا۔ یہ امیدیں میری معرفت پوری نہ ہوتی تھیں۔ یوں بھی امراء کے لڑکوں کے سوا عوام کو ملازمت کہاں ملتی ہے؟ سر سکندر حیات خاں نے لوگوں کو بڑے سبز باغ دکھائے ہر نوجوان یہ سمجھا کہ افضل حق کو نیچا دکھایا تو ڈپٹی ہوئے۔ علاوہ ازیں اعلیٰ ادنیٰ ہر ملازم کو خیال تھا اور بڑا حوصلہ افزائی ہوتی تھی کہ افضل حق سرکار کا دشمن اور اس کا ساتھی حکومت کا باغی سمجھا جائے گا۔ کیوں کہ وہ دیکھتے تھے کہ سر سکندر خود افضل حق کے خلاف دوڑا بھاگا پھرتا ہے۔

میری شکست کی سب سے موثر وجہ یہ ہوئی کہ لاہور کے لولے لنگڑوں کو مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالقادر اور ڈاکٹر عالم کی جماعت اتحاد ملت نے اس غرض سے بھیجا تاکہ وہ علاقہ میں پھر کر لوگوں میں یہ پروپاگنڈا کریں کہ افضل حق نے مسجد شہید گنج گروائی۔ اور اسی نے خود کھڑے ہو کر مسلمانوں پر گولی چلوائی دیکھو اسی ظالم نے گولی چلوا کر ہمیں لولا لنگڑا کر دیا۔ وہ دردناک لفظوں میں اپیل کرتے تھے۔ ایک دو پولنگ اسٹیشنوں پر اس کا بہت برا اثر ہوا۔ ایک عام آگ سی لگ گئی۔ اس طرح مجھے اس حلقہ سے شکست ہوئی۔ جہاں سے مجھے شکست کی امید نہ تھی۔ میری شکست یونینسٹ پارٹی کی بڑی فتح تھی۔ کیوں کہ میں انتخابی مہم کا لیڈر تھا۔

لیکن ایک شکست میں فتح کے پھریرے اڑا کر شاد کام لوٹنے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ کم از کم بارہ ممبر ایسے تھے جو احرار کی مدد سے کامیاب ہوئے تھے۔ چونکہ وہ درمیانے اور اعلیٰ طبقے سے متعلق تھے۔ اس لیے امراء کی

آوازمیں ان کے لیے زیادہ کشش تھی۔ علاوہ ازیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اونچی کرسی پر بیٹھ کر غریب بھی اونچے طبقے کی سی سوچنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احرار کے سب ممبر امرار کے کانِ نمک میں پڑ کر نمک ہو گئے۔ اور احرار سے تعلق توڑ بیٹھے۔ یہ صورت حال صرف اسمبلی کے الیکشنوں میں ہی نہیں ہوئی بلکہ میونسپل انتخابات میں بھی یہی صورت درپیش ہوئی۔ لودھیانہ، جالندھر، لائل پور میں غریب اور درمیانہ طبقہ کے لوگوں نے احرار کے نام پر فتح پائی اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کا ٹاٹ الٹ دیا۔ لیکن جونہی کامیاب ہوئے اور سوسائٹی میں ایک درجہ حاصل کر لیا۔ پھر کرسی نشین ہو کر خاک نشین احرار کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ یہ صرف احرار کا ہی تلخ تجربہ نہیں۔ بلکہ مجلس خلافت نے پنجاب میں الیکشن لڑے، گمنام لوگوں کو ممبر بنایا۔ ان لوگوں نے نام ور ہو کر مجلس خلافت کی پرِکاہ کے برابر پروا نہ کی۔ دونوں جماعتوں کے تلخ تجربہ کی بنا ہی پر اصول وضع کرنا پڑتا ہے کہ انتخابات میں غریب جماعتیں بے حد احتیاط برتیں اپنی پارٹی کے تجربہ کار اور ایثار پیشہ ممبروں کو آگے بڑھائیں۔ ہر سائل کو جماعت کا ٹکٹ نہ دیں۔ جماعت سے وفاداری بڑے ایثار کا کام ہے۔ بلند درجہ پر پہنچ کر اور بلند ہونے کی آرزوئیں دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔ اور کمتر درجہ کے لوگوں کی خدمت کا پاک جذبہ خود غرضیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سیاسیات میں ہمیشہ یہ خیال رہے کہ بھان متی کا کنبہ مضبوط پارٹی کا کام نہیں دے سکتا۔ پارٹی کے ممبر پختہ خیال ہوں اور پارٹی کے پروگرام پر جان دینے والے ہوں۔ سیاسی پارٹی فوجی مشین سے زیادہ مضبوط ہو تو بات ہے ورنہ ریت کی دیوار بھلی ؛

فوجی حکومت کا قیام

سر سکندر بقول مسٹر جناح، مسٹر ایمرسن گورنر پنجاب کی پیداوار تھے۔ ہماری غلطی یہ تھی کہ ہمارے دیہاتی امیدوار پرانی جاگیرداری کے نمائندہ تھے۔ ہم نے ان کے وعدے پر اعتبار کر کے اپنی انقلابی مشین کے پُرزے ثابت ہونے کی توقع کر لی۔ وہ جونہی اسمبلی میں آئے فطرت کے قانون کا عام عمل اُن کی طبیعتوں پر حاوی ہو گیا۔ ان کے رجحانات انقلابی ہونے کے بجائے سرمایہ دارانہ تھے۔ انقلابی جماعتیں ہمیشہ غریب ہوتی ہیں۔ سرمایہ داروں کو غربار سے قلبی نفرت ہوتی ہے۔ البتہ غرباء سے غرض پوری کرنے اور ان پر حکومت جاری رکھنے کے خیال سے

نفرت کو چھپانا ہوتا ہے۔ آبرو باختہ عورت چاہے کسی کو چاہے نہ چاہے۔ مگر وہ چہرے پر شیریں تبسم کا خوش نما نقاب اوڑھے رکھتی ہے۔ اور یوں دل کی کدورت چھپی رہتی ہے۔ اعلیٰ طبقے کے ظاہری اطوار بہت بلند ہونے چاہئیں تاکہ عوام ان کے شکار رہیں۔ مکاری اعلیٰ طبقے کا خاص فن ہے۔ جس کے بغیر حاکم خاندان عموماً برباد ہوتے ہیں۔ اور ان کو انقلاب کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ غریب اور انقلابی جماعتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ طبقہ کے ممبروں کو دیر تک زیر تربیت رکھنے کے بعد اُنہیں ذمہ داری کے کام پر لگائیں۔ ذہنیت بدلے بغیر ان سے ہر وقت خدشہ رہتا ہے کہ وہ پھر کان نمک میں نمک ہو جائیں گے۔ ہم نے یہی غلطی کھائی کہ سمجھا کہ امرا، غریب طبقے کے لیڈروں کی رہنمائی قبول کر لیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی طبیعت کے تقاضوں کے مطابق ہم جنس امرا کا ساتھ دینا شروع کیا۔ جو ایک آدھ غریب ممبر تھا وہ بلند درجہ پر پہنچ کر احرار کو اونچے طبقے کی طرح ذلت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اور پھر ڈر یہ بھی تھا کہ سر سکندر حکومت انگریزی کا پروردہ ہے۔ انگریز ہر حال میں اس کی پشت پناہی کرتا ہے وہ احرار سی باغی جماعت سے وابستہ ہو کر خطرات کیوں برداشت کریں۔ غرض آئندہ کے لیے ایک سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے جماعت سے باہر کے لوگوں پر اعتماد نہ کیا جائے۔ اگر احرار کو غریبوں کی نمائندہ جماعت کا لقب قائم رکھنا ہے تو اعلیٰ طبقے سے امید وفاداری فضول ہے۔ اور ناتربیت یافتہ غریب بھی اونچی کرسی پر بیٹھ کر غریبوں کے حال کو بھول جاتے ہیں۔ پس احرار کو کسی حال میں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ غریب انقلابی جماعتوں کو اپنے ممبروں کی ذہنی تربیت پر اعتماد کے سوا چارہ نہیں۔ اسی پر زندہ دینا راہ نجات ہے۔

لودھیانہ، جالندھر، لائل پور کے میونسپل انتخابات میں ہمیں پوری کامیابی ہوئی۔ مگر یہ ممبر احرار سے وفادار نہ رہے۔ انہوں نے کانگریس اور لیگ کی طرف جھکنا پسند کیا۔ اس لیے کہ احرار پارٹی میں سرمایہ دار لوگ نہیں۔ عام طبیعتیں مشکل پسند نہیں کبھی کبھی جیل ہو آنا بھی معمولی بات ہے عام احرار کی روزانہ زندگی جیل کی زندگی سے کم تکلیف دہ نہیں۔ بس ایسی تکلیف دہ زندگیاں بسر کرنا یا ان سے وابستہ ہونا کچھ آسان کام نہیں۔ سرمایہ دارانہ ذہن رکھنے والے لوگ اسی لیے کانگریس میں رہ کر آسودہ ہیں کہ کانگریس کا عام ذہن سرمایہ دارانہ ہے۔ غرض احرار کی شکست کے بعد جس کی عام ذمہ داری شہید گنج گرانے کی سکیم کی مرہون منت ہے۔ پنجاب میں فوجی وزارت قائم ہوئی۔ یہ وزارت در اصل آئندہ جنگ کی طیاریوں کا مقدمہ تھی۔ یہ برطانوی سرکار کی کامیاب جنگی تدبیروں میں ایک تدبیر تھی ؛

۵
بابِ پنجم

تحریکِ مدحِ صحابہ

شیعہ سنّی مسئلہ ہر چند سیاسی مسئلہ ہے۔ دونوں فرقوں کی مذہبی بنیادیں ایک[1] ہیں۔ مگر انتہا پسند لوگوں نے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ اس وقت تاریخ اسلام کے اس حادثے کی چھان بین مطلوب نہیں بلکہ قضیۂ تبرّا اور لکھنؤ کی تحریک مدحِ صحابہ کی واقفیت ضروری ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق احرار کا ایک نظریہ ہے۔ اسی نظریہ کے لیے احرار نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔ دنیا میں کوئی حکومت کسی کے بزرگوں کو علانیہ دشنام کی اجازت نہیں دے سکتی اور نہ بزرگوں کی مدح سے روک سکتی ہے۔ اگر اخلاق عامہ کی بنیاد اس سے الگ ہو تو شرافت کے کوئی معنیٰ نہیں رہ جاتے اس بارے میں لکھنؤ کے شیعہ احباب کو احرار برسرِ حق نہیں سمجھتے۔ آؤ پہلے لکھنؤ کے قضیّہ کی تاریخ کا مطالعہ کر لو۔

مدحِ صحابہ کا تاریخی مسئلہ

ذیل میں عالیجناب مولوی محمد احمد کاظمی ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی) جو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک ممتاز

[1] یہ مرحوم کی ذاتی رائے ہے ورنہ پوری امت اور اس فرقہ میں سخت اصولی اور بنیادی اختلافات ایک مسلّمہ حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ابو معاویہ ابو ذر ۱۲

وکیل ہیں کا ایک تفصیلی مقالہ درج کیا جا رہا ہے جس میں ان تمام واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو مدح صحابہ اور تبرّے کے موجودہ قضیّے کا باعث ہوئے۔ کاظمی صاحب ملک کے ایک مایہ ناز ذمہ دار رہنما ہونے کے علاوہ مدحِ صحابہ کے پچھلے مقدمات میں مشیر قانون بھی رہ چکے ہیں۔ اس لیے اس مقالے میں آپ نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ نہایت مستند، اہم اور معتبر ہیں جن کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ مدح صحابہ کے موجودہ قضیّہ کی ذمہ داری سراسر شیعوں کے سر ہے۔ یہ مقالہ طویل ضرور ہے لیکن اس کی افادی حیثیت کا تقاضا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا جائے۔

"لکھنؤ میں ۱۹۰۶ء سے قبل محرم کے جلوسوں میں شیعہ، سنّی اور ہندو سب شریک ہوتے تھے اور سب تعزیے نکالتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں ایک صاحب مقبول احمد نامی شیعہ نے لکھنؤ میں شیعوں میں کثرت سے لیکچر اور وعظ دیئے۔ جو شیعہ سنّی منافرت پیدا کرنے کا باعث ہوئے۔ مقبول احمد مذکور اپنی تقریروں میں تبرّا کرنے میں بھی تامّل نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض مقدمات بھی چلائے گئے۔ اسی زمانہ میں شیعوں میں محرم کے جلوسوں میں اصلاح کرنے کا جذبہ پیدا ہوا لیکن چونکہ اس کی بنا مقبول احمد کی پیدا کردہ فضا میں ہوئی اس وجہ سے سنیوں کا عام طبقہ ان اصلاحات کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھنے لگا۔ سب سے پہلے ان اصلاحات کا نفاذ ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ اگرچہ اس وقت سنّیوں کی طرف سے کوئی زیادہ احتجاج نہیں ہوا لیکن جب ۱۹۰۶ء میں ان اصلاحات میں اور سختی کی گئی تو سنّیوں میں بہت ہیجان ہوا۔ جس چیز پر سنّیوں کو اعتراض تھا وہ یہ تھی کہ کربلا میں ننگے پیر اور ننگے سر جانا چاہیئے فاقے کی سی صورت بنانا ضروری ہے جلوس میں سوائے ماتم کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ غرضے کہ ایسی چیزیں جن سے جلوس میں خالص شیعہ طریق و رسم کا غلبہ ہو۔ ان پر سنّی رضامند نہ تھے۔ چنانچہ سنّیوں کا ایک وفد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس ان پابندیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان پابندیوں کے بارے میں معذوری کا اظہار کیا اور ان سے کہا کہ اگر وہ اپنی علیحدہ کربلا کا انتظام کر لیں۔ تو ان کے جداگانہ جلوس کا انتظام کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سنّیوں نے لکھنؤ سے قریب ۸ میل کے فاصلہ پر ایک اراضی کا بطور کربلا کے انتظام کیا اور اس کی اطلاع مجسٹریٹ کو دے دی اور وہاں پر تعزیہ وغیرہ لے جانے کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انتظام کرا دیا۔ سابقہ کربلا کا نام تال کٹورا تھا اور نئی کربلا کا نام پھول کٹورا رکھا گیا۔ سنّیوں اور شیعوں

دونوں کے جلوسوں کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مختلف راستے اور مختلف اوقات مقرر کر دیئے۔ تاکہ باہم تصادم نہ ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں ہر دو جلوس علیحدہ علیحدہ نکالے گئے۔ سنیوں کے جلوس کے ساتھ ہندو تعزیہ داروں نے بھی کثرت سے شرکت کی جس سے تال کٹورا جانے والے جلوس کی رونق اور شان بہت گھٹ گئی۔ یہ امر شیعوں کو بہت ناگوار ہوا۔ جلوس کے جدا جدا ہو جانے کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ سنّی جلوس میں سنّی نقطۂ نظر غالب ہونے لگا اور اس میں علاوہ مرثیوں کے خلفائے راشدین کی مدح میں بھی اشعار پڑھے جانے لگے۔

اس کے علاوہ جس طرح کہ شیعہ ایام محرم میں مختلف اوقات میں علَم وغیرہ نکالتے رہتے ہیں۔ سنیوں نے بھی چار یاری جھنڈے کے نام سے چھوٹے چھوٹے جلوس نکالنے شروع کیے۔ اور اس میں بھی خلفائے راشدین کی مدح کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ یہ امر بھی شیعوں کو نہایت ناگوار ہوا۔ شیعہ جو اپنے جلوسوں میں کم و بیش اشارۃً و کنایتاً پہلے تبرّا پڑھتے تھے۔ اس علیحدگی کے بعد زیادہ آزادی کے ساتھ تبرّا کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے سنیوں سے ان کا تصادم بھی ہوا اور بعض اوقات مار پیٹ تک نوبت پہنچی۔ غرض کہ ۱۹۰۷-۱۹۰۸ء میں یہ نزاعات بڑھ گئے۔ اور شیعوں نے ۸؍اپریل ۱۹۰۸ء کو سر جان ہیوٹ گورنر یو۔ پی کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی جس کے اہم مطالبات درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ لکھنؤ میں شیعہ تعزیہ داری ہر سال ۲۸ ذی الحجہ سے ۸ ربیع الاول تک دو مہینے دس روز کی جاتی ہے اور اس تعزیہ داری کے دوران میں وہ اپنے اماموں اور اہل بیت کی شہادت کا دن مناتے ہیں۔ بالخصوص حضرت امام حسین کی شہادت کا دن

۲۔ یہ کہ تعزیہ داری سنّی مذہب کے خلاف ہے اور شیعوں کے طریقوں پر اس کو نہیں منایا جاتا۔ لیکن چند سنّی حضرت امام حسین کی شہادت عشرہ محرم کے دن محض ایک افسوسناک واقعہ کی حیثیت سے مناتے ہیں۔

۳۔ یہ کہ شیعہ تعزیہ داری کے مواقع پر سنیوں کا چار یاری اشعار پڑھنا جو خلفائے ثلاثہ کی تعریف میں ہوتے ہیں اس سے شیعوں کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اور وہ ان کے مذہبی جذبات کی توہین ہونے کی وجہ سے ان کو سخت ناگوار ہے۔

۴۔ یہ کہ اس قسم کے پبلک جلوس امر جدید ہیں اور اس بنا پر بھی قابل اعتراض ہیں۔

۵۔ یہ کہ جلوس سنّیوں کے مذہب کے بھی خلاف ہیں۔

۶۔ یہ کہ ایسے جلوس کا مقصد سوائے شیعوں کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچانے کے اور کوئی نہیں ہے۔

پگٹ کمیشن کا تقرر

اس یادداشت میں آخری استدعا یہ تھی کہ سنیوں کو چار یاری جھنڈے لے جانے اور خلفائے ثلاثہ کی تعریف میں اشعار پڑھنے کی ممانعت کی جائے تاکہ درخواست دہندگان محرم کی ماتمی تقریبات بسہولت ادا کر سکیں اور تعزیے لے جا سکیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی مداخلت یا ان کی کوئی توہین نہ کی جا سکے۔ حالات کی نزاکت کو دیکھ کر گورنمنٹ نے ۸؍اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ایک کمیشن معاملات کی تحقیقات اور سفارشات کے واسطے مقرر کیا۔ اس کمیشن کے چیئرمین مسٹر پگٹ آئی۔ سی۔ ایس مقرر کیے۔ اس کمیٹی کے ممبران میں دو ہندو، دو سنّی اور دو شیعہ نامزد کیے گئے تھے۔ لیکن سنّی ممبران میں سے ایک صاحب بالکل حاضر نہیں ہوئے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی اور اس کی بابت گورنمنٹ نے اپنا آخری ریزولیوشن ۷؍جنوری ۱۹۰۹ء کو شائع کیا جس میں کمیٹی نے متعلقہ سفارشات کا بھی مفصلاً تذکرہ کیا۔ انہوں نے جلوس کی تفریق اور دو کربلاؤں کے وجود پر بہت اظہار افسوس کیا۔ لیکن اس وقت ان دونوں جلوسوں کو یکجا کرنا یا پھول کٹورے کی کربلا کو ختم کرنا مصلحت وقت نہ سمجھا۔ گورنمنٹ نے محرم کے دو جلوس ہو جانے کی وجہ سے پولیس کو جو انتظامی دقتیں پیش آتی تھیں۔ ان کا تذکرہ کرنے کے بعد جلوسوں کی علیحدگی کے خلاف حسب ذیل الفاظ میں نکتہ چینی کی:۔

"محرم کے دو جلوسوں کو مان لینے پر ایک زبردست اعتراض یہ ہے کہ ایک جلوس سنی اور دوسرا شیعہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ اختلافات اور پختہ ہو جائیں گے اور دونوں فرقوں میں جھگڑے کا باعث ہوں گے۔ کمیٹی نے اس اعتراض کے دفعہ کرنے کے لیے یہ تجویز کی ہے۔ کہ جلوسوں کے ساتھ لفظ سنّی اور شیعہ کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ پولیس کے قواعد میں محض یہ تحریر کیا جائے کہ تعزیے جو پھول کٹورہ جانے والے ہوں۔ اور تعزیہ داروں کو موقعہ دیا جائے کہ وہ جس کربلا میں چاہیں تعزیہ لے جائیں۔ اگر مقصد صرف یہی ہوتا کہ عشرۂ آئندہ

پر باہم فریقین میں تصادم نہ ہو تو خیال یہ ہے کہ ۱۹۰۸ء کے چہلم کے موقعہ پر جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا یعنی شیعہ اور سنّی جلوس کے لیے مختلف راستے اور مختلف اوقات مقرر کر دیئے گئے تھے وہ کافی ہو جاتا لیکن لفٹنٹ گورنر کمیٹی کی رائے سے متفق ہیں۔ اس معاملہ میں ہمیں کچھ آگے بڑھنا چاہیئے اور آئندہ باہمی گفتگو اور آخری مصالحت کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگر اس اُصول سے کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنا تعزیہ کسی راستہ سے اور کسی کربلا کو لے جائے انحراف کیا جائے گا تو اس نصب العین کے حصول میں اور دیر لگے گی۔" (پیراگراف ۶)

لیکن گورنمنٹ کو ان دونوں جلوسوں کو یکجا کرنے کے مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔ اس کا اندازہ واقعات حاضرہ سے ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا۔ وہ بھی سنّیوں کے لیے مستقل پریشانی کا سبب بن گیا۔ اگر گورنمنٹ کا مقصود ان دونوں جلوسوں کو یکجا کرنے کا نہ ہوتا تو ان جلوسوں میں سنّی اور شیعہ خصوصیات ہونے سے کوئی حرج واقع نہ ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ خود گورنمنٹ کو تسلیم ہے کہ چہلم ۱۹۰۸ء کے انتظامات بالکل قابل اطمینان تھے۔ پولیس کی طرف سے جو ہدایات گورنمنٹ کے ریزولیوشن کے مطابق ہر سال شائع کی جاتی ہیں۔ ان کی دفعہ ۵ حسب ذیل ہے:

"شادیوں کے جلوس جو کسی تعزیہ، عَلَم یا دوسرے جلوس کے سامنے آجائیں وہ سو گز کے فاصلے پر رک جائیں اور سڑک کے ایک جانب ہو جائیں اور باجہ بجانا بند کر دیں۔ جب تک کہ تعزیے وغیرہ ہزار گز کے فاصلہ پر نہ ہو جائیں۔"

سنّیوں پر پابندیاں

ظاہر بات یہ ہے کہ ماتمی جلوس کے روز شادی کا جلوس گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جس ملک میں مختلف العقائد و مختلف المذاہب اقوام آباد ہوں وہاں ایک دوسرے کے رسم و رواج کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور عشرہ محرم کے روز شادی کے جلوس کی بھی ممانعت نہیں کی جاتی۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں تھی۔ کہ سنیوں کو اُن کے مخصوص طریقے

سے محرم کے جلوس نکالنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ بالخصوص جب ان کے راستے اور اوقات شیعوں کے جلوس کے راستوں اور اوقات سے بچا کر مقرر کیے جاتے اور کسی قسم کے تصادم کا اندیشہ نہ ہوتا۔ لیکن گورنمنٹ کی اس خواہش کی وجہ سے کہ دونوں جلوس پھر آئندہ چل کر ایک ہو جائیں۔ سنیوں کے جلوس پر بہت سی پابندیاں عائد کی گئیں جن میں سے حسب ذیل پابندیاں قابل توجہ ہیں:۔

(۱) کمیشن کی رپورٹ کے مطابق جو پابندی عشرہ محرم چہلم اور ۲۱ رمضان کے جلوسوں پر عائد کی جانے والی تھی۔ اس پر شیعوں نے کچھ اعتراضات کیے تھے۔ اور اس پر ایک ترمیم پیش کی تھی۔ گورنمنٹ نے ان کی ترمیم کو منظور کر لیا اور پابندی حسب ذیل الفاظ میں درج کر دی گئی:

"کوئی شخص ایسے اشعار یا نظمیں یا دوسرے ایسے الفاظ جن میں ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ کی تعریف کی گئی ہو یا اُن کی مدح میں ہوں۔ کسی دوسرے اسلامی جلوس کے راستے پر نہ پڑھ سکے گا اور نہ ایسے مقام پر پڑھ سکے گا جہاں سے جلوس تک آواز پہنچ سکے۔ اور نہ کوئی مجمع کسی پبلک مقام پر ایسے مدحیہ اشعار اور نظمیں پڑھ سکے گا۔ اگر کوئی شخص احکامِ مذکورہ بالا کی خلاف ورزی کریگا۔ تو وہ فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ اور اس پر حسب دفعہ ۲۹۸ یا کسی دوسری مناسب دفعہ تعزیرات ہند کے ماتحت مقدمہ چلایا جائے گا۔

(دفعہ ۹ ضمیمہ گورنمنٹ ریزولیوشن)

(۲) محرم کے جلوس یا تعزیوں کے ساتھ ہر ایسا جھنڈا لے جانے کی ممانعت کی گئی جو شباہت و شکل میں عَلَم یعنی حضرت امام حسینؑ کے جھنڈے یا جھنڈوں کے مطابق نہ ہوں اور جو سوائے حضرت امام حسینؑ یا ان کے علمبردار حضرت عباسؑ کے علاوہ کسی اور شخص کے اعزاز میں ہو (پیراگراف ۹ گورنمنٹ ریزولیوشن)

حسب مذکورہ بالا یہ پابندیاں محض تین ایام کے لیے تھیں یعنی عشرہ محرم، چہلم اور ۲۱ رمضان کے لیے۔ ان پابندیوں کی تائید میں گورنمنٹ نے حسب ذیل الفاظ تحریر کیے:

"بہت پر جوش سنّی کے لیے بھی اس امر پر استدلال کرنا ممکن نہیں کہ لکھنؤ میں اس کے ہم مذہبوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ حضرت امام حسین کی شہادت کی یادگار میں جو جلوس لکھنؤ کی سڑکوں پر نکالے جاتے ہیں۔ اور جن میں شرکت کی اس کو اجازت دی گئی ہے۔ ان جلوسوں کو بے وقت اور بلا اختیار حضرت ابو بکر صدیق رضؓ و حضرت عمر فاروق اعظم رضؓ و حضرت عثمان غنی رضؓ کی مدح سرائی کے جلوس میں مُبدّل کر دے۔ کمیشن کی اکثریت کی رائے جس سے لفٹنٹ گورنر کو کلی طور پر اتفاق ہے یہ ہے کہ اس کی خرابی کو اس حد تک دور کیا جائے۔ جہاں تک اس سے کوئی غیر ضروری مداخلت سُنّیانِ لکھنؤ کے اس حق میں نہ ہو جو ان کو ہز مجسٹی کی رعایا ہونے کی حیثیت سے تمام دیگر رعایا کے ساتھ حاصل ہے۔ کہ وہ مناسب مقامات کے اوپر اپنے عقائد کے خصوصی اصولوں کا اعلان کرے۔ اگر سُنّی گواہان جن کی شہادت کمیٹی کے سامنے ہوئی ہے ان کا ہر لفظ بھی مان لیا جائے پھر بھی یہ سوال باقی رہے گا کہ وہ خرابی جس کی وجہ لکھنؤ کے محرم کے جلوسوں کا طریقہ کُلّیتہً بدلنے کا اندیشہ ہے۔ وہ کسی ایسی کارروائی سے رفع ہو سکتی ہے جو تجویز مُنذکرۂ الصَّدر سے کم ہو۔"

(پیراگراف ۱۲)

اس طرح پر یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ جھگڑا قضیّہ مدح صحابہ پڑھنے اور چار یاری جھنڈوں کے نکالنے پر تھا اس کی ممانعت محض تین دن کے لیے کی گئی تھی اور وہ بھی اس لیے کہ گورنمنٹ یہ چاہتی تھی کہ آئندہ دونوں جلوس یک جا ہو جائیں اور سنی و شیعہ جلوسوں کی تفریق باقی نہ رہے۔ اس کمیشن نے چار یاری اشعار کی تقسیم دو حصوں میں کی ہے۔ ایک اشعار تو وہ ہیں کہ جن میں چاروں خلفا کی تعریف کی جاتی ہے اور دوسرے وہ ہیں جن میں خلفاء کی تعریف کے ساتھ ان لوگوں کو جو تین خلفاء کو نہیں مانتے اور ان کی عزت نہیں کرتے کافر اور جہنمی بتلایا جاتا ہے۔ کمیشن نے ایسی مدح صحابہ کو جس میں سب و شتم کیا جائے تبرّے کی سطح پر سمجھا

ہے۔ اس بارے میں گورنمنٹ کے حسب ذیل الفاظ نے اس مطلب کی تشریح کی:

"شیعوں کی خواہش جو اُن کے میموریل سے بخوبی ظاہر ہے یہ ہے کہ وہ گورنمنٹ سے اس امر کا اعلان چاہتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ کی تعریف سے ہر وقت اور ہر موقعہ پر اشتعال کا اندیشہ ہے اور امن عامہ کے خلاف جرم ہے لیکن گورنمنٹ کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا اعلان کرے۔ کیوں کہ سنیوں کو ایسا ہی حق حاصل ہے جیسا شیعوں کو ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مخصوص اُصولوں کا اعلان عام کریں۔ البتہ موقعہ اور محل کا لحاظ اور دفعہ ۲۹۸ تعزیرات ہند کی شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ شیعوں کو تبرّا پڑھنے کی ہمیشہ سے ممانعت کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ تبرّا سے صرف اس عقیدہ کا اظہار نہیں ہوتا کہ حضرت علی رسول کریم (صلی اللہ علیہ و سلم) کے بعد فوراً خلیفہ ہوئے بلکہ پہلے تین خلفاء پر سبّ و شتم کیا جاتا ہے جو پبلک مقامات پر محض ان لوگوں کے جذبات کو صدمہ پہنچانے کے لیے کیا جا سکتا ہے جو ان تین خلفاء کو مانتے ہیں۔ مدح صحابہ سے ملتی ہوئی تمثیل شیعوں کے اس اصول میں ملتی ہے کہ جس کی رو سے وہ حضرت علی رضؓ کو خلیفہ بلا فصل کہتے ہیں اور اس طرح پر اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ نبی کے بعد وہی خلیفہ ہوئے۔ سُنّی اس بات کے سخت مخالف ہیں کہ ان کو خلیفہ بلا فصل کے الفاظ کو علانیہ لکھنے سے منع کیا جائے۔"

(پیراگراف ۵، گورنمنٹ ریزولیوشن)

مدحِ صحابہ کے متعلق گورنمنٹ کا فیصلہ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت کمیشن کے نزدیک جس سے گورنمنٹ نے بھی کُلّیتہً اتفاق کیا تھا مدح صحابہ کی دو قسمیں تھیں ایک سادہ اور دوسری سبّ و شتم والی۔ جس مدح صحابہ کے ساتھ سبّ و شتم بھی

ہو اس کو وہ تبرّا کے مترادف سمجھتے تھے۔ لیکن محض مدح صحابہ کو سنّیوں کا ایسا ہی جائز اعلان عقیدہ سمجھتے تھے جیسا کہ شیعہ اپنی اذان میں حضرت علیؓ کو خلیفہ بلا فصل کہہ کر اپنے عقیدہ کا اعلان کرتے ہیں۔ نہ وہ خلیفہ بلا فصل کو روکنے کے لیے تیار تھے اور نہ مدح صحابہ پر کوئی ایسی پابندی عائد کرنے کے لیے تیار تھے۔ البتہ تین ایام کے لیے اس غرض سے کہ آئندہ سنّیوں اور شیعوں کے جلوس یکجا ہو جائیں۔ اس بات کی قطعی ممانعت تھی کہ مدح صحابہ ان تین ایام میں (یعنی عشرہ، چہلم اور ۲۱ رمضان) پڑھی جائے۔

کمیشن کی سفارشات تین دن کی ممانعت پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد ایک اور مسئلہ تھا جس پر اگرچہ کمیشن نے کوئی رپورٹ نہیں دی تھی۔ لیکن گورنمنٹ نے اس کے متعلق اپنا اظہار رائے کیا۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ وہ دو مہینہ دس دن تک جب شیعہ اپنے علم نکالتے تھے۔ سنّی اپنے چار یاری جھنڈے نکالتے تھے اور چار یاری جھنڈوں کے ساتھ جو نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ ان میں بالعموم خلفاء ثلاثہ کے نہ ماننے والوں پر سب و شتم کیا جاتا تھا۔ چار یاری جھنڈوں کے ساتھ جو نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ اس کے لیے حسب ذیل اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ؎

ایماں میں علم آیا فاروق معظم کا — کفار میں ہلچل ہے اک شور ہے ماتم کا
تھے یہ چاروں جان و دل سے جاں نثارانِ نبی — ان کی الفت عین الفت ہے رسول اللہ کی
ایک سے بھی دشمنی رکھے اگر کوئی شقی — حسب فرمانِ محمدؐ دوزخی ہے دوزخی

ان چار یاری نظموں کے خلاف شیعوں کو شکایت ہوئی۔ چنانچہ کمیشن کی رپورٹ کے بعد انہوں نے گورنمنٹ سے پھر احتجاج کیا۔ جس پر گورنمنٹ نے حسب ذیل الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا:

"اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ آیا کمیٹی کے شیعہ ممبروں کی یہ خواہش مبنی بر انصاف ہے کہ اس ممانعت کی توسیع پورے دو مہینے دس یوم تک کے لیے (یعنی جب تک کہ محرم منایا جائے) کی جائے۔ لفٹننٹ گورنر اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ شیعہ قوم نے جو میموریل ان کی خدمت میں پیش کیا تھا اس میں یہ شکایت کی تھی کہ چہلم سے قبل اور چہلم کے دن سنّی جلوسوں کے ساتھ جھنڈے نکالتے

ہیں اور ان کے ساتھ چار یاری اشعار پڑھتے ہیں۔ کمیٹی کے سامنے دوران تحقیقات میں جو لوگ کہ شیعوں کے مطالبات پیش کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی پوری توجہ ہر قسم کے چار یاری اشعار پڑھے جانے کے ممنوع قرار دیئے جانے پر مرکوز کر دی تھی۔ انہوں نے اس شکایت کو ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی کہ علاوہ عشرہ اور چہلم کے اور ایّام میں بھی چار یاری جلوس نکالے جاتے ہیں۔ لفٹننٹ گورنر کے خیال میں کمیٹی نے اس خاص شکایت کے متعلق کوئی قاعدہ اس وجہ سے تجویز نہیں کیا کہ یہ شکایت ان کے سامنے پیش ہی نہیں کی گئی۔ لیکن اگر پہلے کوئی ایسی کارروائی کی گئی ہے یا آئندہ کی جائے تو ظاہر بات ہے کہ یہ قابل اعتراض ہے اور اس کے متعلق حکّام کو کارروائی کرنی چاہیئے جو قواعد کہ لکھنؤ میں نافذ ہیں۔ ان کی رو سے شارع عام پر ڈپٹی کمشنر کی اجازت سے جلوس نکالے جا سکتے ہیں اور ان کا انتظام بھی ڈپٹی کمشنر ہی کرتے ہیں۔ گورنمنٹ اس بات کے لیے تیار نہیں ہے۔ کہ کوئی ایسا عام اعلان کرے کہ جس کی رو سے اس بات کی عام ممانعت کر دی جائے کہ کوئی شخص کسی پبلک مقام پر اور کسی حالت میں بلند آواز سے ایسے اشعار نہ پڑھے جو خلفاء ثلاثہ کی تعریف میں ہوں جیسا کہ کمیشن کی اکثریت نے تحریر کیا ہے۔ دفعہ ۲۹۸ تعزیرات ہند شہر لکھنؤ سے منسوخ نہیں ہو گئی۔ اگر کوئی شخص دوسرے کی سماعت میں ایسے الفاظ لائے جس سے وہ قصداً اُس کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچانا چاہتا ہو۔ تو ایسا شخص مستوجبِ سزا ہو گا۔ جب تک کہ وہ یہ ثابت نہ کر دے کہ وہ تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کی رو سے اس سزا سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے"۔

(پیراگراف ۷، گورنمنٹ ریزولیوشن)

گورنمنٹ کے اس ریزولیوشن کا خلاصہ حسب ذیل طریقہ پر کیا جا سکتا ہے:

(۱) مدح صحابہ پڑھنے کی بشرطیکہ اس میں کسی پر سبّ و شتم نہ ہو کوئی ممانعت باستثنائے تین ایام کے نہیں یعنی عشرہ چہلم اور ۲۱ رمضان اور ان تینوں دنوں میں بھی ممانعت صرف اس قدر ہے کہ کوئی شخص جلوس کے راستہ پر یا جلوس کی سماعت میں مدح صحابہ نہ پڑھے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی پبلک مقام پر جو جلوس کی گذرگاہ نہ ہو اور جلوس کی سماعت سے باہر ہو ان تین ایام میں بھی مدح صحابہ پڑھ سکتا ہے اور نجی مقامات میں مدح صحابہ کے جلسے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی بھی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

(۲) چار یاری جھنڈے کے جلوس اور اشعار جن میں دوسرے فریق پر سب و شتم کیا جاتا تھا۔ اس کے متعلق کوئی ممانعت عام گورنمنٹ نے نہیں کی۔ البتہ مقامی حکام کی توجہ دفعہ ۲۹ تعزیرات ہند کی طرف دلائی اور یہ کہا کہ جو جلوس دوسروں کی دل آزاری کے لیے نکالے جائیں اُن کے خلاف مناسب کارروائی کی جا سکتی ہے۔

۱۹۰۹ء کا اعلان

گورنمنٹ کے اِس فیصلہ کی عائد کردہ پابندیوں کے خلاف سنّیوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ چنانچہ چہلم ۱۹۰۹ء کے موقعہ پر سنیوں نے علی الاعلان اپنے ایک تعزیہ کے ساتھ مدح صحابہ پڑھی۔ اس سلسلہ میں ایک ہزار کے قریب آدمی گرفتار ہوئے۔ ان پر مقدمات چلائے گئے اور وہ سزایاب ہوئے۔ اس ہیجان کو رفع کرنے کے لیے ۲۶ مارچ ۱۹۰۹ء کو مسٹر ریڈی سی نے جو اس زمانہ میں لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر تھے ایک اعلان شائع کیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ خلفائے ثلاثہ کی مدح پڑھنے کی عام ممانعت نہیں ہے بلکہ ممانعت محض تین ایام یعنی عشرہ، چہلم اور ۲۱ رمضان کے لیے ہے۔ لیکن ان ایام میں بھی پولیس ایکٹ کی دفعات کے ماتحت لائسنس حاصل کر لینے کے بعد مدح صحابہ پڑھی جا سکتی ہے (اگرچہ اب گورنمنٹ کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اعلان بعد میں مسٹر ریڈی سی نے واپس لے لیا۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ چنانچہ اس کے متعلق ۱۹۳۶ء میں صوبہ کی کونسل میں سوالات بھی کیے گئے

لیکن گورنمنٹ اس اعلان کے واپس لینے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکی) سنّی عام گرفتاریوں اور مقدمات سے سخت پریشان ہو چکے تھے۔ بنا بریں اس اعلان کے جب کہ سر جان ہیوٹ کی مدت گورنری بھی ختم ہو چکی تھی۔ سنّیان لکھنؤ نے سر جیمس مسٹن جدید گورنر کے یہاں اس پابندی کے خلاف عرضداشت پیش کی لیکن کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس پر مسلسل احتجاج ہوتا رہا۔ لیکن جب سنّیوں کو ناکامی ہی ہوتی رہی تو ۲۴ مئی ۱۹۳۵ء کو چہلم کے موقعہ پر غازی مٹّے خان، مولوی یونس خالدی احراری اور ایک اور شخص نے سول نافرمانی کرتے ہوئے مدح صحابہ پڑھی جس کے بعد اس احتجاج نے پھر عملی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد عشرہ محرم یعنی ۳ اپریل ۱۹۳۶ء کے موقع پر پھر دو شخصوں نے چوک میں مدح صحابہ پڑھی اور وہ گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے۔ ۱۳ مئی کو چہلم کے موقع پر پھر ۱۴ آدمی اسی طرح مدح صحابہ پڑھتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ یہاں یہ واضح رہنا چاہیئے کہ اس وقت تک یہ احتجاج صرف ان ہی تین ایام کی مخالفت کے خلاف تھا۔

مدحِ صحابہؓ کمیٹی بنائی گئی

عوام کے اس ہیجان سے متاثر ہو کر لکھنؤ کے تعلیم یافتہ طبقہ نے ۱۶ مئی ۱۹۳۶ء کو مدح صحابہ کمیٹی بنائی جس کا مقصد بھی اسی تین دن کی پابندی کو ہٹوانا تھا۔ لیکن حکّام کے رویّہ سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ گورنمنٹ ریزولیوشن کے صاف الفاظ اور مسٹر ریڈی سی کے اعلان کے خلاف نہ صرف ان ایام میں بلکہ اُن کے اور ایّام میں بھی مدح صحابہ کے جلوس نکالنے اور مدح صحابہ پڑھنے کے روادار نہ تھے۔

چنانچہ لکھنؤ میں کئی سال پہلے سے بارہ وفات کے موقعہ پر میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے سلسلہ میں ایک عام جلوس نکالا جایا کرتا تھا۔ ۱۹۳۶ء کو یہ جلوس ۳ جون کو نکلنے والا تھا۔ یکم جون ۱۹۳۶ء کو مقامی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جو شیعہ تھا حسب دفعہ ۱۴۴ نوٹس جاری کیا کہ ۳ جون کے جلوس میں مدح صحابہ نہ پڑھی جائے۔ مدح صحابہ پڑھنے کی مخالفت حسب ذیل الفاظ میں کی گئی:-

"ہرگاہ ایک جلوس لکھنؤ میں تاریخ ۳ جون ۱۹۳۶ء روز بارہ وفات حضرت پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز میں نکالا جانے والا ہے۔ ہرگاہ یہ جلوس چند سال ہوئے

پہلے نکالا گیا تھا تو سنی اور شیعہ مسلمانوں کا مشترکہ جلوس تھا۔ اور اس وقت سے مشترکہ جلوس رہا ہے۔ ہرگاہ امسال بھی جلوس کے سنی منتظموں نے شیعہ مسلمانوں کو جلوس میں شرکت کرنے کے لیے مدعو کیا ہے۔ اور انہوں نے شرکت کی رضامندی دے دی ہے۔ اور ہرگاہ کہ پولیس کی اطلاع ونیز دیگر ذرائع کی اطلاع پر یہ یقین کرنے کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں کہ کچھ غیر ذمہ دار لوگ ایسی نظمیں جو مختلف فیہ ہیں اس جلوس میں پڑھیں گے کہ جس میں ایسی نظموں کی معقول گنجائش نہیں ہے اور ہرگاہ ایسی نظموں کے جن کے جلوس کے منتظمین حامی نہیں ہیں۔ پڑھنے سے اندیشہ نقضِ امنِ عام کا ہے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ حسب ذیل حکم زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری نافذ کرتا ہوں۔

(۱) کوئی شخص جلوس میں یا جلوس کے لوگوں کی سماعت کے اندر یا کسی شارع عام پر مجمع میں مدح صحابہ نہ پڑھے گا۔

(۲) کوئی شخص دشنام آمیز الفاظ یا کوئی الفاظ یا اشعار جن سے کسی دوسرے فرقہ کے پیروؤں کی ذلت یا ہتک ہوتی ہو اس جلوس کے راستہ میں یا جلوس کے لوگوں کی سماعت کے اندر یا کسی شارع عام پر کسی مجمع میں نہ استعمال کرے گا نہ پڑھے گا وغیرہ وغیرہ۔

حکام لکھنؤ کی طرف سے مدح صحابہ پر پابندی عائد کرنے کی یہ ابتدا تھی جس کا سبب یہ بتلایا گیا تھا کہ اس جلوس میں شیعہ بھی مدعو ہیں۔ سنیوں نے حکومت کے اس حکم کو جس نظر سے دیکھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے بطور احتجاج اس جلوس کو منسوخ کر دیا۔ اور اُن کا ایک وفد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس حاضر ہوا اور ۲۱ جون کو میلاد النبی کے سلسلہ میں جلوس نکالنے اور مدح صحابہ پڑھنے کی اجازت چاہی نیز ایک باضابطہ درخواست سپرنٹنڈنٹ پولیس کے یہاں بھی پیش کی گئی۔ اس درخواست پر بھی ۹ جون کو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مدح صحابہ کی مخالفت کے ساتھ اجازت دی۔ اس کے بعد ۲۲ جون ۱۹۳۶ء کو ایک دوسری درخواست ۲۸ جون ۱۹۳۶ء کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یاد منانے کے لیے پیش کی گئی۔ اس درخواست کو

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ابو طالب نقوی شیعہ اسسٹنٹ مجسٹریٹ کے پاس اس ریمارک کے ساتھ بھیج دیا کہ چونکہ یہ جلوس جدید ہے۔ اس لیے اس کی اجازت نہ دی جائے۔ مسٹر نقوی نے جلوس کی اجازت نہیں دی اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ حکم دیا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ جلوس نکالا تو نہ جائے گا تا کہ اگر جلوس نکلے تو وہ دفعہ ۱۴۴ نافذ کر سکیں۔

اس طرح پر لکھنؤ کے مقامی حکام نے اپنے رویہ سے اس امر کا پورا ثبوت دے دیا۔ کہ ان کے نزدیک مدح صحابہ پڑھنے کی لکھنؤ میں کسی حالت میں اجازت نہیں دی جا سکتی۔

سنیوں کی طرف سے مصالحت کی کوشش

پھر انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا، جون کو تین احراری کارکنوں کو جن کے متعلق ان کو شبہہ تھا حسب دفعہ ۱۰۷ گرفتار کر لیا۔ اس طرح پر مسلمانوں میں ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور ۱۰ جولائی یوم جمعہ سے بعد نماز جمعہ مجلس احرار کے رضاکار مدح صحابہ پڑھ کر گرفتار ہونا شروع ہو گئے۔ حکام نے گرفتاریاں شروع کیں۔ گرفتار شدگان کو سزائیں اور جرمانہ کی سخت سزائیں دی گئیں جس سے ہیجان روز بروز بڑھتا گیا۔ یہ سلسلہ گرفتاریوں کا نومبر تک جاری رہا۔ اور مقامی حکام نے بعض مواقع پر یہاں تک سختی کی کہ ایسے لوگوں کو بھی گرفتار کر لیا جو اپنے مکانوں میں محفل میلاد منعقد کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مدح صحابہ کمیٹی کا ایک ڈیپوٹیشن جس میں مجلس احرار کی نمائندگی بھی کمیٹی مذکور کی خواہش پر ہو گئی تھی۔ گورنر کے روبرو ۴ نومبر کو پیش ہوا۔ گورنر صاحب نے یقین دلایا کہ وہ سنیوں کی شکایات کی تحقیقات کریں گے اور کوشش کریں گے کہ فریقین میں مصالحت ہو جائے۔ ورنہ بعد میں ان کی دادرسی کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس تمام کارروائی سے قبل ضرورت اس کی ہے کہ تحریک سول نافرمانی بند کر دی جائے اور فضا کو پُرسکون بنایا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد لکھنؤ میں مجلس احرار کی جانب سے متعدد جلسے ہوئے اور لوگوں کو یقین دلایا گیا کہ اس وقت سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کر دینا حصول مدعا کے لیے ضروری ہے چنانچہ تحریک ملتوی کر دی گئی اور شیعوں کے ساتھ گفتگوئے مصالحت شروع ہوئی۔ لیکن باوجود ہر قسم کی کوشش کے کوئی مصالحت نہ ہو سکی بالآخر گورنمنٹ نے کمیشن کا اعلان کیا۔ جس کے ممبران جسٹس الیسپ جج ہائی کورٹ الہ آباد اور مسٹر داس کلکٹر تھے۔ اس کمیٹی نے ۳ اپریل ۱۹۳۷ء سے

کارروائی شروع کی۔ فریقین کے گواہان کی شہادتیں لیں۔ اور بحث سننے کے بعد ۱۵ جون ۱۹۳۷ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

"السپ کمیٹی" کی رپورٹ

السپ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں "پگٹ کمیٹی" کی رپورٹ کی تائید کی ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ کے فیصلہ ۱۹۰۹ء کے متعلق وہ لکھتے ہیں :-

"ہمارے خیال میں گورنمنٹ کے منشاء کے متعلق کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ دو چیزوں میں تفریق کریں۔ اوّلاً سال کے تین اہم دنوں اور باقی ماندہ دنوں میں اور دوسرے باضابطہ مجمع میں (مدح صحابہ) پڑھتے ہیں اور منفرداً (مدح صحابہ) پڑھتے ہیں ان کا مقصد تین دن کے لیے مدح صحابہ روکنے کا تھا۔ یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس حکم کے مطلب کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ تمام پبلک مقامات پر عام مجمعوں میں مدح صحابہ پڑھنے کی مخالفت صرف اُن راستوں پر تھی جن پر سے تعزیہ یا دوسرے جلوس نکلیں اور جو اُن کی سماعت کے اندر ہوں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اگر انفرادی طور پر لوگ ایسے اشعار پڑھیں۔ جن میں دوسروں پر سبّ و شتم ہو۔ تو ان کے خلاف معمولی قانونی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ اور اس میں کسی دن کی تخصیص نہیں۔ اسی طرح سے ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ گورنمنٹ کا مطلب یہ تھا کہ تمام جلسے اور جلوس جن میں مدح صحابہ پڑھی جائے وہ عشرہ، چہلم اور ۲۱ رمضان کے تین دن کے علاوہ ضروری طور پر ممنوع قرار دیے جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انہوں نے ایک عام اصول کے طور پر تحریر کیا تھا کہ ایسے جلسوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو نہ صرف یہ کہ جدید ہوں بلکہ اُن سے نقضِ امن کا اندیشہ بھی ہو۔"

اس طرح پر جو مطلب گورنمنٹ کے ریزولیوشن کا پہلے بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تائید السپ کمیٹی نے بھی کی۔ لیکن السپ کمیٹی کی رپورٹ ۱۵ جون ۱۹۳۷ء کو آ جانے کے باوجود گورنمنٹ نے نہ اس کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کیا اور نہ اس کی اشاعت کی۔

نومبر ۱۹۳۶ء میں جب ہز ایکسیلینسی گورنر صاحب کے وعدہ پر سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کیا گیا تھا۔

تو خیال یہ تھا کہ تین چار ماہ کے اندر کوئی نتیجہ نکل آئے گا۔ لیکن روز بروز التوا ہوتا رہا کمیشن کی رپورٹ بھی ۷ مہینہ کے بعد پیش ہوئی لیکن وہ بھی پبلک میں شائع نہ کی گئی۔ اس زمانے میں نواب چھتاری وزیر اعظم تھے اُن کے سامنے بھی مطالبہ پیش کیا گیا۔ لیکن کچھ کارروائی نہ ہوئی۔ جولائی ۱۹۳۷ء سے کانگریس گورنمنٹ نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لی۔ اس کے بعد اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس معاملہ میں اپنا فیصلہ دے اور کمیشن کی رپورٹ کو شائع کر دے۔ لیکن اس نے دیگر اہم مصروفیتوں کے ہونے کی وجہ سے مہلت طلب کی۔ سنیانِ لکھنؤ برابر صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب فروری ۱۹۳۸ء تک بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا تو لوگوں میں بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ بالآخر ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو گورنمنٹ نے مدح صحابہ کمیشن کی رپورٹ اور اپنا فیصلہ شائع کیا۔ اگرچہ گورنمنٹ کے فیصلہ کے الفاظ مختلف تھے۔ لیکن مطلب و مقصود وہی تھا جو ۱۹۰۹ء کے فیصلہ کا تھا۔ اس فیصلہ کے پیراگراف ۵ میں گورنمنٹ تحریر کرتی ہے۔

"گورنمنٹ اس بات کو صاف کر دینا چاہتی ہے کہ سنیوں کا یہ حق ہرگز مابہ النزاع نہیں ہے کہ آیا انہیں مجالس عام یا مجالس خاص میں خلفائے ثلاثہ کی مدح کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ بلاشک ان کو یہ حق حاصل ہے جھگڑا صرف اس بات کا ہے کہ کس طریقہ اور کن حالات میں ان کو لکھنؤ میں مدح صحابہ پڑھنی چاہیئے۔ جب مختلف اقوام کے عقائد اور نقطہ نظر میں فرق ہو تو گورنمنٹ کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ امن عامہ کو قائم رکھنے کے لیے مداخلت کرے اور عام لوگوں کی سہولت کا خیال رکھے۔"

اس طرح پر مدح صحابہ کا حق جیسے پہلے تسلیم کیا گیا تھا گورنمنٹ کے اس فیصلہ میں بھی تسلیم کیا گیا۔ لیکن وقت اور حالات کا تعیّن کچھ نہیں کیا گیا۔

اِس فیصلے کے بعد کی کارروائی

مارچ ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ کے فیصلہ کے شائع ہونے کے بعد مجلس احرار نے اس مضمون کا ریزولیوشن

پاس کیا کہ گورنمنٹ کے فیصلہ کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے جب تک اس کا عمل نہ دیکھ لیا جائے۔ نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ اس فیصلہ کے متعلق مجلسِ علماء سے استفسار کر کے اس کی ہدایت کے مطابق عملدرآمد کیا جائے۔

اس زمانہ میں شیعہ کانفرنس نے اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کیا کہ کمیٹی کی رپورٹ اگرچہ کڑوی گولی ہے لیکن ہمیں اُسے کھانا ہوگا۔ مدح صحابہ کمیٹی نے بھی گورنمنٹ کے اس فیصلے کا دبے الفاظ میں خیر مقدم کیا۔ مگر گورنمنٹ نے اس کو نافذ نہ کیا۔ اور فضاء کے بہتر ہونے تک اس کے نفاذ کو ملتوی کر دیا۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں مجلس احرار نے بطور آزمائش محفل میلاد کے منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ جو قریب قریب کُلیتہً سنیوں کی آبادی تھی۔ لیکن اس محفل میلاد کے منعقد ہونے پر لکھنؤ کی تمام پولیس اور افسران موقعہ پر پہنچ گئے۔ دفعہ ۱۴۴ کی دھمکی دی جس کی وجہ سے کارکنان نے اس وقت احتجاجاً جلسہ کو ملتوی کر دیا۔

مذکورہ بالا فیصلے کے نفاذ میں گورنمنٹ مسلسل دیر کرتی رہی۔ لیکن اس طرزِ عمل سے فضاء کے پرسکون ہونے میں کوئی مدد نہ ملی۔ برعکس اس کے شیعہ جو پہلے گورنمنٹ کی تجویز کو ماننے کے لیے کم و بیش تیار بھی تھے۔ انہوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر فضاء کو مکدر رکھا جائے تو بحالات موجودہ مدح صحابہ کے عام مقامات پر نہ پڑھے جانے یا مدح صحابہ کا جلوس نہ نکلنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ کوشش ۱۹۳۷ء ہی سے شروع ہو گئی تھی جب کہ السپ کمیشن نینی تال میں اپنی رپورٹ تحریر کر رہا تھا

"جون ۱۹۳۶ء میں ایام عزاداری ختم ہونے کے بعد شیعوں کی طرف سے
حملہ ہوا اور اس کے بعد لکھنؤ میں بلوہ ہو گیا۔ اس سے قبل بھی چہلم کے موقعے پر
شیعوں کا جو جلوس پاٹا نالہ میں دار المبلغین کے سامنے گذرا تھا۔ اس کے متعلق
بھی شکایت تھی کہ اس نے بہت سے اشعار سبّ و شتم کے پڑھے تھے مثلاً:

جس ہاتھ سے شبّیر کا ماتم نہیں ہوتا
وہ ہاتھ اگر آگ میں جل جائے تو اچھا

دشمن ہے تو نبی کا عدوّے امام ہے
او کہنے والے تعزیہ داری حرام ہے

عزاداری کو کیا سمجھے ہیں جو بے دیں مٹاتے ہیں
جہاں میں کس لیے بے دیں ہمارا دل جلاتے ہیں

لعین ابنِ لعین ہیں جو عزاداری مٹاتے ہیں
یہی ہے بخشش امت کا ساماں سوچ لے بے دیں

غرض فضاء کے پرسکون ہونے کے بجائے روز روز فضا کے مکدر ہونے کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں اور گورنمنٹ کے اعلان کے بعد اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ دار المبلغین پر حملہ کیا گیا۔ جلوس پر گلی میں سے اینٹیں پھینکی گئیں اور بلوہ ہوا۔ اس کے نتیجہ میں مولوی عبد الشکور اور ان کے رفقاء کو دفعہ ۱۰۷ کے ماتحت گرفتار کر لیا گیا۔"

اس نوبت پر مولانا حسین احمد صاحب جو شروع سے تحریک مدح صحابہ کے حامی اور اس کے پرجوش مددگار رہے تھے۔ انہوں نے مداخلت کی اور سنیانِ لکھنؤ کے لیے تحریری اعلان شائع کیا کہ ان کو موقعہ دیا جائے۔ کہ وہ گورنمنٹ سے کوشش کر کے اس مسئلہ کو ختم کرا دیں۔ آپ نے اس دوران میں سنیانِ لکھنؤ کو صبر کے ساتھ انتظار کرنے کی تلقین کی اور کسی قسم کی تحریک سول نافرمانی وغیرہ شروع نہ کرنے کی ہدایت فرمائی۔ نیز یہ بھی یقین دلایا کہ اگر خدانخواستہ ان کو اس مسئلہ کے حل کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ تو وہ خود مدح صحابہ کے ایجی ٹیشن میں سب سے آگے ہوں گے۔ چنانچہ مولانا حسین احمد صاحب قبلہ کے احترام میں سنیانِ لکھنؤ پھر خاموش ہو گئے اور صبر و سکون کے ساتھ حکومت کے تصفیہ کا انتظار کرنے لگے۔

اس دوران میں مولانا حسین احمد صاحبؒ کی گفتگو حکومت یو۔ پی اور کانگریس سے ہوتی رہی۔ اور حکومت کی طرف سے التوا کا عذر ہوتا رہا۔ اور مجلس احرار اور مجلس تحفظِ ناموس صحابہؓ کی طرف سے پبلک کو یقین دلایا جاتا رہا کہ عنقریب گورنمنٹ اپنے مذکورہ بالا فیصلہ کو جامۂ عمل پہنا دے گی۔ لیکن اس کو مہینہ دو مہینہ چار مہینے چھ مہینے گذر گئے۔ مگر ہنوز روز اوّل رہا۔ یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کے مذکورہ بالا اعلان کے شائع ہونے کے سال بھر انتظار کرنے کے بعد مولانا عبد الشکور صاحب و دیگر حضرات نے ایک روز یہ مطبوعہ اعلان شائع کرا دیا کہ امین الدولہ پارک میں مدح صحابہ کا جلسہ منعقد ہوگا۔ اس اعلان کے شائع ہوتے ہی گورنمنٹ نے مولانا موصوف اور اُن کے رفقاء کو حسب دفعہ ۱۰۷ گرفتار کر لیا۔ اب مولانا حسین احمد صاحب نے حکومت یو۔ پی کی وعدہ خلافی سے مجبور ہو کر اس بات کا اعلان کر دیا کہ وہ سنیانِ لکھنؤ کو مزید انتظار کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ خود اپنے وعدے کے مطابق میدانِ عمل میں اتر آئے۔ احرار کی جانب سے بھی سول نافرمانی شروع کر دی گئی

اس سول نافرمانی کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ زیادہ دنوں کی بات نہیں یعنی حکومت نے سال بھر میں ایک دن

(یعنی ۱۲ ربیع الاول کو) جلوس نکالنے کی اجازت کا وعدہ کیا۔ اب شیعہ اس بات پر بہت چراغ پا ہیں۔ حالانکہ سنّیوں کے ساتھ جو بے انصافی کی گئی ہے اس کی تلافی اب تک نہیں ہوئی ہے۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اُس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سنّی تین دن کی مدح صحابہ کی پابندی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ ان تین دنوں کے علاوہ سال کے بقیہ ایّام میں ۱۹۰۸ء سے ان کا حق علانیۃً مدح صحابہ پڑھنے کا تسلیم شدہ چلا آ رہا تھا۔

مُصالحت کا سُوال

اب مصالحت کا سوال پھر اٹھا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مصالحت کس طرح ہو؟ اگر سنیوں کو مدح صحابہ کے لیے ۱۰ یوم دیئے جاتے تو ممکن تھا کہ مصالحت ۹ پر ہو جاتی اگر ۵ دیئے جاتے تو ممکن تھا کہ ۲ پر مصالحت ہو جاتی لیکن اب ملا کیا ہے جس پر مصالحت کی جائے؟ موجودہ حالات میں تو مصالحت کی صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ سنّی اپنے حق سے بِالکُلّیّۃ دستبردار ہو جائیں۔

لیکن واضح رہے کہ یہ مسئلہ کا تصفیہ پورے طور پر لکھنؤ سے باہر رہنے والے حضرات کے طے کرنے کا نہیں ہے جب تک کہ سنّیانِ لکھنؤ کا اطمینان نہ کر دیا جائے اس ہیجان کے ختم ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ لکھنؤ میں سنّیوں کی تعداد اسّی (۸۰۰۰۰) ہزار کے قریب ہے اور شیعوں کی تعداد بیس (۲۰۰۰۰) ہزار کے قریب ہے۔ سال بھر میں شیعوں کے بیسیوں جلوس نکلتے ہیں لیکن سنیوں کا کوئی جلوس خالصۃً سنّی ہونے کی حیثیت سے نہیں نکلتا۔ لکھنؤ میں ان کو کسی جلوس ہی کے نکالنے کی ممانعت نہیں بلکہ جلسے کرنے کی بھی ممانعت ہے وہ جلسوں میں بھی مدح صحابہ نہیں پڑھ سکتے۔ پچھلے ایجی ٹیشن میں جن اشعار کے پڑھنے پر سنیوں کی گرفتاریاں ہوئیں ان میں سے بعض بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہو گا کہ لکھنؤ میں سنّی کس حق کے لیے تکلیفیں اٹھا رہے ہیں اور وہ کون سا حق ہے جس کی مخالفت تبرّا پڑھنے کی دھمکی دے کر کی جا رہی ہے ؎

خداوندا قسم تجھ کو شفیعِ روزِ محشر کی　　محبّت دے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و حیدرؓ کی
خدا شاہد نبی شاہد زمیں شاہد زماں شاہد　　صداقت کل جہاں نے مان لی صدّیقِ اکبر کی
مُشرّف جب ہوتے فاروقِ اعظم دینِ احمد سے　　صدا کانوں میں پہنچی ہر طرف اللّٰہ اکبر کی

ہمیں اے جذبۂ اسلام تجھ سے کام لینا ہے　　ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ ۔ علیؓ کا نام لینا ہے
أَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ ان کی شان میں آیا　　کلام اللّٰہ کی تفسیر ان کا نام لینا ہے
نہ تخت روم لینا ہے نہ ملک شام لینا ہے　　ہمیں دنیا کے ہر گوشے میں حق کا نام لینا ہے
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ علیؓ کا ہم پہ احساں ہے　　ہمیں اس واسطے یہ نام صبح و شام لینا ہے
جلال و جذبۂ فاروقِ اعظم ہم کو دے یا رب　　اگر دنیا میں ہم سے خدمتِ اسلام لینا ہے
دل آزاری کسی کی ہم نہ کرتے تھے نہ کرتے ہیں　　ہمیں تو صرف آقاؤں کا اپنے نام لینا ہے
شجاعانِ جہاں ڈرتے تھے فاروقِ دلاورؓ سے　　کہ ان کا سامنا تو موت کا پیغام لینا ہے

یہ ہیں وہ اشعار جن کے متعلق شیعوں کا قول ہے کہ ان کو سن کر انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ یا لَلْعَجَب! لیکن حکومت کے لیے تو صرف شیعوں کا کہنا کافی نہیں ہونا چاہیئے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آیا عام طور سے اور عام اصولِ اخلاق و آدابِ معاشرت کے لحاظ سے یہ اشعار دل آزار ہیں یا نہیں۔ البتہ اس بات کے متعلق شیعوں کو اطمینان کرایا جا سکتا ہے کہ ان جلسوں اور جلوسوں میں کبھی ایسے اشعار نہ پڑھے جائیں گے نہ ایسی باتیں کہی جائیں گی جن سے اِشارۃً یا کِنایۃً اُن پر کسی قسم کا حملہ ہو۔

ایک مطالبہ حضرات شیعہ کی جانب سے یہ کیا جاتا ہے کہ جب سنّیوں کو ایک حق مل گیا تو ان کو چاہیئے کہ اپنے بھائیوں کی دل آزاری کے خیال سے دستبردار ہو جائیں۔ مجھے اخلاقی طور سے ان کے اس مطالبہ سے انکار نہیں اور میں ایسے بہت سے حضرات کو جانتا ہوں جنہوں نے بارہا یہ کہا کہ جلوسوں کی اگر عام اجازت ہو جاتی ہے تو سنّیوں کو اُن کے ترک کر دینے میں کوئی عذر نہیں، لیکن سُوال یہ ہے کہ اِس وقت تک اجازت ملی بھی ہے یا نہیں؟ اگر بارہ مہینہ کی عام اجازت مل جاتی ہے اور پھر شیعہ حضرات لکھنؤ میں ایک اور جلوس سکون کے ساتھ نکل جانے دیتے تو پھر بے شک ان کو یہ کہنے کا حق ہو سکتا تھا کہ وہ جلوسوں سے دستبردار ہو جائیں۔ لیکن جب زبردستی اور زور سے اس جائز حق کے استعمال سے روکا جاتا ہے تو دوسرے لوگوں اور بالخصوص سُنّیانِ لکھنؤ سے یہ توقع کرنا کہ وہ اس حق سے دستبردار ہو جائیں گے ایک ناممکن بات ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب اور تحریکِ مدحِ صحابہ

اکثر حضرات مولانا حسین احمد صاحب اور احرار کے متعلق یہ اعتراضات کرتے ہیں کہ انہوں نے تحریک مدحِ صحابہ میں کیوں حصّہ لیا؟ لیکن شاید ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جب حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا بیان السپ کمیٹی کے سامنے بطور گواہ کے ہوا تھا۔ تو انہوں نے صراحت سے اس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے مدحِ صحابہ کی مخالفت کو مُد اختلف فی الدین فرمایا تھا۔ اور اس کی وجوہات تفصیل کے ساتھ کمیشن کے سامنے پیش کی تھیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے جیسے وہ بارہا مختلف موقعوں پر بیان فرما چکے ہیں۔ تحریک مدح صحابہ میں شرکت نہ شیعوں کی مخالفت پر مبنی ہے اور نہ اس کا باعث پچھلی تحریک مدح صحابہ ہے۔ جب مدح صحابہ کا ایجی ٹیشن ملتوی ہوا۔ اور مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوا۔ تو مولانا حسین احمد صاحب ہی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے روحِ رواں تھے۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں بعض شیعہ امیدوار سنّی امیدواروں کے مقابلہ میں منتخب کیے گئے اور مولانا موصوف نے ان امیدواروں کی پوری تائید کی اور بعض شیعہ امیدوار تو ایسے ہیں جو صرف مولانا موصوف کی امداد سے ہی کامیاب ہوئے۔ مجلس احرار نے بھی خود لکھنؤ میں شیعہ امیدواروں کی پورے طور پر تائید کی۔ ہمیشہ سے اُن کا دعویٰ ہے کہ مدح صحابہ کی جنگ ایک شہری اور مذہبی حق کی جنگ ہے وہ شیعوں کی عداوت یا اقلیتوں کی حق تلفی کرنے پر مبنی نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیشہ گورنمنٹ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ بجائے دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ اور دفعہ ۱۰۸ میں سزا دینے کے مدح صحابہ پڑھنے والوں کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹۸ کے ماتحت گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلا کر سنّیوں کو یہ موقعہ دے کہ وہ عدالت عالیہ ہائی کورٹ سے اس امر کا فیصلہ حاصل کر سکیں کہ آیا مدح صحابہ پڑھنا قانوناً جرم ہو سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ میں سارے سنّیانِ ہندوستان کی طرف سے علیٰ رؤس الاشہاد یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا کوئی ہائی کورٹ یہ طے کردے کہ مدح صحابہ پڑھنا دفعہ ۲۹۸ تعزیرات ہند کا جرم ہے تو ہم اپنے اس حق سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جائیں گے۔ اسی طرح سے اگر تبرّا کے متعلق مقدمہ چلا کر ہائی کورٹ سے تجویز لے لی جائے تو وہ بھی ہمارے لیے قابل پابندی ہوگی۔ لیکن گورنمنٹ نے کبھی مدح صحابہ پڑھنے والوں پر ہمارے مطالبہ کے موافق

اور خود گورنمنٹ کے ۱۹۰۹ء کے ریزولیوشن کے مطابق مقدمہ نہیں چلایا۔

ان معروضات سے یہ معلوم ہوگا کہ اس تحریک کے چلانے میں نہ اکثریت کا غرور ہے نہ اقلیت کی تحقیر، بلکہ لکھنؤ کے ۸۰ ہزار پریشان حال سنّیوں کے ایک جائز مطالبہ اور حق کی تائید ہے

۱۹۳۹ء میں کانگریس حکومت کے زمانہ میں بارہ وفات کے روز جلوس مدح صحابہ نکالا گیا۔ اس وقت صوبہ میں سر ہنری ہیگ گورنر تھے۔ پھر ۱۹۴۰ء میں جب صوبہ میں جمود پیدا ہو چکا تھا اور مسٹر گوبند ولبھ پنتھ کی وزارت مستعفی ہو چکی تھی۔ صوبہ متحدہ کے گورنر سر مارس ہیلیٹ کے زمانہ میں بھی یہ جلوس نکلا۔ اسی طرح برابر دو سال تک یہ جلوس نکالا گیا۔ اس سال ۱۹۴۱ء میں بھی حسب دستور مسلمان جلوس مدح صحابہ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دفعۃً ۵ اپریل ۱۹۴۱ء کو سنیوں کے ایک وفد کو جو جلوس مدح صحابہ کے راستے کے لیے مسٹر یونس لائیڈ ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا تھا۔ موصوف نے بتایا کہ شیعوں کو ایک جوابی جلوس کی اجازت دی جانے والی ہے۔ اور یہ بتایا کہ اس میں تاریخی نکات ہیں جو نظم میں بصورت درخواست انجمن تنظیم المومنین کے سیکرٹری نے پیش کیے ہیں۔ ایک شیعہ مجسٹریٹ نے جو اس وقت موجود تھے یہاں تک کہا کہ اس کو دکھلا دیا جائے۔ لیکن ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ یہ مناسب نہ ہوگا کہ کسی کے جذبات کو مجروح کیا جائے۔ اس لیے کہ کئی روز قبل اخبار "تنظیم" میں جو شیعہ جماعت انجمن تنظیم کا ایک ذمہ دار آرگن ہے یہ شائع ہو چکا تھا کہ مسٹر سید اشرف حسین وکیل نے جو انجمن تنظیم کے سیکرٹری ہیں تبرا کے جلوس کے لیے ایک درخواست ڈپٹی کمشنر کو دی ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر کہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ایک ایسے غیر قانونی جلوس کی اجازت دینے والے ہیں۔ جو صحابہ کرام کی ذات پر تبرا و تنقید یا قدح کرے گا۔ لکھنؤ کے مسلمانوں میں ایک آگ لگ گئی اور انتہائی بے چینی پیدا ہو گئی۔

چنانچہ ایک بہت بڑا جلسہ مجلس احرار لکھنؤ اور انجمن ناموس صحابہ کا مشترکہ احاطہ شیخ شوکت علی مرحوم میں ۱۰ اپریل ۱۹۴۱ء کو بصدارت مسٹر وصی احمد منعقد کیا گیا جس میں ۵۰ ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔

مقررین نے حکومت کو انتباہ کیا کہ اگر خدانخواستہ اس جلوس کی شیعوں کو اجازت دے دی گئی تو ہم سنّی مسلمان اپنی جانیں قربان کر دیں گے اور کسی طرح ایسے جلوس کو نہ نکلنے دیں گے۔

اس جلسے میں دو روز کے لیے مکمل ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ چنانچہ ۸ اور ۱۰ اپریل تک شہر میں مکمل ہڑتال منائی

گئی۔ ۸ اپریل ۱۹۴۱ء اخبار "پانیئر" میں مسٹر لوئیس لاٹبڈ کا یہ حکم نکلا کہ شیعوں کو ایک جوابی جلوس کی اجازت بارہ وفات کے روز دے دی گئی اور شیعہ جلوس شاہ نجف سے شرغر پارک تک کشمیری محلے میں رہے گا۔ سنیوں کو اجازت نہ ہوگی۔ کہ وہ اس جلوس کے قریب جائیں۔ شیعہ اخبار "تنظیم" نے اپنا ایک اسپیشل نمبر نکالا جس میں یہ بتایا گیا کہ شیعہ جس کے لیے ہر ممکن مساعی سے جدوجہد کر رہے تھے وہ حق مل گیا۔ کانگریس حکومت کی ناانصافی انصاف سے بدل گئی۔ یہ یاد رہے کہ مسٹر سلطان احمد وغیرہ کانگریس حکومت کے زمانہ میں بھی اس جلوس کے لیے کوشش میں رہے مگر ناکام رہے۔ یہ اطلاع جیسے ہی مسلمانوں کو معلوم ہوئی۔ انہوں نے فوراً ہی ایک جلسہ احاطہ شوکت علی میں سہ پہر کو طلب کیا۔ لیکن کرفیو آرڈر کے نفاذ کے باعث

دوسرے دن صبح کو ہوا۔ اگرچہ ہر طرف پولیس تھی۔ اور مولانا عبدالقیوم[1] سالار اعظم جیوش احرار یو۔ پی۔ مسٹر وصی احمد سیکرٹری مجلس احرار۔ حافظ مشتاق احمد[2] سابق صدر مجلس احرار اسلام۔ غازی منے خاں اور مولانا کلیم اللہ وغیرہ کے پہلے سے وارنٹ نکال دیئے گئے تھے۔ کہ یہ لوگ جلسہ ہونے سے قبل ہی گرفتار ہو جائیں۔ لیکن یہ لوگ کسی نہ کسی طرح سے جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ اور انہوں نے مولانا عبدالشکور صاحب کے نائب **مولوی کلیم اللہ** کے ہاتھ پر اپنی اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے بیعت کی اور مسلمانوں سے شرعی عہد لیا کہ وہ اب ایسی حالت میں زندہ رہنا نہیں چاہتے اور نہ کسی مسلمان کے لیے یہ مناسب ہے عین جلسے میں یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔

تین بجے کے بعد اسی ۹ اپریل سہ پہر کے وقت ایک جلسہ پھر ہوا۔ جس میں مولانا عبدالشکور خاں صاحب نے بھی تقریر کی۔ اور آخر میں یہ اطلاع ملی کہ ڈپٹی کمشنر نے مدح صحابہ کا جلوس ایک ہفتہ کے لیے بند کر دیا۔ اسی کے ساتھ بارہ وفات کے روز جلوس مدح صحابہ کو بھی نقضِ امن کے پیدا ہونے کے اندیشے سے روک دیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کے اس اعلان سے صورت بدل گئی۔ کیوں کہ شیعہ جلوس روک دیا گیا تھا۔ لیکن مدح صحابہ کے جلوس پر یہ پابندی کسی طرح سے مبنی بر انصاف نہ سمجھی گئی۔ کیوں کہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو یو۔ پی گورنمنٹ نے جو کمیونک شائع کیا تھا۔ اس میں یہ صاف تصریح تھی کہ ہر حالت میں یہ جلوس اٹھے گا۔ صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ راستہ کا تعین کرے گا۔

چنانچہ ۱۰ اپریل کو بارہ وفات کے روز تقریباً ایک ہزار سے زائد مسلمانوں نے عید گاہ سے جلوس نکالا۔ اور گرفتار ہوئے۔ اگرچہ ۹ اپریل کو سہ پہر کے وقت یہ اطلاع ملی کہ گورنمنٹ نے ۳۶ گھنٹہ کا کرفیو آرڈر نافذ کر دیا

[1] کان پوری، حال مقیم حیدرآباد سندھ۔ [2] لدھیانوی حال مقیم راولپنڈی ۱۲

ہے۔ تاکہ شیعہ اور سنی گھروں سے نہ نکلیں۔

دو گھنٹے کا وقت ملنے پر سات بجے سے پہلے ہی ہزاروں مسلمان عید گاہ پہنچ گئے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی پولیس اور سوار بھی پہنچے اور رات بھر ان کا محاصرہ جاری رکھا گیا۔ حتیٰ کہ ہندو خوانچہ والے بھی نہ جا سکے اور وہ لوگ بھوکے پیاسے رہے۔ ۸ بجے دن سے عین جلوس نکلنے کے وقت سے سول نافرمانی شروع کر دی گئی اور چار چار آدمیوں کے جتھے مدح صحابہ پڑھتے ہوئے گرفتار ہونے لگے۔ شام تک ایک ہزار سے زاید گرفتار ہو گئے جس میں مولانا انور صابری۔ مولوی وحید الحسن وکیل۔ حافظ مشتاق احمد لدھیانوی صدر احرار۔ نذیر احمد ایڈوکیٹ۔ مسٹر بادشاہ علی۔ مسٹر عبدالحی۔ ڈاکٹر محبوب وغیرہ بھی شامل تھے۔ رات کو تمام لوگ چھوڑ دیئے گئے اور پانچ روپیہ فی کس جرمانہ کیا گیا۔ لیکن مولانا صابری۔ حافظ مشتاق احمد۔ مسٹر نذیر احمد ایڈوکیٹ کو تین تین ماہ کی قید سخت اور دو سو روپیہ جرمانہ کیا گیا۔

۱۱ اپریل جمعہ کو عید گاہ میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں مولانا عبدالشکور صاحب نے تقریر کی اور ۱۴ اپریل تک کے لیے سول نافرمانی بند کر دی گئی۔

۱۴ اپریل دوشنبہ کو عید گاہ میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس کے بعد سول نافرمانی شروع ہو گئی اور ۸ سو سے زاید مسلمان گرفتار ہوئے۔ خود مولانا عبدالشکور صاحب اور مجلس احرار کے تمام بڑے بڑے لیڈر پہلے ہی گرفتار ہو گئے تھے اور غازی منے خاں۔ مولانا عبدالقیوم۔ مسٹر وصی احمد۔ مولانا کلیم اللہ پر دفعہ ۳۰۲ لگائی گئی۔ سول نافرمانی جاری ہے اور (۲۶۰۰) چھبیس سو سے زائد مسلمان بارہ وفات ۱۰ اپریل سے اب تک اپنے کو گرفتار کرا چکے ہیں۔ اور گرفتاریوں کا سلسلہ مدح صحابہ پڑھ کر جاری ہے۔

مسلمان صرف ایک جائز حق کے لیے جو ہندوستان کے دوسرے فرقوں کو حاصل ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی تعریف کریں۔ قربانیاں کر رہے ہیں۔ آج لکھنؤ میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمر فاروقؓ حضرت عثمان غنیؓ حضرت مولا علیؓ کی تعریف کرنا اور ان کا نام لینا جرم ہے۔ جن کو دنیا کی بڑی بڑی غیر مسلم ہستیاں خراج عقیدت پیش کر چکی ہیں۔

لکھنؤ کی سرزمین پر شیعہ حضرات سال بھر میں ایک سو چوالیس (۱۴۴) جلوس نکالتے ہیں۔ لیکن سنی مسلمان اپنا کوئی مذہبی جلوس نہیں نکال سکتے جو سنیوں کا خالص مذہبی جلوس ہو۔

مسجد شہید گنج کے لیے

"احرار" کی سول نافرمانی

سچ کی آخر فتح ضرور ہوتی ہے۔ مگر حق پسندوں کی قربانیوں کے بعد ضروری ہے کہ حق کی فتح کے یقین کے ساتھ جھوٹ کے حملوں سے جان کو بچایا جائے۔ سچ کے بیج میں بڑھنے پھلنے اور پھولنے کی صلاحیت ضرور ہے مگر آب رسانی اور نگہداشت بھی لازمی ہے۔ کیڑے مکوڑوں، جانوروں اور مویشیوں سے حفاظت کے بغیر اس کی کوئی برداشت ممکن نہیں۔ مسجد شہید گنج کا مسئلہ کتنا سیدھا اور صاف تھا۔ مجلس احرار کا نظریہ کتنا درست تھا۔ کہیں سے ان دونوں آواز اٹھی کہ احرار دائرہ برسر حق ہو۔ بولے تو چند سوشلسٹ بولے۔ سرمایہ دار دنیا میں جن کی کوئی حیثیت نہیں۔

احرار نے غلطی کی مجرد سچائی کی فتح پر یقین کر لیا اور چپکے بیٹھ گئے۔ جب سچائی کے ساتھ سادہ لوحی شامل ہو جائے تو حق کی بار آوری کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ ہم نے کمال سادہ لوحی سے یہ بھی سمجھ لیا کہ ہمارے

مخالف شاید نیک نیتی سے ایک مسئلہ کو درست سمجھ کر غلط قدم اٹھا رہے ہیں۔ مگر ان کی نیتوں میں فتور تھا۔ وہ مسجد بنانے کے بجائے احرار کو گرانا ضروری سمجھتے تھے۔ ہم میں سے اکثر یہ اعتماد رکھتے تھے کہ ہمارے مخالف جلد راہ راست پر آجائیں گے مگر تجربے نے بتایا کہ ہماری سچائی سے بھی انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ جھوٹ افسانے تراش کر ہمیں بدنام کرنا ان کا پیشہ بن گیا ہے۔ ہمارا راہ چلنا دوبھر ہو گیا۔ تاآنکہ انہوں نے ہم پر حملے شروع کر دیئے پھر سچائی کی فتح کے لیے ہمیں ہمت سے کام لینا پڑا۔ لفنگوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ شریر مگر اپنے آپ کو شریف سمجھنے والے دب گئے۔ اس طرح ہمیں مدت کے بعد آرام سے سانس لینا میسر آیا۔

مرزائیوں اور امراء کے گروہ نے اپنے خیال میں احرار کو موت کی نیند سلا دیا تھا مگر خدا کو احرار سے بہت سا کام لینا تھا۔ وہ بطور پارٹی کے پھر مضبوط ہو گئے۔ شہید گنج کی ایجی ٹیشن سے پہلے ان کی محض ہوا بندھی ہوئی تھی شیرازہ بندی نہ تھی۔ اب اگرچہ ہوا خیزی ہوئی۔ تاہم جماعت احرار حقیقی معنوں میں جماعت ہو گئی۔ ہر جگہ دفتر کھل گئے۔ والنٹیروں کا نظام مضبوط ہو گیا۔ سچائی کے لیے لڑنا جماعت کے لیے قربانی کرنا ان کے لیے آسان ہو گیا۔

الیکشنوں میں امراء کے فریق کو جب حکومت بنانے میں کامیابی ہو گئی۔ تو احرار کے خلاف ایجی ٹیشن دب سی گئی اور لوگوں کی زبانیں کھل گئیں کہ مسجد کی واگذاری کا اب نام کیوں نہیں لیا جاتا؟ عوام کی زبان بندی کا مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ طریقہ سوچا گیا کہ برٹش حکومت کو دھمکی دی جائے کہ "اگر مسجد واگذار نہ کی گئی تو مسلم لیگ کی حکومت سے ٹکرانا گزیر ہوگی" یہ ریزولیوشن پاس کرنے کے بعد شہید گنج کے بارے میں مسلم لیگ کے خلوص کا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ اب احرار مسجد کی واگذاری کے حامیوں کی چالوں کو خوب سمجھ گئے تھے۔ اب وہ ان کے فریب سے قوم کو نکالنے کے قابل تھے لطف کی بات یہ ہے کہ جب یہ ریزولیوشن لیگ میں پاس ہوا تو لیگ کے وزرا بھی وہاں موجود تھے۔

احرار فوراً اس چال کو بھانپ گئے۔ کہ اب قوم کو ابھی کچھ دیر اور بدھو بنانے کے ارادے ہیں۔ مولانا مظہر علی نے جلسہ عام کر کے ان کی چالوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اگر مسجد شہید گنج کا واقعی درد ان کے دل میں ہے تو وہ آئیں قربانیاں کر کے دکھائیں۔ اب تو حکومت ہی پنجاب میں لیگ کی ہے۔ پھر واگذاری میں دیر کیا ہے؟ اتحاد ملت اس وقت دم توڑ رہی تھی۔ یہ صدا ایک بم ثابت ہوئی۔ مولانا مظہر علی نے کہا اگر سول نافرمانی کا کبھی وقت

تھا تو یہ ہے جبکہ حکومت بقول ان کے حامیوں کے اسلامی اور مسلم لیگ مسجد کی واگذاری کی پابند ہے۔ جب کوتوال سیّاں بھئے تو پھر ڈر کاہے کا، اتحاد ملت کے رہے سہے مخلص نوجوانوں نے کہا۔ مسجد شہید گنج کی واگذاری کا واقعی بہترین موقعہ ہے حکومت اپنی ہے ذرا زور دینے کی کسر ہے مسجد ملی ہی سمجھو۔ وہ اپنے رہنما کے لیڈروں کے پاس آرزو میں لے کر گئے۔ اب ان کا کام نکل چکا۔ انہوں نے طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیں۔ ان عزیز نوجوانوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے بھی پلٹ کر کہا کہ احرار کا کہا سچ ہوا۔ مسجد کا گرانا احرار کو مٹانے کا بہانہ تھا ورنہ آپ کا جوش کڑھی کا اُبال نہ ہوتا۔ اس طرح پر انہوں نے چمک کر جواب دیا۔ اگر ہائی کورٹ نے فیصلہ ہمارے خلاف کیا تو ہمارے ہاتھ دیکھنا۔ بس اسی کا انتظار ہے یا مسجد بذریعہ فیصلہ ملے گی یا ہم شمع ایمانی پر قربان ہو جائیں گے۔ اتحاد ملت کے یہ غیر مخلص لیڈر "منزل انہ بلائے کہ شب درمیان است" کے مقولے پر عمل کر کے بات کو ٹالنے کے لیے سبز باغ دکھا رہے تھے۔ ورنہ شروع سے ہی ان کی واگذاری پر نہ یقین تھا نہ انہیں مسجد کے گرنے کا ذرہ بھر صدمہ تھا۔ ان کے ایمان کو تو احرار کا وقار کھا گیا۔ جس کو دیکھ کر وہ ہر وقت خار کھاتے تھے۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ان دنوں ہائی کورٹ کے تاریخ فیصلہ کا بھی اعلان ہو گیا۔ مولانا مظہر علی نے سول نافرمانی کا آغاز کر دیا۔ لیگی حلقے اور اتحاد ملت کے غیر مخلص لیڈر اب بغلیں جھانکنے لگے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اب ریاکاری کا پردہ چاک ہوا کہ ہوا۔ خیر ان کا انتخابی مہم کا کام نکل چکا تھا۔ وہ مسجد کو گروا کر احرار کو ناکام کر چکے تھے۔ یہ وجہ تسلی ضرور تھی ورنہ جدھر نکلتے لوگ انہیں ملامت کرتے تھے۔ تا آنکہ مسجد کا فیصلہ ہائی کورٹ نے مسلمانوں کے خلاف کر دیا۔ اگرچہ تحریک شہید گنج کے علمبرداروں کے سامنے مجلس احرار کو گرانے کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ لیکن عوام مخلص تھے۔ انہیں ان کی کہی ہوئی بات کا یقین تھا۔ اب انہوں نے لیڈروں کے گلے میں انگوٹھا دیا۔ کہو اب کیا کہتے ہو؟ اتحاد ملت کے مخلص نوجوانوں نے تو سول نافرمانی شروع کر دی مگر پلیٹ فارم احرار سے الگ رکھا۔ اتحاد ملت اور لیگ کے لیڈر دبک گئے۔ خود غرضی کا آخری انجام رسوائی ہے۔ وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ تھے جو دیکھتا تھا چھٹکارتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں بازار سے گزرے۔ لوگوں نے روک کر گلے میں پھول مالا ڈال دی۔ شہید گنج زندہ باد کا نعرہ لگایا اور مولانا کو آگے ہانک لیا۔ مولانا نے ہزار عذر کیا کہ صاحبو! میں تو یوں ہی ادھر آ گیا ہوں۔ مجھے سوچنے کی مہلت دو مگر لوگ نہ ملے۔ بولے بھیّا اتنی مدت تو تم سول نافرمانی کے لیے پکارتے تھے اور بار بار احرار کو للکارتے تھے اب

سوچ بچار کا کیا موقعہ ہے؟ بسم اللہ کرو اور نار نمرود میں کود جاؤ۔ مولانا اس مرتبہ پھر اسمبلی کے ممبر بن چکے تھے۔ مدت کی آرزوؤں کی بڑھاپے میں تکمیل ہوتی تھی۔ ان کی عمر کی شیریں خوابوں کی دل نشین تعبیر اسمبلی کی کرسی تھی۔ مولانا اس سے جدا ہو کر جیل جانے کو کیسے تیار ہو تے۔ اور مصیبت یہ کہ کرسی سر سکندر کے طفیل ملی تھی۔ یہ سول نافرمانی سکندری حکومت کے خلاف تھی۔ مولانا مسجد کی واگزاری کی قیمت پر بھی سر سکندر کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ عجیب ہنگامہ ہوا۔ لوگ مولانا کو مسجد شہید گنج کی طرف کھینچتے اور مولانا دفتر "زمیندار" کی طرف بھاگتے تھے۔ اس بھاگ دوڑ میں مولانا کی سانس پھول گئی۔ شہری لفنگوں نے پھر آپ کو آ لیا اور آگے دھر لیا۔ شہر کے یہ وہی لفنگے تھے جن کو ہمارے خلاف بھڑکایا گیا تھا۔ اب یہ شعلے بن کر مولانا کے دامن کی طرف لپک رہے تھے۔ یہ لوگ برابر جوتے کنکر برساتے تھے۔ اس طرح تالیاں بجا بجا کر شور کرتے تھے۔ گویا شہر کے بچے کسی سودائی سے دل لگی کرتے ہیں۔ جس نے دیکھا دانتوں تلے انگلی دبالی۔ اور اس عبرت انگیز انجام پر افسوس کیا۔

احرار کو جو مولانا ظفر علی خاں اور ان کے ساتھیوں سے اذیت پہنچی۔ وہ ہر شخص کو معلوم ہے مولانا ظفر علی خاں اور اتحاد ملتی رفقار کے ہاتھوں جو صدمے پہنچے اس سے کوئی بے خبر نہیں۔ مسجد وزیر خاں میں سید عطاء اللہ شاہ کے قتل کی تدبیر ہوئی۔ صاحبزادہ فیض الحسن، خان محمود علی خان اور مجھ پر تیزاب ڈلوایا گیا۔ مولانا مظہر علی کے کپڑے پھاڑ ڈالے گئے۔ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار نے حملہ آور لفنگوں کو غازی کا خطاب دیا۔ اور ہر موقعے پر غیر شریفانہ فعل کو سراہا۔ ایک مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقاء پر کیا موقوف ہے؟ ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیتیں ہماری بے عزتی کے درپے تھیں۔ لیکن ہمارا حال اور تھا۔ جب مولانا کا ایسا حال سنا تو ہم بے تاب ہو گئے۔ میں اٹھا کہ مولانا کو بچا کر دفتر میں لے آؤں مگر معلوم ہوا کہ پولیس نے مولانا کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ کسی کی بے عزتی کے منظر سے خوش ہونا شرافت کی دلیل نہیں۔ ہر چند ہماری تباہی میں مولانا نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن ایسے فعل کی حمایت نہیں کی جا سکتی تھی۔ سیاسیات میں لفظی جنگ سے آگے بڑھنا مذموم فعل ہے۔ مولانا نے احرار کو صدمہ پہنچانے میں مرزائیت کو خوش کرنے سے بھی پرہیز نہ کیا۔ احرار اور مرزائیوں کی مخالفت ایک دائمی صورت اختیار کر چکی تھی۔ مگر مولانا نے اتنا بھی نہ سوچا کہ احرار کمزور ہوں گے تو مرزائیوں کی ملت کفر کو فروغ ہو گا۔ انسان جب تک سیدھی راہ چلے غنیمت ہے۔ بدقسمتی ہے اُن کی جو راہ راست سے بھٹک جائیں۔ شاید ہی ہندوستان میں کسی نے مولانا

ظفر علی خاں کی سی روش اختیار کی ہو جس پوزیشن میں وہ اب چلے گئے ہیں۔ اس پر ان کے دشمنوں کو بھی افسوس ہے خدا ہر ایک کو صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی توفیق دے افسوس ہے ان پر جن کی سیاسی کشتی کنارے کے قریب پہنچ کر غرق ہو جائے۔ اور وہ بڑھاپے میں راہِ حق سے دور ہو جائیں۔

احرار کی سول نافرمانی کئی ماہ جاری رہی۔ اتحاد ملت کے پاس آدمی کہاں تھے؟ ایسی صورت میں کہ لیڈر ہی جان بچاتے پھریں۔ مگر ہماری خواہش یہ تھی کہ اتحاد ملت خواہ ہفتے میں ایک والنٹیر بھیجے مگر بھیجے ضرور تاکہ مقصد کو تقویت پہنچے۔ مقصد یہ تھا کہ ریاکاری کا پردہ چاک ہو۔ آخر حالات سے مجبور ہو کر سر سکندر حیات خاں نے صاف اعلان کر دیا کہ مسجد شہید گنج سول نافرمانی کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ مسجد زور سے حاصل کی گئی تو وہ مساجد جو ہندو و معابد پر بنائی گئی ہیں ان کو واپس کرنا پڑے گا۔ اگر سول نافرمانی بند ہو جائے تو میں آئینی طریقوں سے مسجد حاصل کرنے کی صورت کروں گا۔ جب لوگوں نے یہ اعلان پڑھا تو کہا یہ تو حرف بحرف وہی بات ہے جو احرار اس وقت تک کہتے چلے آئے تھے۔ یہ کتنا بڑا فریب ہوا کہ ہم نے احرار کے خلاف غم اور غصّے کا اظہار کیا؟ اب کوئی مسجد کا نام لیتا۔ کیوں کہ احرار کو انتخابات میں شکست ہو چکی تھی۔ اور یہی یہ تحریک اٹھانے والوں کا مقصد تھا۔ علاوہ ازیں اب ریاکاری کا پردہ چاک ہو گیا تھا کس منہ سے فریب کی باتیں کہتے رہتے؟ اگرچہ احرار نے اپنے پرانے رفیقوں سے بہت صدمے اٹھائے۔ باوجود اس کے ہمارے دل میں کوئی کدورت نہیں۔ جب وہ سامنے آجاتے ہیں تو وہ صدمے بھول جاتے ہیں۔ صرف پرانی رفاقت کا احساس رہ جاتا ہے اور باقی گلے شکوے جاتے رہتے ہیں۔

مسئلہ فلسطین ۱۹۳۸ء

درد کی بے تابی میں بے قراری قدرتی امر ہے۔ غلام آباد ہند میں رہتے ہوئے بیرون ہند کے مسلمانوں پر مصائب دیکھ کر اضطراب فطری مجبوری ہے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد حکومتِ انگریزی کی یہود نوازی کے صدقے فلسطین کے مسلمانوں کو جو روز بد دیکھنے پڑے۔ اس کی داستان ڈائنامیٹ سے اڑائی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے پوچھو اور عرب نوجوانوں کے خون کی ارزانی سے اندازہ کرو مسلمانوں کا سرمایہ دار طبقہ تو چلتی پھرتی لاشیں ہیں۔ یہ دین سے بیزار دین ان سے بیزار۔ مگر عام مسلمان فلسطین کے دردناک حالات سن کر ماہی بے آب

ہو گئے۔ میرٹھ میں آزاد خیال مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ غلامی کی مجبوریاں پیش نظر تھیں۔ فیصلہ ہوا کہ کوئی اقدام کیا جائے مگر یہ اقدام کیا ہو؟ مجلس مشاورت کے آئندہ اجلاس پر موقوف رہا۔ مولانا حبیب الرحمٰن جن کی ہمت لیت و لعل کی روادار نہیں۔ ان کا دل تذبذب کو قبول نہیں کرتا۔ اس زمانے میں احرار کے صدر تھے۔ یہ شیر دل رہنما حالات سے بے حد متاثر تھا۔ لودھیانہ میں آپ نے آب دیدہ ہو کر ایک آتشیں تقریر فرمائی۔ پولیس نے گھبرا کر افواج میں بغاوت پھیلانے کے جرم میں آپ کو ماخوذ کر لیا۔ مولانا نے راہ حق میں ہمیشہ جبر کو صبر سے قبول کیا۔ وہ خندہ پیشانی سے پاداش اٹھانے کو تیار ہو گئے۔ لیکن گھبراہٹ کے باعث پولیس کے چالان میں خامیاں رہ گئیں۔ وہ جرم جس کی سزا عمر قید تھی ثابت نہ ہو سکا۔ مگر ڈیڑھ سال کے لیے بھاری ضمانت لی گئی۔ پھر جب جنگ شروع ہوئی۔ تو آپ کو نظر بند کر لیا گیا۔ مولانا ان لوگوں میں سے ہیں جن کی عمر خدا کی راہ میں تکلیفوں میں کٹی اور انہوں نے اُف نہ کی وہ حق کے لیے بار بار جیل گئے۔ باوجود مالی کمزوری کے مہمان نوازی میں جان لڑا دی۔ صحت کی حالت تشویش ناک ہے مگر جیل میں استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

بہرحال مولانا کے خلاف مقدمہ نے کافی طوالت پکڑی۔ مسئلہ فلسطین کے بارے میں کوئی قدم نہ اٹھا پائے تھے کہ مطلع یورپ جنگ کے بادلوں سے تیرہ و تار ہونا شروع ہو گیا۔ تا آنکہ دنیا کا سب سے بڑا ہولناک حادثہ رونما ہوا اور ساری دنیا جنگ کی لپیٹ میں آگئی۔ آثار جنگ دیکھ کر حکومت نے تیور بدلے اور احرار کو تشدّد کا شکار بنانا شروع کر دیا۔ قبل از جنگ مولانا مظہر علی کو بغاوت کے جرم میں دھر لیا۔ اور سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب کو خونی جنگ کے لیے لوگوں کو ابھارنے کے الزام میں ماخوذ کیا۔ دنیا جانتی ہے کہ دورِ حاضر کے اس بے بدل خطیب کو عمر بھر جیل کی تکلیفوں سے دوچار رہنا پڑا ہے مگر یہ کڑا امتحان تھا۔ دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند کی سزا عمر قید یا پھانسی کا تختہ ہے۔ عجب واقعہ پیش آیا کہ زبان خنجر شاہ صاحب کی بے گناہی کی شہادت دینے لگی یعنی سرکاری رپورٹر نے بھری عدالت میں گواہی دی کہ شاہ صاحب کے گلے کا پھندا یعنی یہ رپورٹ کا مسودہ سرکاری اشارے پر تیار کیا گیا تھا۔ پنجاب کی خاموش فضا میں رپورٹر کا یہ بیان بم کی طرح برسا۔ سارے ہندوستان کی نگاہیں اس مقدمہ کی طرف لگ گئیں۔ آخر عدالت عالیہ نے شاہ صاحب کو بری کر دیا۔

سکھرؔ کی مسجدِ منزل گاہ

ہمیشہ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کے لیے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ سکھر میں مسلمان زندہ ہیں۔ مگر موت کے دن پورے کرنے کو۔ شہر پر ہر اعتبار سے ہندو سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ مسلمان مزدوری پیشہ اور دوسروں کے دستِ نگر ہیں۔ ہندوؤں نے کمال زورآوری سے مندر کے قریب ایک مسجد کے قبضے کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ یہ مسجد سرکار کے قبضے میں تھی۔ اس لیے مسئلے کی نوعیت دوسری تھی۔ مسلم لیگ ان دنوں سندھ میں حکومت سے محروم تھی۔ خان بہادر اللہ بخش کو گرانا مقصود تھا۔ اس لیے ارکانِ لیگ نے موقعہ غنیمت جانا۔ ایجی ٹیشن کو ہوا دی۔ سول نافرمانی کے لیے غریب عوام کو بھڑکایا۔ ہر چند سکھر کے احرار جانتے تھے کہ لیگی سرمایہ داروں کی مطلب برآری کا کھیل ہے۔ مسجد تو آئینی جدّوجُہد سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ تاہم لیگ کی قانون شکن تحریک میں شامل ہو گئے تاکہ شہید گنج کا سا الزام نہ آ جائے۔ اور وہ زور دکھایا کہ چند روز میں سینکڑوں احرار گرفتار ہو گئے۔ لیگی امراء تو گھروں میں گھس گئے۔ فرقہ وار فساد سے سرزمین سکھرؔ لالہ زار ہوئی۔ فسادات کے لیے بھی احرار ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔ سکھر مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری عزیز الرحمٰن خاں اور ان کے ساتھیوں کو حبسِ دوام کی سزا ہوئی۔ اب اپیلوں کا مرحلہ درپیش ہے۔ ابھی تو کشتی منجدھار میں ہے خدا کرے کنارے لگے۔ اخلاص دنیا میں یوں رسوا ہوتا ہے۔ فی زمانہ ریاکار کے لیے دن عید اور رات شب برات ہے۔

ریاستِ بہاولپور کا آئینی ایجی ٹیشن

جہاں اپنے بیگانے ہوں وہاں بیگانوں کا کیا شکوہ۔ ۹۰ اسلامی آبادی پر ہندو حکمرانوں کے تشدد کا کیا رونا۔ جاؤ ریاست بہاولپور میں اسلامی راج کا نقشہ دیکھ کر مساواتِ اسلام کے دعوے پر شرمندہ ہو لو۔ کشمیر اور کپورتھلہ میں مسلمانوں کو ہزار درجہ آسائش ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی ریاست میں لوگوں کے حالات نہ معلوم کرنا بہتر ہے۔ پنجاب کی ساری ریاستوں سے یہ ریاست پسماندہ۔ نہ تعلیم نہ اصلاحات۔ انسانی حقوق سے محروم یہ بے زبان خطہ تاریخوں میں خلفائے اسلام کے کامل مساوات کے کارنامے پڑھتا ہے اور اپنے مسلمان حکمرانوں

اور کلمہ گو ملازموں سے نیکی کی امید رکھتا ہے۔ مگر امید کے پورا ہونے کے دن نزدیک نہیں آتے۔ یہ نہ سمجھو کہ یہاں مخلص مسلمان کارکنوں کی کمی ہے۔ نہیں تحریک خلافت میں بھی یہاں کے بہادر لوگوں نے اقدام کیا۔ پھر جماعت "حزبُ اللہ" بنا کر مصروفِ عمل رہے۔ پھر "جمعیتہ المسلمین" بنا کر سیاسی جدوجہد شروع کی۔ پہلے تو عوام کے ان نمائندوں کو سبز باغ دکھائے گئے۔ پھر دوزخ یعنی جیل خانہ میں ڈال کر اُن کے ایمان کا امتحان لیا گیا۔

قصور کیا تھا؟ یہی کہ انہوں نے خدا کا نام لے کر انسانی حقوق کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ جس ریاست میں ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل کمیٹیوں میں عوام کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہاں حکومت میں ذمہ داری کون دے؟ شخصی حکومت عریاں شکل میں دیکھنا ہو۔ تو بہاولپور تمہارے لیے قریب تر نظارہ ہے۔ دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔

جب جمعیتہ المسلمین کے مقتدر اور معزز ارکان کا سلسلہ دارو گیر شروع ہوا تو ساتھ ہی سرکاری گرگوں نے لَاتُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ کی خوشامدانہ تفسیر شروع کر دی۔ غرض ہندوں نے کہنا شروع کیا کہ ایک اسلامی ریاست میں فساد ناقابل برداشت ہے۔ مگر کسی نے نہ پوچھا کہ اسلامی ریاست میں

رعایا کا کیا حال ہے؟ پھر محبوس بن کو والی ریاست کی شخصیت کا واسطہ دیا گیا اور انگریزی سیاست کی پیروی میں تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر کا افسوں پھونکا گیا بہادر مگر شریف کارکن حکمرانوں کی ساحری میں مبتلا ہو کر عین اس وقت جدوجہد چھوڑ بیٹھے جب کہ احرار ورکز ندبیروں پر سوچ بچار کر رہے تھے۔

ارکان جمعیتہ المسلمین بگوش ہوش سے سُن لیں کہ رئیس سے مرعوبیت اور عوام کی لیڈری اجتماع ضدین ہے۔ بے شک تم بہادر ہو مگر جابر کا لحاظ رکھنا ہے تو مظلوم کی خدمت ناممکن ہے۔ شاہ پرستی دل کے کسی گوشے میں نہ ہو تو عوام سے وفاداری ممکن ہے ورنہ صریح غداری ہے۔ علاوہ ازیں حکمرانوں کا وعدہ ایشیائی معشوق کا روائتی وعدہ ہے۔ جس پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ قربانی کرنے کا نظام مضبوط بناؤ۔ خدا پر بھروسہ کر کے سرمایہ دار فرقوں کے خلاف قدم اٹھاؤ۔ ورنہ تمہاری جدوجہد شہنشاہیت اور سرمایہ داری کے کھیت کی کھاد بن جائے گی۔ ہر قدم پر خیال رکھو۔ تمہارا عمل امراء اور رؤسا کی تقویت کا باعث نہ ہو بلکہ عوام کے طبقہ کو مضبوط بنانے والا ہو۔ بدقسمتی سے باوجود مسلمانوں کے غریب ہونے کے قوم، سرمایہ داروں کا آسان شکار ہے اور ابھی تک اُمراء و رؤسا کی خوشامد کے لیے دن کو رات بتا کر سعدی کے شعر کو حقیقت بنا رہے ہیں ؎

اگر شہ روز را گوید شب است ایں — بباید گفت اینک ماہ و پرویں

خدا ایسی تعلیمات سے مسلمانوں کی خلاصی کرائے اور صحیح اسلامی مساوات سے انہیں روشناس کرائے اسلام میں بادشاہ اور امرا کا وجود ہی ثابت نہیں۔ اسلام تو مساوات کا مذہب ہے اس میں حاکم و محکوم کہاں؟ جس مذہب میں خلیفہ کے سیاسی اور اقتصادی حقوق عام مسلمان کے برابر ہوں تعجب ہے کہ اسی مذہب کا پیرو سب سے زیادہ شہنشاہ پسند اور سرمایہ داری کا غلام ہے؟ بہر حال جمعیت المسلمین کا سیاسی پمفلٹ "آوازِ حق" کا مطالعہ فرمائیں۔ عوام کی اقتصادی حالت کی آرزو دل کا مظاہرہ[1]

استدعا

بحضور اعلیٰ حضرت والیٔ تخت و تاج عباسیہ ریاست بہاول پور

"عالی جاہا! حضور والا کی نظرِ بالغ نے یہ دیکھ لیا ہو گا کہ ہندوستان کی سیاست پہلے پہلے بھاپ کے کندھوں پر سفر کرتی تھی۔ اب بجلی کی سی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ حضور جو زمانے کے حال اور رعایا کی نبض سے واقف ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ رعایا کے نظم و نسق میں مناسب حصہ لینے کی خواہش مدتوں سے عوام کے سینے میں کروٹیں لے رہی ہے اور اس خواہش کا اظہار وقتاً فوقتاً عرض داشتوں کی صورت میں ہوتا رہا۔ مگر ہر التجا کا جواب قریب قریب باوقار خاموشی سے دیا گیا۔ ہم نے محض ادب و احترام کے مقتضیات کے پیشِ نظر کسی اجتماعی تحریک میں حصہ نہ لیا۔ قیاس کیا کہ آج نہیں تو کل ہماری قسمتوں میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہو جائے گی اور ریاست کی حدود کے قریب انگریزی علاقہ میں جو انقلاب کی رَو دوڑ رہی ہے۔ حکام ریاست خود بخود اس سے بہترین نتائج اخذ کر کے رعایا کی قدرتی خواہشات کو نظر انداز نہ کریں گے لیکن مدت کے انتظار کے بعد بھی ہمارے خوشگوار خوابوں کی کوئی خوش کن تعبیر نہ نکل سکی۔

عالی جاہا! فطرت ہر چند دنیا کے واقعات کی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کے کہہ رہی تھی کہ قربانی کے

[1] یہاں سے آگے چند سطور کی عبارت طبع اول کے وقت سے اُڑ چکی ہے۔ ابو معاویہ۔ ابو ذر ۱۱

بغیر حقوق کا ملنا مشکل ہے لیکن ہم نے حضور والا سے طبعی عقیدت اور دل بستگی پر زندہ رہنے کی کوشش کی اور حضور کے حکام نے غلطی سے یہ سمجھا کہ ہم تن آسان اور قربانی سے پہلو تہی کرنے والی قوم ہیں کوئی روٹھے تو اُسے کون منائے جس رعایا نے روٹھنا نہ سیکھا ہو اُسے منانے کی کوئی تحصیل حاصل کیوں کرے؟

حضور سے ہمیں اب بھی عقیدت ہے۔ سرکار نے تو پہلے حکومت کے شعبے تقسیم کر کے حکام کے سپرد کیے ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر یہی اختیارات عوام کو مل جاتے تو حضور والا سے زیادہ خوشی کسی کو حاصل نہ ہوتی۔ مصیبت صرف اتنی ہے کہ حکومت جس کے ہاتھ میں ہو وہ دوسروں کو اس میں شریک کرنا پسند نہیں کرتا۔ حضور والا کے ملازم بھی ان انسانی کمزوریوں سے بالا نہیں۔ جو اختیارات حضور والا نے از راہ رعایا پروری ان کو دیے ہوئے ہیں۔ وہ ان کو بخوشی خود ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ بلکہ لاعلمی اور عملی مشکلات کا اظہار کر کے انتقال حقوق کے خلاف نئی نئی دلیلیں پیش کریں گے۔ حضور مسلمان والیٔ ملک ہیں۔ خوب جانتے ہیں کہ خدا کی مخلوق حکام کی کھیتی نہیں۔ حکام کا عمل امت کے مشورے اور منشا کے خلاف ہو تو یہ اسلام کے منافی ہے۔ یہی ذمہ دار حکومت کی بنیاد ہے۔ ہماری مذہبی روایات اور رفتارِ زمانہ اس امر کے داعی ہیں کہ آئندہ اسمبلی کا قیام ریاست میں فوراً عمل میں لایا جائے۔ سرکار والا کے ملازم اس مطالبے کے خلاف یہ کہیں گے کہ ریاست پس ماندہ ہے۔ فرسودہ طریق حکومت میں تبدیلی کی سب سے قوی دلیل بھی ریاست کی پس ماندہ حالت ہے۔ چند افسران پر لاکھوں بندگان خدا کی فلاح قربان نہیں کی جا سکتی۔ صوبہ سرحد اصلاحات سے پہلے کیسا پس ماندہ علاقہ تصور ہوتا تھا؟ لیکن عوام کی بے پناہ خواہش کے سامنے حکومت برطانیہ کو بھی جھکنا پڑا۔ اس پس ماندہ صوبہ سرحد میں ذمہ دار حکومت کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ لیکن ہم خارجی انثانات کی بحث میں کیوں پڑیں؟ ہم اس امر کا صاف اظہار کرتے ہیں کہ ہماری امیدیں حضور والا سے وابستہ ہیں۔ ایسے ذمہ دار طرز حکومت کے لیے جس کی بنیاد رائے دہندگی بالغاں پر رکھی جائے۔ بے پناہ خواہش عوام کے دلوں میں موجود ہے۔ جہاں حضور کی ذات ستودہ صفات کا ادب ہمارے ذمہ ہے۔ اسی طرح رعایا کی خواہشات کا احترام ہماری تمنا ہے۔ ہم اس یقین کے ساتھ کہ ہماری تمنا کو ٹھکرایا نہ جائے گا بصد ادب گذارش کرتے ہیں کہ

اس ریاست میں ایسی ذمہ دارانہ حکومت کی فوری تشکیل کا اعلان فرمایا جائے جس میں ہر بالغ کو رائے دینے کا حق ہو۔ وزراء عوام کے نمائندوں میں سے چنے جائیں۔ اور یہ وزراء بھی انہی نمائندوں کے سامنے جوابدہ ہوں۔

۲۔ تمام بجٹ آزاد اسمبلی کے سامنے پیش ہو اور عوام کے منتخب شدہ ممبروں کو اس کے منظور کرنے، کم کرنے اور مسترد کرنے کے پورے اختیارات ہوں۔

۳۔ نیز اس اسمبلی کو بہتر نظم و نسق کے لیے پہلے قوانین اور قاعدے بدلنے اور نئے قواعد و قانون بنانے کے مکمل اختیارات ہوں

۴۔ ہر سرکاری محکمہ ذمہ دار وزراء کے ماتحت ہو۔

ہماری ریاست کی حالت صوبہ سرحد کی قبل از اصلاحات کی حالت سے پورے طور پر ملتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہم نے حقوق کے لیے قربانی کی بجائے حضور کی ذات والا صفات پر اعتماد کیا اور بدستور اعتماد رکھتے ہیں۔ حالاں کہ ہم اپنے گذشتہ معروضات کے بے نتیجہ ہونے کے باعث قدرتی طور سے اندوہگین ہیں تاہم ہم نے ایجی ٹیشن اور قانون شکنی کی راہ اس لیے اختیار نہیں کی۔ کہ مبادا راعی اور رعایا کے درمیان شکر رنجی پیدا ہو جائے۔ اب ہم امید رکھتے ہیں کہ حضور والا آزاد اسمبلی کے قیام کا اعلان فرماتے ہوئے ملازمان سرکاری کو ہدایت فرما دیں گے کہ وہ ایسے حالات نہ پیدا ہونے دیں جن سے لوگ مایوس ہو کر وہ راہ اختیار کریں۔ جو صوبہ سرحد کے ستائے ہوئے لوگوں نے کی تھی۔

ہم پورے ادب و احترام سے حضور کی خدمت میں عرض گذار ہیں کہ رعایا کی مشکلات حد سے گذر چکی ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ غریب لوگ کس طرح مصیبت سے بسر اوقات کرتے ہیں موجودہ وزراء کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمان وفد کو حضور کے پیش ہونے بھی نہیں دیتے۔ اس سے زیادہ ہماری بے کسی اور مصیبت کی داستان اور کیا ہو سکتی ہے۔ جب تک وزراء عوام کے سامنے جوابدہ نہ بنائے جائیں۔ جن کو غریب سے غریب اپنے ووٹ کے استعمال سے بنا سکے یا برطرف کر سکے۔ تب تک کون افسر غریبوں کی پکار کو سُن سکتا ہے؟

ہر چند جی چاہتا ہے کہ لوگوں کی مالی تباہی اور سیاسی تنزّل کی داستان غم کے دفتر حضور کے سامنے کھول کر رکھے جائیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ حضور اپنی رعایا کی تباہ حالی کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ صدیوں کے انسانی تجربوں نے ان مشکلات کا جو حل یعنی ذمہ دارانہ حکومت تجویز کیا ہے۔ وہ بھی حضور سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اس لیے ہم آخری بار حضور والا سے درخواست کرتے ہیں کہ فوراً ذمہ وار اسمبلی کا قیام عمل میں لایا جاوے تاکہ ریاست کا نظم و نسق بہتر ہو کر رعایا کی خوش حالی کا باعث ہو اور رعایا حضور والا کے اقبال و درازیٔ عمر کی دعا کرے۔

عرضِ حال

کب تک ضبط کروں میں آہ
چل مرے خامے بسم اللہ

یہ بات ایک نہایت حیران کن ہے کہ گورنمنٹ بہاول پور کو جب کبھی اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے تو وہ اُسے تمام و کمال ذاتِ شاہانہ کی طرف منسوب کر دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رعایا بہاول پور اگرچہ اُن تمام معاملات کے نتائج بد کے شکار بننے سے پہلے ہی آگاہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اُس کے مداوا کے لیے صرف ذاتِ شاہانہ کے وقار کے پیش نظر کوئی قدم اٹھانے سے مجبور رہتی ہے۔ اور یہی وہ مقصد ہے جسے گورنمنٹ بہاول پور اپنی اور ریاست کی ذمہ داری حضور آقائے دولت و ولی نعمت دائم اقبالہ و دام اجلالہ کے کندھے پر رکھ کر حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اور پھر پبلک کی طرف سے جب کبھی گورنمنٹ کے غلط اقدامات پر ایماندارانہ احتساب ہوتا ہے۔ تو وہ ذاتِ شاہانہ کے وقار کی آڑ میں ایسے تمام آدمیوں کو جنہیں حکومت کی غلط روی کے متعلق ذرا بھی کچھ کہا ہو مبتلائے مصیبت و آلام کر دیتے ہیں اپنے آپ کو قانوناً حق بجانب خیال کرتی ہے۔ اگر آج بھی موجودہ گورنمنٹ کی ابتدا سے اس وقت تک کا جائزہ لیا جائے تو گورنمنٹ کی غلطیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ جس کے اثراتِ بد کا لاکھوں بندگان خدا مختلف اوقات میں شکار ہوتے رہے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اُن مباحث میں پڑ کر فضا کو تلخ سے تلخ تر بنا دیں مگر اس کا کیا علاج ہے کہ حکومت بہاول پور پبلک کے اغراض سے پورے طور پر بے پروا اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنی خود غرضیوں کو پورا کرنے پر تل گئی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ پبلک میں حکومت کے خلاف ایک جذبہ پیدا ہو جاوے گا۔ اور گورنمنٹ کو پھر ایک دفعہ حضور والا جاہ کے وقار کی آڑ میں پولیس اور فوج کی جمعیت کو حرکت میں لا کر اپنا حکم منوانے کا ایک موقعہ ہاتھ آ جائے گا۔ ہم خدائے قدوس سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ ارکان حکومت کو تدبر اور فہم صحیح عطا فرمائے تاکہ وہ بجا طور پر اپنی اس دنیا کی ذمہ داریوں اور

آئندہ دنیا کی جواب دہی کا احساس کر سکیں۔ آمین ثم آمین

آپ کو یاد ہو گا کہ جمعیت المسلمین نے دسمبر ۱۹۳۶ء کے آخر میں "پبلک کیا چاہتی ہے؟" کے عنوان سے معروضات سال ۱۹۳۷ء کی یاد دہانی کے طور پر ایک مختصر پمفلٹ شائع کیا تھا جس کے بعد عالی مرتبت پرائم منسٹر صاحب بہادر سے مختلف اوقات میں تبادلۂ خیالات ہوا۔ اور اس معاملے کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد جمعیت المسلمین نے ۶ مارچ ۱۹۳۸ء کی ایک تحریک کے ذریعے استدعا کی تھی کہ وزارت عظمیٰ ان معروضات کے متعلق یکم اپریل ۱۹۳۹ء تک کوئی آخری اعلان شائع کر دے تا کہ اس اعلان کی روشنی میں جمعیت المسلمین اپنے معروضات کے متعلق کوئی آئینی جدوجہد کر سکے۔

مقام شکر ہے کہ وزارت عظمیٰ کی طرف سے وہ اعلان پریس کمیونک کی شکل میں مورخہ یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو شائع ہوا۔ اگرچہ گورنمنٹ نے اس امر کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ اس پر موافق و مخالف خیالات کے اظہار کو آئین و ضابطہ کی روشنی میں صحیح خیال کیا جائے گا لیکن کمیونک کے لب و لہجہ سے صاف عیاں ہو رہا ہے کہ اعداد و شمار اور حقائق و بصائر کی تائید کے ساتھ بھی مخالف خیال کے اظہار کرنے والے کا گناہ ناقابل معافی ہو گا اور جس کی سزا قلعۂ دراوڑ کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کے سوائے حکومت کے پاس اور کچھ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ حکومت اپنی فتح و شکست کے جذبہ سے سرشار ہو کر کرے گی۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ ارکان حکومت کے قلوب ابھی تک اس قدر مسخ نہیں ہوئے کہ وہ اپنی وضع کردہ پالیسی کو حق بجانب یقیناً خیال کرتے ہیں لیکن وہ اس کو دفتری طور پر تسلیم کرنے کے لیے اس لیے تیار نہیں کہ ان کی سنہری اور روپہلی مصلحتوں کے ساتھ ساتھ ان کے ذاتی منافع ان کے ہاتھ سے نکل جانے کا قوی امکان ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت وزارت عظمیٰ کی طرف سے جو کمیونک شائع ہوا ہے۔ کیا اس میں پبلک کے اطمینان کا کچھ بھی مواد موجود ہے؟ اس کا اندازہ ان مختلف خیالات سے ہو سکتا ہے جو اس وقت پبلک کے مختلف حلقوں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ آج ریاست کے ہر فرد کی زبان پر اس کمیونک کا تذکرہ ہے بعض شخص نہایت بلند آہنگی کے ساتھ اگر اسے لغویات کا پلندہ قرار دے رہے ہیں۔ تو کوئی اسے جھوٹ اور اباطیل کی پوٹ کہتا ہے کوئی اسے "ویری بوگس تھنگ" (VERY BOGUS THING) کا لقب دے رہا ہے تو کوئی اسے "موسٹ روٹن تھنگ" (MOST ROTTEN THING) کے الفاظ سے یاد کر رہا ہے۔ کوئی

اسے دھوکہ اور فریب سے مثال دے رہا ہے۔ تو کوئی اسے طفل تسلی سے تعبیر کر رہا ہے۔ غرضیکہ ادنیٰ شعور کا انسان بھی جو حکومت کی خوشامد اور ذاتی نفع اور ضرر سے بے نیاز ہے۔ اس کمیونک کو نہایت مایوس کن اور مضحکہ خیزی کا سامان تصور کرتا ہے اور آج بات بات پر حضور سرکار عالی دام اقبالہ و ملکہ کو ہماری غداری اور غیر وفاداری کا یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور ذات ہمایونی کے دماغ کو پبلک کی طرف سے بدظن کیا جاتا ہے۔ حاشا و کلا خدا گواہ ہے یہ ایک نہایت ہلاک کن فریب ہے۔ آج اس اتہام سے ہمارے آباؤ اجداد کی روحیں کانپ رہی ہیں۔ کیا ان لوگوں کی اولاد سے ممکن ہے جن کے خون کی گواہی باغ و راغ کے لالہ زار ریگستان بہاولپور کا ایک ایک ذرہ دے رہا ہے؟ کیا ان لوگوں سے غداری اور بے ایمانی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جن لوگوں نے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر ریاست کے اجاڑ اور سنسان بنجروں کو اپنے خون سے سینچا؟ اور پھر اس اتہام کے بالمقابل اپنی وفاداری و جاں نثاری کا ڈھول پیٹنا کم از کم ان لوگوں کو قطعاً زیب نہیں دیتا۔ جو یہاں ملازمت کے سلسلہ میں دولت کما کر مستقل طور پر یہاں سے لوٹ جانے والے ہیں۔ آج اس اتہام کو سننے والے بھی ایسے لوگوں کی نادانی پر ہنستے ہیں جو اس اتہام کو اپنی طاقت فوج اور پولیس کے مظاہروں۔ بندوقوں اور مشین گنوں کی نمائش سے لوگوں کے دماغوں میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں پر زندگی کے لیے زمین تنگ کر رہے ہیں جو ملک کے حقیقی خیرخواہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ کے لیے اس سرزمین کی آغوش کو اپنی موت کے بعد کی زندگی کے لیے چن لیا ہے۔ آج ہم علی الاعلان اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ بہاولپور کے لوگ عقل و شعور میں ہندوستان کے کسی صوبے کے باشندوں سے کم نہیں ہیں۔ صوبہ سندھ اور پنجاب کے اضلاع مظفرگڑھ اور ڈیرہ غازی خاں کی حیثیت سے ان کی حیثیت بدرجہا بہتر ہے۔ وہ اپنے مفاد اور نقصان کو سمجھ کر اس کا علاج بھی سوچ سکتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں کوئی طریق کار بھی تجویز کر کے اسے کامیاب بھی بنا سکتے ہیں۔ مگر وہ اس امر سے بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ آج کل نظام حکومت کس طرح چلایا جا رہا ہے اور اس میں کیا کیا نقائص ہیں؟ اس وقت بہاولپور کی پبلک عملی طور پر موجودہ ارکان وزارت کے متعلق رائے رکھتی ہے۔ صرف اب اگر ضرورت ہے تو اس امر کی کہ ان کو پرسکون احتجاج کی طرف دعوت دی جائے جس سے اس وقت تک حضور سرکار عالی دام اقبالہ و ملکہ کے وقار کے پیش نظر جسے حکومت کے ارکان بار بار اپنے بچاؤ میں استعمال کرتے رہے ہیں احتراز کیا جاتا رہا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ حقیقت کو عملی طور پر واضح کر دیا جائے کہ رئیس کا غدار

اور ملک کا دشمن کون ہے؟ حکومت یا پبلک۔ ہم حکومت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اب پبلک زیادہ دیر تک دھوکے میں نہیں رکھی جا سکے گی۔ اُسے ملازمتوں کے گورکھ دھندوں میں زیادہ عرصہ تک اُلجھایا نہیں جا سکے گا۔ اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ اُن مٹھی بھر ملازموں کی قسمت اور مستقبل لاکھوں انسانوں کی بدنصیبی کا علاج نہیں ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت بھوکے ننگے انسانوں کا مستقبل ہے۔ جو چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتے جاڑے کی تکلیفوں کو برداشت کر کے حکومت کے خزانے کو پُر کرتے ہیں۔ مگر اُن کے اپنے لیے نہ تن ڈھک کپڑا اور نہ پیٹ بھر روٹی ہے۔ آج اُس کے افلاس کی یہ حالت ہے کہ اس کی بہو بیٹیوں کا ستر چیتھڑوں سے بھی ڈھکنا مشکل ہے۔ یہ ریاست کے ٹھوس واقعات ہیں کہ مفلس و کنگال کسان نے چھوٹی چھوٹی بیٹیوں کا معاوضہ حاصل کر کے نکاح کر دیا۔ اور اس معاوضے سے آبیانہ مالیہ ادا کر کے حکومت کی دار و گیر سے نجات حاصل کی۔ بستیوں میں پھرو۔ کسان کی کٹھن زندگی کا مطالعہ کرو۔ موٹروں میں بیٹھ کر ڈاک بنگلوں میں ڈیرہ جما کر حکومت کرنے والے اس کی مصیبتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے اُن لوگوں کا مستقبل نہیں ہے۔ جو فلک پیما محلوں کی خاطر غریبوں کے جھونپڑوں کو آگ لگا دینے کے عادی ہیں۔ ہمارے سامنے اس ہلاکت زدہ مزدور کا مستقبل ہے۔ جو دن بھر میں ۲ آنے کے پیسے کماتا ہے۔ جنہیں وہ رات کو مشکل سے چھوٹے چھوٹے بچوں میں پورا کرتا ہے۔

آج حکومت ہمیں اپنے فرضی احسانات جتا کر تسلی دینا چاہتی ہے۔ اُسے اعداد و شمار اور ٹھوس واقعات سے واضح کرنا چاہیے۔ کہ اس نے بہاول پور کی پسماندہ آبادی کے لیے کیا کیا مساعی کی ہیں؟ اور یورپ کی صنعتیں ان کو تباہی کی طرف دھکیلے جا رہی ہیں۔ اس وقت سینکڑوں گھرانے بیکاری کا شکار ہو رہے ہیں۔ حکومت نے اُن کے تحفظ کے لیے کیا کیا ہے۔ دھات اور کپڑا بننے کی صنعتیں ختم ہو گئیں۔ چمڑا رنگنے والے برباد ہونے والے ہیں۔ لکڑی کا کام بھی کرنا رپو سے ہونے لگا ہے۔ حکومت کے تمام ادارے اپنی ضروریات کے لیے بیرونی تاجروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

آخر کس احسان پر حکومت اس قدر اِترا رہی ہے؟ کیا یہ امر حکومت کے لیے موجبِ ندامت نہیں کہ ایک سوا کروڑ کی آمدنی رکھنے والی ریاست کا تعلیمی بجٹ ڈیڑھ لاکھ پر مشتمل ہو اور جس کی تعلیمی کیفیت یہ ہو کہ ضلع ملتان کی ایک تحصیل کے طالب علموں سے بھی اس کی مجموعی تعداد طلبہ کم ہو؟ ستلج ویلی پراجیکٹ کو بہاول پور کے کسانوں پر احسان جتایا جا رہا ہے۔ حالانکہ سکیم نے جو نقصان ریاست کو پہنچایا ہے۔ اُس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اور پھر "قرضہ کی ادائیگی میں

معاہدے میں پبلک اغراض کو جو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اس کے اثر سے ریاست پچاس سال تک غلامی کے دن بسر کرنے پر مجبور رہے گی۔ اس کا احساس حکومت کے ارکان کو ہو یا نہ ہو مگر ایک موٹی عقل کا انسان جب اس کا تصور کرتا ہے تو یقیناً کانپ اٹھتا ہے۔ کہ ہندوستان اور دنیا کے دیگر ممالک آج سے پچاس سال بعد تہذیب و تمدن کے کس سٹیج پر ہوں گے جب کہ ریاست اُسی سٹیج پر ہو گی جس پر کہ وہ آج ہے۔

کیا آج رفاہی امور پر جو رقم جس آبادی پر خرچ کی جا رہی ہے۔ وہ بجائے خود غیر مکتفی ہے تو چند سال بعد وہ کیوں کر پوری ہو گی؟ جب آبادی میں ہر دس سال بعد دس فیصدی اضافہ کی رفتار ہے۔ یہ خطرناک اقدام صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ برطانیہ کو ممنونِ احسان بنا کر ہمیشہ کے لیے مفاد حاصل کرتے رہیں۔

ہم ارکانِ حکومت کو پھر متوجہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں بحیثیت مسلمان کے اس دنیا میں بھی ان کو اپنی ذمہ داریوں کو پوری دیانت کے ساتھ پورا کرنا ہے۔ اور آئندہ بھی چل کر میدانِ حشر میں اُن تمام ذمہ داریوں کا اُن کو جوابدہ ہونا پڑے گا۔ یاد رکھیے آج جن نتائج سے آپ بے فکر ہو کر اقدام کر رہے ہیں۔ کل اُس کے خطرناک نتائج سے آپ کو دوچار ہونا ہے اور آج بھی سینکڑوں معصوم و بے گناہ روحیں انتقام کے لیے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ قیامت کے دن آپ کی گردن ہو گی اور اُن کے ہاتھ۔

آخیر میں ہم پبلک سے ان امور پر زیادہ سے زیادہ غور کرنے کی استدعا کرتے ہیں۔ کہ پورے خلوصِ نیت اور سکونِ قلب کے ساتھ ان پر غور و فکر کریں۔ ہم غریبوں کی نجات اسی میں ہے کہ پورے اتحاد کے ساتھ پُرامن طریق پر حکومت بہاول پور کے ہر کام کا مطالعہ کریں۔ اور پوری کڑی امداد کے ساتھ متفقہ طور پر دکھوں کو حضور سرکار والا جاہ دام اقبالہٗ و ملکہٗ کے کانوں تک پہنچا دیں اور پھر اس صورت میں ممکن ہے کہ ذمہ دار **نظامِ حکومت** عطا ہو۔"

مجلس احرار کو بدنصیب بہاول پور کی ہلاکت زدہ رعایا کا گہرا احساس ہے۔ لیکن مدد کی کوئی صورت سامنے نہیں۔ جب تک اندرونِ ریاست کے بہادر کارکن رئیس پرستی کے جذبات کو قطعی خیرباد کہہ کر محض عوام کی مصیبتوں اور تکلیفوں کو کم کرنے کا جذبہ لے کر نہ اٹھیں گے اور عوام میں بھی کامل مساوات کا ذہن اور آرزو پیدا نہ کریں گے۔ تب تک ریاست میں اونچا سانس لینا یوں ہی مشکل ہو گا۔ اسلامی ریاستوں میں رئیس پرستی کا ذہن ہی ساری مصیبتوں کا ذمہ دار ہے۔ چھوٹی چھوٹی سرحد کی ریاستوں کا بھی یہی حال ہے۔ مسلمان فاقے کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں

ہیں لیکن رؤسا کے مال و جان کو دعائیں دے رہے ہیں۔ ایسی جاہ داروں جاگیرداروں کی ترقی درجات کی دعائیں کرنے والی قوم کا دنیا میں کیسے بھلا ہو۔ مجلس احرار کیا مدد کرے؟ حالانکہ احرار کا اس ریاست کی تحریک آزادی سے گہرا تعلق ہے۔

آئندہ پروگرام

کیا ہم آج کے مسلمان اُن مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کے جوشِ عمل نے خاک اور خون کی بازی کھیلی اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج ان کے پاؤں کی ٹھوکروں میں نظر آئے؟ نہیں۔ جوشِ عمل کو سستی اور کاہلی ہی نہیں بدلا بلکہ ہر کام پر ہم نے خدا کو مُتعیّن کر رکھا ہے۔ حالانکہ خدا ہم سے کام کرنے کی توقع کرتا ہے۔ جب قوم کی ذہنیت میں تبدیلی آجائے تو قوم کے نوجوان چانڈو خانوں میں بیٹھے کیوں نظر نہ آئیں؟ "دم پہ دم خدا نہ نہ غم" کی صدائیں کیوں سنائی نہ دیں۔ جو قومیں مقابلہ کرتی ہیں موت اُن سے دور بھاگتی ہے۔ مسلمان جبلہ ہمت کے بغیر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ موت ایسے آسان شکار کو کیوں نہ کھائے؟ محنت اور قربانی جو دُنیا و دین کی ترقی کا راز ہے مسلمانوں میں مفقود ہے۔ یہ اس لیے کہ علماء صوفیاء کا کوئی اچھا نمونہ سامنے نہیں۔ جو چند محنت پسند اور ایثار پیشہ ہیں وہ قوم کے چھوٹے سے حصہ کی تربیت کے لیے بھی ناکافی ہیں۔ اس طرح قوم کا بیشتر حصہ اداسیوں کا ڈیرہ ہو گیا ہے جنہیں دنیا کی ترقی اور آخرت کی بہبودی کے لیے کسی کام کی ضرورت نہ ہو۔

ہندوستان کی تاریخ کی نصف صدی گذر رہی ہے۔ مجلس احرار سے زیادہ فعّال جماعت مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوئی۔ برخلاف مسلمانوں کی عام ذہنیت کے ہم احرار خود اپاہجوں کی طرح بیٹھ کر اپنے کام یوں خدا کے حوالے نہیں کرتے کہ ہم اللہ کو اپنا غلام سمجھیں بلکہ خدا کی مرضی کے غلام ہو کر کمر ہمت باندھتے ہیں۔ ہر سوال پہلے بات کو سوچتے ہیں آغاز سے زیادہ انجام پر نظر رکھتے ہیں۔ جب شہید گنج کا واقعہ درپیش تھا ہمارے مخالف ہمیں قربانی سے کترانے والا کہتے تھے حالانکہ جانتے تھے کہ احرار سے زیادہ بہادر جماعت اور نہیں لیکن ہم جانتے تھے کہ ہمارے مخالف مغرور اور بددیانت ہیں۔ جس تحریک کا انجام بخیر ہونے کی ہمیں امید نہ ہو اس کے لیے قوم کے بچوں کو کٹوانا اپنے اوپر دوزخ کا دروازہ کھولنا ہے۔ اس لیے ہم نے آپ کی تحسین و آفرین

کو قبول نہ کیا بلکہ انجام پر دھیان جمائے رکھا۔ قوم نے دیکھ لیا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی اسلامی حکومت بھی قائم ہو گئی مگر مسجد واگذار کرنے کے لیے انگلی تک نہ اٹھائی۔ اب سمجھدار طبقہ اس تحریک کے اٹھانے والوں کے افسوسناک طرزِ عمل سے نالاں ہے اور برملا کہتا ہے کہ جب کسی مسئلہ کو اسلامی حکومت طے نہیں کر سکتی تو احرار کی قربانیاں کیا کر سکتی ہیں؟

ہاں اسلامی تاریخ کے اس خوفناک حادثہ یعنی "مُعاہدہ وکرسنرز" کے پیش نظر احرار کی قربانیوں کا وقت آگیا احتیاط نے جوشِ عمل کو پاش پاش کیا۔ احتیاج نے قربانی کے پاؤں پکڑ کر قدم آگے بڑھانے سے باز رکھنے کی سعی کی۔ عشق آتشِ نمرود میں کود گیا۔ عقل، حیرت کی انگلی دانت تلے دبا کر کھڑی رہ گئی۔ ہاں یہ واقعہ ہے کہ احرار نے اُس وقت جنگ کے متعلق آواز بلند کی جب کانگریس کو آواز اونچی اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ احرار کے کانگریسی دوستوں کو اپنی خاموشی کی اور وجہ جواز سمجھ نہ آئی تو بطورِ طعنہ کہا کہ احرار جلد باز ہیں۔ مگر ڈیڑھ برس کے لیت و لعل کے بعد بارے کانگرس کو بھی اسی قدم کے اٹھانے کا حوصلہ ہوا اب ہم یہ کہنے کے قابل ہیں۔ ہمیں طعنہ دینے والے دوستو! اب تمہاری قربانیوں کا کیا فائدہ ہے؟ بندے اور چندے کی مدد جو حکومت کو حاصل کرنا تھی وہ کر لی گھوڑا چوری ہو جانے کے بعد اب اِصطبل میں تالا لگانے سے کیا حاصل؟

اگرچہ جنگ کے متعلق احرار کی پالیسی ہماری تاریخ کا اہم موضوع ہے مگر قانون کی شمشیر گردن پر آویزاں ہے۔ سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔ مناسب نہیں کہ اس وقت اس پر قلم اٹھایا جائے۔ ہاں ایک داستانِ درد کہنے کی ہے۔ ہم میں سے جو جنگ کے خلاف سرگرمیوں کا اظہار کرتا ہے ضرور قابلِ سزا ہے لیکن یہ پالیسی کیا ہے کہ احرار کی سزائیں کانگریس کی نسبت سخت ہیں اور جیل میں ان سے بدترین قسم کا سلوک کیا جاتا ہے؟ مگر ع

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی؟

زمانہ نازک ہے۔ اس ضمن میں احرار کی قربانیوں اور جیل کی جانکاہیوں کی تفصیل کو بیان کرنا دیکھیے کس کے حصے میں آتا ہے مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مسلسل قربانی سے ہی قوم کی قسمت بنتی ہے۔ ہمیں ہمیشہ ایثار اور قربانی سے نئی دنیا آباد کرنی چاہیے۔ آنے والی غریبوں کی نسل کو اس امر سے حوصلہ حاصل کرنا چاہیے کہ احرار باوجود افلاس کی فراوانی اور اسباب کی کمی کے سربلندیٔ اسلام کی ۲۲ برس سے جدّ و جُہد جاری

کیے ہوئے ہیں۔ یہ سربلندی کی جدوجہد دراصل عوام کی سربلندی کی جدوجہد ہے۔ ہمارے سامنے اسلام کی سربلندی کی وہ صورت نہیں جو اُمویوں[1] کی نام نہاد خلافتوں میں تھی۔ بلکہ مساوات کی وہ صورت جو سرورِ دو عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں تھی۔ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور فاروقِ اعظمؓ کے عہد میں رہی۔ جب مسلمان پوری محنت سے کماتے تھے۔ لیکن ایک کنبہ سمجھ کر بانٹ کر کھاتے تھے۔ کسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ کھانے اور پہننے میں شانِ امتیاز دکھائے۔ یہاں تک کہ کسی کو پختہ مکان تک بنوانے اور حکّام کو دروازہ پر دربان بٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ مسلمانوں پر کیا مبارک دور گزرا ہوگا۔ اگر یہی مبارک عہد مسلمانوں میں لوٹ آئے تو دنیا کا ایک بھی انسان مسلمان ہوئے بغیر رہ نہ جائے۔

مہاتما گاندھی آج کہتے ہیں کہ جو ضرورت سے زیادہ اپنے لیے استعمال کرتا ہے وہ قوم کا چور ہے۔ یہ اسلام کی تعلیمات کی صدائے بازگشت ہے مسلمانوں کو حکم ہوا:

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (اے رسول تم سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کیا جائے؟ کہہ دو کہ معمولی ضرورت پر خرچ کر کے باقی سب راہِ خدا میں دے دو۔)

تاریخِ اسلام کی ناقابلِ تردید گواہی پر غور کرو کہ ہادیٔ برحق نے شاہی میں گدائی کی۔ زورِ بازو سے سلطنت کمائی لیکن زندگی فقر و فاقہ میں بسر کی۔ آج بعض احرار اپنی مفلسی کے ہاتھوں چیختے ہیں۔ یہ بھی ہماری کمزوری ہے۔ ہم میں سے کسی کا حال غریبوں کے سچے کامریڈ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کم ہی دردناک ہوگا۔ تاہم مفلسی کی اس مصیبت میں ایک دن بھی تو عذر نہ کیا کہ مالی پریشانیوں کے باعث میں کام سے مجبور ہوں۔ نیکی کی تبلیغ۔ اخلاق کی تربیت اور سیاست میں تدبیر کے گھوڑے برابر دوڑاتے رہے۔ کثرتِ کار نے گو جان کو کمزور کر دیا مگر ہمت نے کسی وقت ہار نہ مانی۔

احرار کی موجودہ صورت ہمارے لیے زیادہ قابلِ فخر نہیں۔ بہت سے لوگ ہم سے مدت سے وابستہ ہیں لیکن ان کے جوشِ اسلامی نے کوئی معین صورت اختیار نہیں کی۔ ہزار ولولے ہوں لیکن جب کام شروع نہ ہو تو زندگی کی کیا قیمت ہے؟ احرار کے ہمدردوں کی ایک بڑی فوج ہے لیکن ہر ہمدرد ابھی اسلام کا سپاہی نہیں

[1] اس جرم میں علوی، عباسی، فاطمی وغیرہ بھی برابر کے شامل ہیں۔ صرف بنو امیہ کو اور وہ بھی بلا استثناء مطعون کرنا محض سبائی ذہنی پروپیگنڈا ہے۔ یہ شیخ مرحوم کی ذاتی رائے ہے کوئی تاریخی کلیہ یا شرعی ضابطہ نہیں۔ (ابو معاویہ - ابو ذر ۱۲)

بنا۔ ابھی وقت کو بیکار گنوانا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ تحریک شہروں تک محدود رہ گئی ہے۔ ہم نے ابھی تخریبی کام سیکھا ہے۔ تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیری ذہن کی ضرورت ہے۔ تاکہ پرانے نظام کی بوسیدہ عمارت کو ڈھائیں اور ساتھ ہی اپنے اسلامی ذہن کے مطابق کامل مساوات کا محل تعمیر کریں جس میں عوام آسودہ ہوں۔ ہمیں اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر کے نئے عزم سے زندگی کا آغاز کرنا ہوگا۔ قول کی منزل سے نکل کر عمل کے میدان میں آ گئے تو قوم کی بگڑی بنے گی۔ راہبوں اور سنیاسیوں کی طرح نفلی عبادتوں پر فخر نہ کرو۔ نماز روزہ سے جہاں زندگی کے لیے خدا کی توفیق حاصل کرو۔ تعویذ و وظائف پر بھروسہ کر کے عمل سے عاری نہ ہو جاؤ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی مشکلات پر غور کر کے اپنی ہمت سے ان کا حل تلاش کرو۔

موجودہ حال اور آئندہ تدبُّر

علم کے لحاظ سے یہ سیدھا اور صاف عمل ہے کہ ہندوستانی ایک ہو جائیں تو کوئی دوسرا حکومت نہ کرنے پاتے۔ مگر قسمت کا ایسا پیچ پڑا ہے کہ ہندو مسلمان کی گتھی سلجھنے میں نہیں آتی۔ جتنا سلجھاؤ اور سے اور الجھاؤ پڑتے جاتے ہیں۔ دو قوموں کے قرب کو بُعد میں بدلنے والی چیز ہندوؤں کی چھوت چھات ہے۔ اگر کوئی کسی کو ناپاک سمجھے پھر اس سے رفاقت کی امید کرے۔ یہ ببول بو کر کاٹنے کی امید لگانا ہے۔ دنیا کا کون بدنصیب ملک ہے جہاں کوئی اسیرانِ جنگ کے ساتھ وہ سلوک کرے جو ہندو آئے دن مسلمانوں اور اچھوتوں سے برتتے ہیں؟ باوجود ہندوؤں کے اس ناروا سلوک کے زمانہ جانتا ہے کہ احرار نے سیاسیات میں ہندو سے مل کر کام سے انکار نہیں کیا۔ مگر مسلمان عوام ہندو کے آئے دن کے طرزِ عمل سے ایسے برگشتہ ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا حادثہ مسلمانوں کے دل سے ہندوؤں کے سلوک کے ردِّ عمل کو دور نہیں کر سکتا۔ جب سید عطاء اللہ شاہ اور صاحبزادہ فیض الحسن جیسے جادو بیان بھی شیریں گفتار سے سامعین پر سحر کرتے ہیں تو مسلمان، ہندو مسلم اتحاد کی دعوت پر بدک جاتے ہیں اور کہتے ہیں ایسی قوم سے اتحاد جو ہمسایہ کو نجس سمجھے کیسے ہو؟ یہی چھوت چھات ہندوؤں کی تجارتی ترقی کا راز ہے۔ مسلمان ہندو کی دکان کا گاہک تو ہے۔ مگر ہندو مسلمان کے مالِ تجارت کا خریدار شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ کا میلان اور اس کی رَو ایک ہی طرف رہتی ہے۔ مسلمان کا سرمایہ ہندو کے

گھر جاتا ہے۔ ہندو کا مال مسلمان کے ہاں قسمت سے ہی آتا ہے۔ اس طرح وہ مجلسی اور اقتصادی طور پر ہندوؤں کو ظالم ترین قوم سمجھنے پر مجبور ہے جب تک ہندو اپنا طرزِ عمل نہ بدلے مسلمان اس کے متعلق اپنی رائے نہ بدل سکے گا۔ مسلمان کیا ان حالات میں کوئی قوم ہوتی اس کا طرزِ عمل وہی ہوتا جو مسلمانوں کا ہے

اس سلوک کے علاوہ اب ایک اور دقت درپیش ہے۔ ایسی تنگ دل اکثریت کو آئندہ آئین میں کلّی اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ مسلمان سمجھتا ہے کہ آئے دن ہندو چھوت چھات سے ذلّت بھی کرتا ہے اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ بھی کرتا ہے۔ اب مرکز میں اسے اور موقعہ مل گیا تو مسلمانوں کی موت یا زندگی موت سے بدتر بنے گی پس ہندوؤں کے طرزِ عمل سے مایوس ہو کر وہ پاکستان کے رنگین خواب میں خوش ہے۔ کیا احرار اسے اس خوابِ خوش پر ملامت کریں؟ بے شک مسلمانوں کو اچھوت سمجھنے والے لوگوں کی یہی خواہش ہے کہ ہم مسلمانوں کے خلاف محاذ بنائیں۔ ان کے افسوسناک طرزِ عمل پر نکتہ چینی نہ کریں۔ حالانکہ پاکستان کا نعرہ اس سلوک کا ردّ عمل ہے جو ہندو مسلمان سے روا رکھتا ہے جب تک ہندو اپنے سلوک میں اصلاح نہ کرے مسلمان کو ملامت کرنا شاہ مدار کی طرح مرے کو مارنا ہے۔

لیکن ہماری سیاسیات میں کئی اور پیچ بھی ہیں وہ یہ کہ لیگ کے سرمایہ دار لیڈر غیر مخلص اور عوام مخلص ہیں یہ لیڈر عوام کو الّو بنانے کے لیے پاکستان کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں۔ لیکن عوام نے اس کو ایمان سمجھ رکھا ہے۔ لیگی لیڈر کبھی کبھی تو پاکستان کو فریبِ نظر بیان کرنے میں تامل نہیں کرتے اور اندر ہی اندر مشترکہ ہند کی آرزو کے لیے بے تاب ہیں بشرطیکہ مشترکہ ہندوستان میں موجودہ سرمایہ داری کا تحفظ ہو۔ علاوہ ازیں اگر دونوں قوموں کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ مفاہمت پر آمادہ نہ ہوئے تو پاکستان کے نعرہ کا منطقی نتیجہ سول وار ہے۔ مسلمانوں کے سرمایہ دار طبقے نے اس کی مدافعت تو کجا ابھی تک اس کی ہولناکی کا تصور بھی نہیں کیا۔ اس لیے زود یا بدیر مسلمانوں کا یہ طبقہ کانگرس کی طرف دستِ تعاون بڑھائے گا۔ خود خواہ یہ طبقہ پاکستان کا مذاق ہی کیوں نہ اڑاتا ہو تاہم احرار کو مناسب نہیں کہ پاکستان کے خلاف محاذ بنائے۔ ایسا کرنے کا نتیجہ بجز شہید گنج کی تلخ تاریخ کو دہرانے کے اور کچھ نہ ہوگا تعلیم یافتہ اور سرمایہ دار طبقہ بے حد خود غرض ہے وہ مسلمان عوام کو ہمارے خلاف بھڑکائے گا۔ مسلمان ہندو کا بے حد ستایا ہوا ہے۔ وہ ضرور بھڑک جائے گا۔ اس لیے ان فتنہ گروں کو نیچا دکھانے اور ان کی اذیّت سے جماعت کو

بچانے کا یہی ڈھنگ ہے کہ ہم پاکستان کے خلاف محاذ بنانا ترک کر دیں۔ اور عوام کی توجّہ ان سرمایہ دار لیگی لیڈروں کی طرف پھیر دیں جو اپنے دعووں میں قطعی غیر مخلص ہیں کبھی پاکستانی بنتے ہیں کبھی پاکستان کو ہوا سمجھتے ہیں اور الٹا عوام کو ڈانٹ بتاتے ہیں۔ اور اپنی جماعت کے نصب العین اور پارٹی کے ذہن کے مطابق ریزولیوشن مرتب کریں۔ ہر لحظہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کی آواز سرمایہ داروں کی جنگ ہے۔ مسلمان سرمایہ دار پاکستان میں اپنے لیے جنّت بنانا چاہتا ہے اور سرمایہ دار ہندو اکھنڈ ہندوستان میں اپنے لیے سورگ تعمیر کرنے کی فکر میں ہے۔ یاد رکھنا یہ تعمیرات غریب لوگوں کی ہڈیوں اور خون کے مسالے سے طیار ہوں گی۔ احرار غریب عوام کی جماعت ہے۔ ہم اپنے جسم و جان سے انسانیت کی عمارت استوار کرنے میں معاونت کر سکتے ہیں۔ لیکن سرمایہ داروں کی جنّت سورگ تیار کر کے اپنے ہاتھوں اپنے لیے دوزخ نہیں بنا سکتے۔ پس ان معروضات کے پیشِ نظر ہمیں آئندہ ریزولیوشن مرتب کرنا چاہیئے

"ہرگاہ مجلس احرار کا نصب العین آزادیٔ ہند ہے جس کا حصول ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ممکن نہیں۔

ہرگاہ کہ اس نصب العین کی راہ میں ہندو کی مسلمان سے چھوت سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور یہی چھوت مسلمان کی اقتصادی لوٹ کا ذریعہ ہے

ہرگاہ چھوت نے ہر لحاظ سے ہندو مسلمان کو نہ صرف دو مختلف بلکہ دشمن قومیں بنا رکھا ہے۔

ہرگاہ پاکستان کا نعرہ چھوت کا ہی ردّ عمل ہے اور مسلمان کی علیحدگی پسندی کا ذمہ دار ہندو ہے جو بدقسمتی سے اہلِ وطن کے ساتھ بدتر دشمن کا سلوک کرتا ہے

ہرگاہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کا موجودہ تخیّل خالص سرمایہ دار ذہن کی پیداوار ہے"

اس طبقاتی جنگ تقسیم یا عدم تقسیم کی بحث میں کار فرما اصول یہ ہے کہ اکھنڈ ہندوستان کو ہندو سرمایہ داروں کا سورگ بنایا جائے اور پاکستان کو مسلمان سرمایہ داروں کی جنّت بنایا جائے۔ مجلس احرار پاکستانی اور اکھنڈ ہندوستانی سرمایہ داری کی اس جنگ کو غریب عوام کے لیے رحمت قرار دیتی ہے۔ کیونکہ دونوں کی جنگ میں انہیں منظم ہونے کی مہلت ملتی ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کے خلاف دونوں کے دعووں کو منطقی طور پر درست سمجھتی ہے۔ جب ایک فریق پورے ہندوستان میں محل تعمیر کرے تو دوسرا

پاکستان میں اپنے آرام کے لیے ایوان کی خواہش کیوں نہ کرے؟

بنابریں

مجلس احرار جو غریبوں کی نمائندہ جماعت ہے اعلان کرتی ہے کہ ہم ایسے لیگی پاکستان یا اکھنڈ ہندوستان کی حمایت نہیں کر سکتے جس میں اقتصادی مساوات نہ ہو۔ ہاں اس پاکستان یا ہندوستان کی حمایت کے لیے آمادہ ہیں جس میں اقتصادی بنا پر انسانوں کے درجے نہ ہوں بلکہ انسانیت ہی ایک درجہ ہو۔ نیز یہ مجلس اعلان کرتی ہے کہ چھوت کی برپا کردہ مصیبتوں سے نجات دلانے کے لیے جوابی تعاون پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہیں یعنی صرف ان ہندوؤں سے چھوت برتی جائے جو مسلمانوں کو اچھوت سمجھیں جو ہندو مسلمانوں سے چھوت نہ کریں ان سے اچھوت نہ کی جائے۔

مجلس احرار کے جب مجلسی اور اقتصادی مقاصد حاصل ہو جائیں یعنی جب پاکستان یا ہندوستان میں اقتصادی اور مجلسی نظام میں کامل مساوات کا یقین دلایا جائے تو ایسے یقین دلانے والی جماعت سے رابطہ اتحاد پیدا کیا جائے۔ متحدہ ہندوستان میں اقتصادی مساوات بہرحال قابل ترجیح ہے۔ غیر طبقاتی پاکستان آخری چارہ کار ہے۔

۱۔ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے پر زور دیا جائے اور آئین کی بنیاد تین قوموں کی تھیوری پر رکھی جائے یعنی ہندو، مسلمان اور اچھوتوں کو تین الگ الگ قومیں سمجھا جائے۔

۲۔ مسلمانوں کے مذہبی مقدمات کے لیے قاضیوں کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہر قوم کو ایسا ہی حق ہو۔

۳۔ جب کوئی سوال پیدا ہو جو کسی اقلیت کے مذہب یا کلچر کے متعلق ہو تو وہ کثرت رائے سے فیصلہ کرنے کے بجائے مفاہمت سے کیا جائے یا اسی اقلیت کی اکثریت کی رائے کے مطابق ہو۔

۴۔ ہر حال میں وحدانی طرز حکومت کی مخالفت کی جائے۔ ہاں اگر کافی تجربے کے بعد قوموں میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو تو مرکز کو بتدریج مزید اختیارات دیئے جائیں۔

۵۔ چھوت چھات کرنے والوں کو شہری حقوق سے محروم کیا جائے اور کسی کو اہل وطن کے ساتھ اچھوت کا سلوک کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

۶۔ یہ سوال کہ متحدہ ہندوستان فیڈریشن کی بنا پر ہو یا کنفیڈریشن کی صورت اختیار کرے بسردست ملتوی رکھنا چاہیئے تاکہ جنگ کے بعد کے حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا جائے۔

موجودہ ایکٹ میں مسلمان کی پوزیشن

موجودہ حالات میں غور طلب امر یہ ہے کہ صوبہ جات میں مسلمانوں کی برائے نام اکثریت افتراق کی نذر ہو رہی ہے۔ صوبہ سندھ اسلامی سیاسیات کی ایک ہولناک تصویر ہے۔ وہاں مسلمان ۷۰ فی صدی ہیں مگر ہندو اقلیت راج کرتی ہے۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا اگرچہ بظاہر دو متضاد عناصر ہیں لیکن مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے اور اکثریت کے فوائد سے مسلمانوں کو محروم کرنے کے لیے ایک ناپسندیدہ اتحاد پر کاربند ہیں تاکہ مسلمان دو مستقل ٹکڑوں میں تقسیم کریں۔ کانگریس کا بہترین ہمدرد مسلمان مہاسبھا اور کانگریس کے اس اتحاد کی معقول توجیہ پیش نہیں کر سکتا۔ مہاسبھا اور کانگریس کے اس اتحاد میں کوئی اصول کارفرما نہیں سوائے اس کے کہ مسلمان کو متحد نہ رہنے دیا جائے اور مسلمانوں کی کسی ایک پارٹی کو بھی اطمینان نصیب نہ ہو اور ہر وقت ہندو اقلیت کے رحم و کرم پر ہونے کا احساس ہو۔ سر ہدایت اللہ کو پہلے نیچا دکھایا گیا اس کی وزارت ٹوٹی تو خان بہادر اللہ بخش سے سازباز کی۔ پھر لیگ سے تعاون کر کے اللہ بخش کو تارے دکھائے پھر لیگیوں سے بے وفائی کی۔ پھر اللہ بخش کی دست گیری کی۔ اور کانگریس نے رجعت پسندی کا ثبوت یہ دیا کہ جہاں لیگ نے اپنے وزرا کو ڈیفنس کونسل سے مستعفی کرایا وہاں خلاف اصول سندھ میں اللہ بخش کی ڈیفنس کونسل میں شمولیت کی حمایت کی۔ اس سے مسلمانوں میں عجیب ردعمل پیدا ہوا اب اگر ممکن ہوا تو بنگال میں یہی کھیل کھیلا جائے گا کیا ہم اس بات میں مسلمانوں کی کوئی رہنمائی کر سکتے ہیں؟ اگرچہ ہمارے سرمایہ دار مخالفوں نے ہمیشہ کہا کہ احرار ہندو کے اجیر ہیں مگر آج سرمایہ دار ہی اس طعنہ کے مستحق ہیں؛

ورکنگ کمیٹی

مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی مسائل ملکی کا عجلت سے فیصلہ نہیں کرتی۔ بلکہ تدبیریں دیر کرتی ہے۔ بار بار مجلس مشاورت ہوتی ہے جس مسئلے کی صاف سمجھ نہ آئے اس کے فیصلے مدت تک ملتوی رہتے ہیں۔ جب کسی فیصلے پر پہنچ جائیں۔ تو دل دلیر طبیعت تنبیر ہو جاتی ہے۔ پھر ہم پوری قوت سے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور جان کی بازی لگاتے ہیں۔ ہماری جماعت میں مشرق و مغرب کے عالموں کا اجتماع ہے۔ اسی لیے ہم دین و دنیا کے مفاد کو سامنے رکھ کر فیصلے کرتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہ درست اترتا ہے۔ لیکن ہمارے عمل کے متعلق غلط فہمیاں موجود ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ احرار کا لائحہ عمل غیر واضح ہے۔ یہ بھلے لوگ اتنا نہیں سوچتے کہ ایک اقلیت کا وطن ہند کی آزادی کا تصور یوں بھی بے حد خطرات کو پیش نظر کرتا ہے۔ گر احرار کے دو متضاد دعوے ہیں۔ وطن عزیز کی آزادی اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ۔ جب ہم آزادی کے لیے قربانی دیتے ہیں تو خوف زدہ ہم پر ملامت کرتے ہیں کہ ہم اسلام کے غدار اور ہندو کے اجیر ہیں۔ جب تباہ حال اسلامی اقلیت کے لیے اقدام کرتے ہیں تو نیشنلسٹ ناراض ہوتے ہیں کہ ہم فرقہ پرست اور وطن دشمن ہیں۔ لیکن بحالات موجودہ احرار کی راہ درست ہے مسلمان خالص بین الاسلامی ذہن رکھتا ہے۔ جو اس کے خلاف کہتا ہے وہ ہندو کو دھوکہ دیتا ہے اور مسئلے کو سمجھنے میں الجھنیں پیدا کرتا ہے۔ جب تک وہ مسلمان ہے اسے نیشنلزم کے مروجہ تصور کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ کانگریسی مسلمانوں نے ایسا کیا۔ وہ قوم سے کٹ کر بے توقیر ہو گئے۔ کیوں کہ واقعہ ہے کہ اسلام کی بنیاد نیشنلزم پر قائم نہیں نہ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں مسلمانوں پر ملی جلی حکومت کا کامیاب دور گذرا۔ اکبر کا دور ایک نئے مذہب کی بنیاد پہ تھا۔ اس میں ہندو اکثریت تہذیب کا جزو تھی۔ اس ناکام دور کو واپس نہیں لایا جا سکتا۔ یہ مسئلہ کا حل نہ تھا۔ دین اکبری مسلمان کو قبول نہ ہوگا۔ برائے نام مسلمان کا اقتدار ہندو کو اب قبول نہیں ہو سکتا۔ ایک نیشن کے تصور پر ملی جلی حکومت کا قیام خارج از بحث ہے۔ خصوصاً سرمایہ داری کی بنیادوں پر۔ پس کانگرسی تصور کے مطابق نیشنلزم قائم ہو سکتا ہے تو مسلمانوں کی کمر توڑ کر اور پاکستان قائم ہو سکتا ہے تو ہندو اقلیت کی کمر توڑ کر یہ دو مختلف تصورات تو سرمایہ داری کی بنیادوں پر ہیں

اگر ہندوستان کو آزاد ہونا ہے۔ اور ہندوستانیوں کو امن کی زندگی بسر کرنا ہے۔ تو ہمیں فیصلہ یہ کرنا ہوگا۔ کہ نظام حکومت میں سرمایہ داری کی بنیادیں ختم کر دی جائیں۔ اقلیت اور اکثریت کے سوال کو جہاں تک ممکن ہو سکے پیدا ہونے کے امکانات باقی نہ رکھے جائیں۔ اقتصادی مساوات کی بنیادوں پر آئندہ دستور کے قیام کو عمل میں لا کر ہندو مسلمان اور اچھوت کی تین الگ قوموں کو اپنے مذہب اور تہذیب کی کامل آزادی دی جائے۔

بس میری یہ بات یاد رکھی جائے

۱۔ کہ مسلمان کا ذہن بین الاسلامی اور بین الاقوامی ہے۔ انڈین نیشنلزم اس کل کا جزو بن کر رہ سکتا ہے۔ مگر مسلمان انڈین نیشنلزم کا جزو بن کر نہیں رہ سکتا۔ یہ مسئلہ وضاحت طلب ہے۔

۲۔ اقتصادی مساوات کے بغیر ہندوستان میں امن اور آزادی ممکن نہیں رہا یہ ملک غلام رہے گا۔ اگر آزادی اور امن حاصل کرے گا تو سوشلزم کی بنیاد پر۔ تب ہی چھوت کی لعنت دور ہوگی جب ملک میں سرمایہ دار طبقہ نہ رہے گا۔

ممبران ورکنگ کمیٹی

بعض ممبران کا ذکر آ چکا۔ سید فیض الحسن صاحب صدر پنجاب احرار اور دوسرے دوستوں کا مفصل ذکر نہیں ہو سکا۔ صاحبزادہ صاحب انگریزی خواں فصیح اور شاہ صاحب سے دوسرے درجے پر خطیب ہیں۔ بولتے ہیں تو دریا بہاتے ہیں۔ مرد مجاہد ہیں۔ حق گو ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں تھوڑے عرصے میں بہت دفعہ جیل جانا ہوا اگر ہمت نہیں ہاری محمود علی خان صاحب کم گو گردش کے پکے ہیں۔ ہر چند آرام میں پلے ہیں مگر سخت کوش ہیں۔ تکبر سے خالی اور خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ سردار محمد شفیع کم گو، گر بہادر جرنیل ہیں۔ احرار کے فوجی سردار ہیں جفاکش اور متعدد بار جیل جا چکے ہیں ہمیشہ پتے کی بات کہتے ہیں۔ فضول مباحث میں نہیں الجھتے ہیں۔ عزیز شورش اسم با مسمٰی ہیں۔ شاعر ہیں۔ ادیب ہیں خطیب ہیں۔ جب سے احرار میں آئے ہیں تب سے جیل ہی میں کٹی ہے۔ مولانا غلام غوث سرحدی عالم باعمل متعدد بار مرکز کے صدر رہ چکے ہیں۔ احرار کی قوت کا سر چشمہ ہیں۔ احرار میں شمولیت اور ناموری کی

ملاحظہ خیالی بھی درجہ مجبوری ایک وقتی علاج ہو سکتا ہے ورنہ درحقیقت اس مسئلہ کا حل یہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے تمام مصائب کے خاتمہ کا انحصار صرف اسلامی جمہوری شورائی حکومت کے قیام پر ہے کیوں کہ ملوکیت اور نام نہاد جمہوریت کی طرح بیچارا سوشلزم تو خود بیٹھ گیا اور دشمن اور دنیا میں بھی ناکام ہو رہا ہے۔ ابومعاویہ۔ الجوذری ۱۲

قدرتی شرط یہ ہے جو نیا دوست ہم میں آئے۔ وہ آتے ہی چمگادڑوں کے مہمان کی طرح جیل میں الٹا لٹک جائے۔

چنانچہ مولانا گل شیر صاحب[1] اور مولانا عبدالرحمٰن[2] جب سے احرار میں آئے ہیں تب سے داخل زنداں ہیں میری ملاقات نہیں ہوئی۔ گر ایثار مجسم ہونے کے علاوہ سنا ہے کہ بلند پایہ خطیب ہیں۔ یہ احرار کی اخلاقی فتح اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس غریب جماعت کی حوصلہ افزائی ہے۔ اخبار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں۔ خدا نے ہمارے خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے ان لوگوں کو جماعت سے وابستہ کر دیا ہے جن کا گلا اور آواز پروپیگنڈا کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔ شیخ حسام الدین۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولانا حبیب الرحمٰن۔ مولانا مظہر علی اظہر۔ صاحبزادہ فیض الحسن۔ مولانا عبدالقیوم کانپوری۔ حضرت مولانا غلام غوث۔ مولانا عبدالقیوم پوپلزئی۔ عبدالرحیم عاجز۔ حافظ علی بہادر خاں بمبئی۔ قاضی احسان احمد یہ کون ہیں؟ مجلس احرار کو قدرت کے عطا کردہ لاؤڈ سپیکر ہیں۔ اسی سبب سے دنیا خار کھاتی ہے۔ اسی باعث ہمارے مخالفوں کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ جو نیا ادیب اور خطیب حوصلہ مندی سے اٹھتا ہے۔ اسے احرار میں شامل ہونے کی رہنمائی ہوتی ہے۔ آخری سول نافرمانی پر ہماری قوت میں اور اضافہ ہوا ہے۔ کیا جانے قدرت کو اس جماعت سے کیا کام لینا ہے؟

نئے ممبران ورکنگ کمیٹی

حافظ علی بہادر خاں[3] ایم۔ایل۔اے فہیم اور ایثار پیشہ ہیں۔ متعدد بار جیل جا چکے ہیں۔ روزنامہ ہلال بمبئی کے ایڈیٹر ہیں۔ بغرض تقریر اور تحریر میں پختہ ہیں۔ مولانا عبدالقیوم کانپوری آل انڈیا احرار کے عارضی صدر ہیں۔ بے حد محنتی، ایثار پیشہ جیل کے باسی اور زباں آور ہیں۔ صاحبزادہ محمد سلیمان[4] باہمت نوجوان ہے۔ متعدد بار جیل ہو آیا ہے۔

کوئٹہ میں تباہی اور خدمتِ خلق

خدا نے ہم سے صرف تبلیغی اور سیاسی ہی کام نہیں لیا۔ بلکہ خدمت خلق کا اہم کام بھی ہمارے سپرد ہوا۔ ہندوستان میں کوئٹہ کا زلزلہ تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ جو دردناک تباہی اس زلزلہ نے مچائی۔ اس کی داستان درد کون بیان کرنے بیٹھے؟

۱؎ افسوس کہ جب ... جولائی ۱۹۴۳ء میں شہید کر دیئے گئے ۱۲ ۲؎ بھاٹوی۔ آج کل تبلیغی کام میں مصروف ہیں ۳؎ ۲ شعبان ۱۳۸۹ھ نومبر ۱۹۶۹ء میں انتقال کر گئے ۱۲ ۴؎ علاوالپوری۔ مقیم چک تکبیر نزد سانگلا۔ ابو معاویہ ابوذر ۱۲

قیامت کا حال الہامی کتابوں میں پڑھو اور اس کا تصور کوئٹہ کے زلزلہ سے کرو۔ ہو بہو وہی نقشہ تھا مصیبت کی وہی صورت درپیش تھی۔ جب زلزلے کی خبر ہندوستان کے شہروں میں پہنچی۔ سب سے اول قدم مجلس احرار نے اٹھایا۔ ٹرین پر حالات کا جائزہ لینے کے لیے کوئٹہ روانہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی خوابیدہ قوتیں مجلس احرار کی رہنمائی میں بیدار ہو گئیں۔ دنیا نے دیکھا کہ اقتصادی طور سے مردہ مسلمان اب بھی روحانی طور سے زندہ ہے۔ کوئٹہ سے دہلی تک احرار ریلیف کیمپ کھولے گئے۔ لاہور میں ایک عارضی مرکزی ہسپتال اور قیام گاہ بنائی گئی جس کی مثال خود حکومت بھی پیش نہ کر سکی۔ خورد و نوش کے علاوہ پارچہ جات کی تقسیم اور زر امداد کا چودھری محمد امین مرحوم و حضرت مولانا عبداللہ قصوری[1] کی زیر نگرانی انتظام تھا۔ دہلی کے قریب مشہور ڈاکٹر دن رات کام کرتے تھے۔ ہمارے انتظامات کو دیکھ کر دنیا حیران تھی۔ ہزاروں والنٹیر کمربستہ تھے۔ لاوارث بچوں اور عورتوں کا الگ الگ انتظام رکھا گیا تھا۔ معزز خواتین کے ہاتھ میں عورتوں کا انتظام تھا۔ باجی رشیدہ بیگم اور مسز عبداللہ اس کی انچارج تھیں۔ سچی بات یہ ہے کہ عورتوں کے سلیقے نے ہمارے انتظامات کو چار چاند لگا دیئے۔ وہ رات دن کام کرتی نہ تھکتی تھیں۔ حکومت کے وزراء اور ذمہ دار افسر ہماری خفیف مساعی کی داد دینے آئے۔ یہ پہلا موقعہ ہے۔ جب حکومت نے احرار کی عظمت کا اقرار کیا۔ لیکن ہماری خدمات انسانیت کے لیے تھیں۔ حکومت کی نوازشوں کے ہم خواہاں نہ تھے۔ حالانکہ حکومت ان خدمات کا اعتراف کرنے کو آمادہ تھی۔ جو خدمات خدا کے لیے ہوں ان کا اجر حکومت سے ڈھونڈنا ذلت ہے۔

خالد لطیف گابا کا اسمبلی میں انتخاب

مجلس احرار کیا ہے؟ اسلام کی زندہ روح ہے۔ سرمایہ دار دنیا ہمیں جتنا چاہے طعن کر لے مگر دشمن کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ احرار بے پناہ قوت عمل کا سرچشمہ ہے۔ تھک جانا یا شکست کو تسلیم کرنا ہم نہیں جانتے۔ کوئی ہمارا دوست بن کر ذلت نہیں اٹھاتا۔ دشمن بن کر آرام نہیں پاتا۔ خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمیں نیکی کے کام سپرد کرتا رہے اور یوں ہی کامیاب فرماتا رہے۔ جب کوئی آواز ملک میں بلند ہوتی ہے۔ احرار کی روح ہمیشہ اسے ایمان کے تقاضوں کی بنا پر پرکھتی ہے۔ تعجب یہ ہوتا رہا ہے کہ سب دوستوں کے دل و دماغ پر واقعات کا یکساں اثر ہوتا ہے اور ہماری تدبیروں میں بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ جزوی تفصیل میں گرماگرم بحث ہوتی ہے کوئی جانے کہ اب جدا ہو کر پھر نہیں ملیں گے۔ مگر ہم خدا کے کام

۱؎ مرحوم مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے چھوٹے بھائی۔ ابو معاویہ ابوذر

کے لیے جمع ہیں، الہام کا مدعی کون ہے۔ اختلاف نیک نیتی کے ساتھ رحمت ہے۔ اپنے اختلاف کو رحمت سمجھ کر تدبیر کرتے ہیں۔

خالد لطیف گابا مشہور ہندو محب وطن لالہ ہرکشن لعل کا فرزند ہے۔ نومسلم ہے۔ اس لیے ہماری عمومی عزت کا مستحق ہے۔ جب وہ اسمبلی کا امیدوار ہوا تو اسے بے یار و مددگار سمجھ کر سب سرمایہ داروں نے ٹھکرا دیا۔ مگر ہمارا اسلامی ذہن نومسلم کی مایوسی کو برداشت نہ کرتا تھا۔ دوسروں نے ٹھکرایا ہم نے اسے گلے لگایا۔ درحقیقت ہماری یہ حمایت تبلیغی پہلو لیے ہوئے تھی۔ گویا یہ انتخاب تبلیغی تلوار سیاسی میان میں تھی۔ ان دنوں میاں سر فضل حسین ہندوستان میں اسلامی سیاست پر حکمران تھے۔ وہ کئی وجوہات سے گابا صاحب کے مخالف تھے۔ ہم ان وجوہات کو زیر بحث لائے بغیر مسٹر گابا کے حامی تھے۔ دنیا کو بتانا یہ تھا کہ نومسلم کی عزت اسلام میں بے حد بلند ہے۔ اگر تبلیغی مذہب یہ شان نہ رکھے تو وہ روح تبلیغ کو فنا کر لے گا۔ اس لیے ہم نے اس الیکشن کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب ریٹائرڈ سیشن جج مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ نے مرکز مسلم کانفرنس کا جنم لیا تھا۔ دونوں جماعتوں کی سرمایہ دارانہ روح تھی۔ بعض احباب نے چاہا کہ درمیان داری کریں اور درمیانی راہ نکالیں۔ کہ مسٹر گابا آزاد ٹکٹ پر کھڑے ہوں اور برملا مقابلہ میدان ماریں۔ میاں سر فضل حسین مرحوم کو اعلیٰ سوسائٹی کے اثر و نفوذ پر بڑا اعتماد تھا۔ تمام سرمایہ دار میاں صاحب کی مٹھی میں بند تھے۔ لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ رائے عامہ نے امرا کے اقتدار کو شکست دی اور خالد لطیف گابا کامیاب ہوئے۔ احرار نے فتح کے پھریرے اڑائے۔ امرا نے خار کھایا۔ شیخ حسام الدین نے اعلان کیا کہ یہ فتح ہماری آئندہ انتخابی مہم کا پیش خیمہ ہے۔ اس پر سب نے کان کھڑے کیے۔ "سول"[1] نے احرار کی فتح کو خاص اہمیت دی۔ اس کامیابی کا بدترین اثر ہمارے مسلمان کانگریسی دوستوں پر ہوا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ اگر احرار پھریرے اڑائیں گے تو ہم کہاں جائیں گے ہو نہ ہو ان کا جھنڈا سرنگوں کریں۔

کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی خدمت میں عظمت اور مسٹر گابا کی احرار کے ٹکٹ پر انتخابی فتح نے سب سے زیادہ سانپ ان کے سینے پر لوٹائے جو کسی وقت ہمارے رفیق سفر تھے۔ ہمارے خلاف سازش کا مواد اول راولپنڈی میں طیار ہوا۔ خواجہ عبدالرحیم عاجز[2] کو سازش کنندگان نے محو خواب سمجھ کر سرگوشیاں شروع کیں۔

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کا مشہور انگریزی اخبار جو اب بند ہو چکا ہے۔ [2] ۴۳ء میں حادثۃً انتقال کیا۔

لیکن یہ جاگ رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں اور ان کے چند چیدہ ساتھیوں کے علاوہ مجلس عاملہ جمعیت علماء کا ایک معزز رکن[1] شریک مشورہ تھا۔ احرار کی مخالفت کا عہد استوار ہوا جس کا نتیجہ شہید گنج ہے۔ مصیبت کا وقت گذر گیا۔ اب اس داستان کو بار بار دہرانا کیا ضرور ہے۔ دنیا سب ایک انقلابی تشنج میں مبتلا ہے۔ اختتام جنگ کے بعد یہ کوشش ہونی چاہیے۔ کہ یہ دور سرمایہ داری لوٹ کر نہ آئے۔ جس میں ایک فی صدی عیش کرتے ہوں اور نناوے فی صدی آہیں بھرتے ہوں۔ اس وقت روس، جرمنی اور انگلستان سے ایک ہی آواز اٹھ رہی ہے کہ سرمایہ داری لعنت ہے اس کو ختم ہونا چاہیے۔ احرار کا فرض ہے کہ جماعتی تبلیغ مضبوط کر کے اس آواز میں اور زور پیدا کریں۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کر کے دیکھو سرمایہ داری حقیقی اسلام کو کھا گئی۔ سرمایہ داری ختم کرو گے تو اسلام زندہ ہو جائے گا۔ اسی کے خاتمہ پر ہندوستان امن کی بستی ہو سکے گا۔

---

[1] موصوف بفضلہ تعالیٰ اب بھی بقید حیات اور مغربی پاکستان میں قیام پذیر ہیں ۱۲